منظر و پس منظر

اختر اورینوی

افسانے

نیا ادارہ ٭ لاہور

منظر و پس منظر

اختر اورینوی

مکتبہ اردو لاہور

طبع ثانی

قیمت 8.00

مرکنٹائل پریس لاہور میں باہتمام چوہدری نذیر احمد پرنٹر پبلشرز چھپکر مکتبہ اُردو سے شائع ہوئی

فہرس

پیش لفظ، ۷
ٹائپسٹ، ۱۳
آخری اکنی، ۲۵
بوڑھی ماما، ۳۹
کام، ۵۳
بے بس، ۶۱
پاگل، ۷۱
جینے کا سہارا، ۸۳

تسکینِ حسرت ، ۸۹

اندھی نگری ، ۱۰۱

دو مائیں ، ۱۱۳

جونیئر ، ۱۲۵

تاخیر ، ۱۴۱

بیل گاڑی ، ۱۵۵

سینے ٹوریم کا فقیر ، ۱۶۹

مریض ، ۱۷۹

یہ دُنیا ، ۱۹۷

پس منظر ، ۲۱۵

اب ؟ ۲۲۹

گندے انڈے ، ۲۴۳

پیش لفظ

قصہ کہانی بہت پرانی چیز ہے۔ اسکی ابتدا نسل انسانی کی ابتدائی ترقیوں کے دھندلکے میں گم ہے۔ انسان، وہ تہذیب یافتہ ہو یا وحشی، بچہ ہو یا بوڑھا، کہانیوں کا فطری طور پر شائق نظر آتا ہے جس طرح اس کی آنکھیں کسی نئے، غیر معمولی، دلچسپ تماشے کی مشتاق رہتی ہیں، بجنسہٖ اسی طرح اس کے کان نئے نئے قصوں، انوکھی کہانیوں، رنگین داستانوں کے لئے بیقرار رہتے ہیں۔ ان قصوں، کہانیوں داستانوں کے فیض سے اس کی سادہ، معمولی، بیرنگ زندگی رنگین و خوشگوار ہو جاتی ہے۔ بہر کیف کہانیوں کی دلچسپی، قدامت اور عالمگیری مسلم ہے۔ اس لئے امید ہو سکتی ہے کہ کہانیوں نے فنی حیثیت سے ادب کی دوسری صنفوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ اور بہت پہلے ترقی کی ہو گی۔ لیکن حقیقت کچھ اور ہے۔ جسے فن افسانہ کہتے ہیں۔ اس کی "تکنیک" کی ترقی کو کچھ زیادہ دن نہیں

ہو گئے ہیں۔ لیکن اس مدت میں مغربی مصنفین نے اس فن پر کامل عبور حاصل کر لیا ہے۔ انہوں نے افسانہ کی فنی خصوصیتوں، اس کی دشواریوں، اس کی حدود اور گنجائشوں کو سمجھا اور برتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں اردو میں بھی فن افسانہ نے بہت ترقی کی ہے۔

فن افسانہ مشکل بھی ہے اور آسان بھی۔ عموماً اسے ناول سے زیادہ دشوار خیال کیا جاتا ہے محض اس لئے کہ افسانہ کا پیمانہ مختصر ہے اور ناول کا پیمانہ وسیع ہے۔ افسانہ کے مختصر پیمانہ میں تکمیل کا حصول مشکل ضرور ہے لیکن ناول کے وسیع، پیچیدہ، بسیط حاصل سانچے میں کامیابی مشکل تر ہے۔ ناول اور افسانہ میں تقریباً وہی فرق ہے جو نظم و شعر منفرد میں ہے۔ شعر میں ایک خیال، ایک جذبہ کا کامیاب و مکمل بیان ہوتا ہے۔ نظم کی ابتدا بھی کسی ایک زبردست جذبہ کے ماتحت ہوتی ہے لیکن کسی نظم میں صرف ایک جذبہ یا خیال موجود نہیں ہوتا۔ نہایت سادہ اور مختصر نظم میں بھی مختلف جذبات و خیالات، متنوع اور پیچیدہ نقوش ہوتے ہیں۔ شعر کے مختصر پیمانہ میں متنوع اور متعدد خیالات و جذبات نہیں سما سکتے۔ شعر میں اصل مشکل اس کا اختصار ہے۔ اس اختصار کے ساتھ کسی خیال کا مکمل، صاف، کامیاب، پُر زور و پُر تاثیر بیان آسان نہیں۔ نظم کا سانچہ زیادہ وسیع ہے، اس میں گنجائشیں زیادہ ہیں، اس میں بظاہر اختصار کی چنداں ضرورت نہیں۔ اس لئے اسے آسان خیال کیا جاتا ہے لیکن یہ خیال صحیح نہیں۔ کامیاب شعر کہنے والے بہت ہیں لیکن کامیاب نظمیں ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ اسی طرح موجودہ زمانہ میں افسانوں کا سیلاب ہے۔ لیکن ایک بھی کامیاب ناول لکھنے والا نظر نہیں آتا۔ اصل یہ ہے کہ اوسط درجہ کے شعر ہر شخص موزوں کر سکتا ہے۔ ہر وہ شخص جسے اوزان و بحور سے واقفیت ہے (یا جس نے موزوں طبیعت پائی ہے) جسے زبان

پر قدرت حاصل ہے اور جسے غزلوں کے محدود مضامین سے آگاہی ہے۔ اوسط درجہ کے شعراء اچھے شعر میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ لیکن یہ فرق آسمان زمین کی دوری کی طرح صاف نظر نہیں آتا۔ اچھے شعر کے لئے اصلیت ضروری ہے۔ لیکن اصلیت کی تمیز آسان نہیں۔ بہرکیف اوسط درجہ کی نظم کی وہ فراوانی نہیں۔ اس کی مختلف وجہیں ہیں۔ یہاں ان کے بیان کی نہ ضرورت ہے نہ گنجائش۔ یہ کہنا کافی ہے کہ وہ شخص جسے اوزان و بحور سے واقفیت ہے اور جسے زبان پر قدرت حاصل ہے۔ نظمیں نہیں لکھ سکتا اور اگر اس نے نظمیں لکھیں بھی تو ان کی خامیوں کو سطحی نظر بھی بہ آسانی دیکھ سکتی ہے۔ بہرکیف اوسط درجہ کے اشعار اور اوسط درجہ کے افسانوں کی ایک حالت ہے جس نے افسانوں کی "ٹکنیک" سے کچھ سطحی واقفیت بہم پہنچالی ہے اور جسے خیالات و واقعات کے اظہار پر قدرت ہے۔ وہ افسانے مرتب کر سکتا ہے۔ لیکن صنفِ ناول میں اوسط درجہ کی کامیابی بھی مشکل ہے

میں نے ابھی افسانوں کی "ٹکنیک" کا ذکر کیا ہے۔ افسانوں میں کسی ایک واقعہ، کیریکٹر، فضا کا بیان ہوتا ہے۔ پیمانہ مختصر ہے۔ اس لئے اس میں یہ گنجائش نہیں کہ مختلف و متنوع واقعات و حالات، متعدد افراد، پیچیدہ فضائیں پیش ہو سکیں۔ ان چیزوں کی کامیاب عکاسی ناول میں البتہ ممکن ہے۔ ناول میں صرف ایک واقعہ، ایک یا چند افراد، ایک محدود فضا کا بیان نہیں ہوتا۔ جسے ناول کا "پلاٹ" کہتے ہیں وہ مرکب ہوتا ہے مختلف واقعات، اکثر مختلف قصّوں سے۔ اس میں متعدد افراد سانس لیتے ہیں، اور اپنی زندگی کو پالیتے ہیں اور یہ واقعات اور افراد مل کر ایک نقش کامل تیار کرتے ہیں۔ اس کثرت میں وحدت کا کرشمہ نظر آتا ہے۔ یہ وحدت افسانوں کیلئے ناگزیر ہے۔ ممکن ہے کہ کسی ناول میں یہ وحدت نہ ہو اور اس لحاظ سے وہ ناول ناقص ہوگا۔ لیکن اس

نقص کی وجہ سے ناول کو یک قلم ناقابلِ اعتنا نہیں خیال کیا جائے گا۔ لیکن کسی افسانہ میں اگر یہی نقص ہو تو پھر وُہ کسی کام کا نہیں۔ بہر کیف، یہ وحدت افسانوں کے لئے صرف لازمی ہی نہیں بلکہ ان میں یہ وحدت ہی سب کچھ ہے یعنی ان میں کثرت کی گویا مطلق جلوہ گری نہیں ہوتی۔ اس لئے افسانہ نگار نہایت ہوشمند ہوتا ہے اور وُہ کسی خاص موضوع کو (وُہ کچھ بھی ہو) منتخب کر کے اپنی ساری قوتِ ایجاد، اپنے فن کے سارے ساز و سامان اس موضوع پر صرف کرتا ہے۔ اس کا مقصد ہوتا ہے کہ وُہ اس ایک شے کو نہایت پُرزور اور باا‌ثر طریقے سے پیش کرے اور افسانہ پڑھکر قاری کے دماغ میں یہ موضوع اپنی مکمل صورت میں صفائی و استحکام کے ساتھ نقش ہو جائے۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو پھر افسانہ ناکامیاب تصور کیا جائیگا۔ ظاہر ہے کہ افسانوں میں دلچسپی کا مرکز ایک اور صرف ایک ہوتا ہے۔ اگر کوئی دوسرا مرکز بھی موجود ہو جو اپنی طرف قاری کی توجہ کو کھینچ لے تو پھر افسانہ فنی حیثیت سے ناقص رہیگا۔ اسی وجہ سے افسانہ نگار اپنی ساری قوت وحدتِ اثر کی تخلیق میں صرف کرتا ہے اور اس مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے وُہ مختلف ذریعوں کا استعمال کرتا ہے۔ سب سے اہم چیز اختصار ہے۔ وُہ ہر چیز کو مختصر پیرایہ میں بیان کرتا ہے۔ الفاظ کے استعمال میں کفایت شعاری اختیار کرتا ہے۔ کم سے کم لفظوں میں اپنے خیالات، مختلف واقعات کو پیش کر دیتا ہے فضول، غیر متعلق، طولانی بیانات سے وُہ پرہیز کرتا ہے۔ کسی غیر متعلق خیال یا واقعہ کو وہ اپنے افسانہ کی حدود میں داخل نہیں ہونے دیتا۔ وُہ ایک لفظ سے سینکڑوں لفظوں کا مصرف لیتا ہے اور جو کچھ اُسے کہنا ہوتا ہے اسے بے کم و کاست آئینہ الفاظ میں جلوہ گر کرتا ہے الغرض

صفائی، اختصار، کفایت شعاری، بے کم و کاست اظہارِ خیال یہ چیزیں ہمیشہ اس کے پیش نظر رہتی ہیں۔ جن باتوں کا یہاں ذکر ہوا۔ اگر ان سے واقفیت ہے اور زبان پر قدرت حاصل ہے اور معمولی درجہ کی قوتِ ایجاد یا تخیل بھی موجود ہے تو پھر ہر ایسا شخص اوسط درجے کے افسانے کامیابی کے ساتھ لکھ سکتا ہے۔

حقیقی کامیابی کے لئے محض "ٹکنیک" سے واقفیت اور اس میں مہارت کافی نہیں، افسانہ اور ناول اپنے اختلافات کے باوجود بھی ایک اہم چیز میں مشابہ ہیں۔ افسانہ ہو یا ناول دونوں میں زندگی کی عکاسی ہوتی ہے۔ جس افسانہ میں زندگی کے کسی پہلو کی عکاسی نہ ہو وہ افسانہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اگر کسی افسانہ میں جن اور پری اور ان کے کارناموں کا ذکر ہو یا کسی فوق الفطرت واقعہ کی عکاسی، تو اسے افسانہ نہیں کہہ سکتے۔ افسانہ، ادب کی دوسری صنفوں کی طرح، زندگی کا آئینہ ہے۔ اس سے زندگی سے واقفیت افسانہ نگار کیلئے ضروری ہے اور یہ واقفیت وہ معمولی اور سطحی واقفیت نہیں جو ہر شخص کو کم و بیش میسر ہے افسانہ نگار کی آنکھیں تیز اور باریک بیں ہوتی ہیں۔ وہ ایسی ایسی چیزوں کو دیکھ لیتا ہے۔ جس سے معمولی اور سطحی نظر کبھی آگاہ نہیں ہوتی یا وہ معمولی اور سطحی چیزوں کو ایسے لمحہ ایسے رنگ میں یا ایسے زاویہ سے دیکھتا ہے جس لمحہ اور رنگ میں جس زاویہ سے وہ بالکل نئی، انوکھی اور یکتا معلوم ہوتی ہیں۔ اگر افسانہ نگار محض معمولی اور سطحی چیزوں کا بیان کرے تو اپنی "ٹکنیک" کی خوبی کے باوجود بھی اس کے افسانے قابل قدر خیال نہیں کئے جا سکتے اور اس کے افسانے اپنے ظاہری حسن کے باوجود بھی مشق سے زیادہ اہمیت نہیں رکھ سکتے۔ اگر وہ دیکھی اور جانی ہوئی

چیزوں میں ایک نیا پن، بے مثالی، بانکپن نہ پیدا کر سکے تو پھر اسی کی محنت تحصیل حاصل ہے اگر اس کا خام مواد افسانہ کی صورت میں بھی خام مواد باقی رہے تو پھر اس کا افسانہ افسانہ نہیں کچھ اور چیز ہے۔

افسانہ محض زندگی کا آئینہ نہیں اس میں صرف زندگی کا عکس نظر نہیں آتا بلکہ اس میں زندگی چلتی پھرتی، بولتی چالتی، ہنستی کھیلتی، روتی رلاتی نظر آتی ہے۔ زندگی کی عکاسی کچھ زیادہ مشکل نہیں۔ لیکن زندگی کی ادب میں زندہ تخلیق نہایت دشوار ہے۔ ادب میں زندگی کی نقالی نہیں ہوتی۔ ادب میں زندگی کی عکسی تصویر نہیں ہوتی۔ ادب میں زندگی زیادہ نظر آتی ہے۔ افسانہ بھی ایک صنفِ ادب ہے۔ اس میں بھی زندگی کے کسی پہلو، کسی رخ، کسی حصہ میں روحِ زندگی پھونک دی جاتی ہے اور وہ پہلے سے زیادہ زندہ ہو جاتے ہیں۔ اگر افسانہ نگار نے محض سطحِ زندگی کی نقالی کی یا اس کی صحیح مفصل تصویر مرتب کر لی تو اس سے وہ کامیابی کا مستحق نہیں ہوتا۔ عموماً سطحِ زندگی کی نقالی یا عکاسی کو کافی خیال کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ خیال صحت پر مبنی نہیں۔ محض جزئیات کے مشاہدہ، ان کے صحیح انتخاب، ان کی ترتیب و ترکیب سے سطحِ زندگی کی نقاشی ممکن ہے۔ لیکن ایسی نقاشی کوئی ادبی اہمیت نہیں رکھ سکتی۔ جب تک کہ اس میں "کچھ اور" بھی موجود نہ ہو۔ کسی واقعہ یا واردات کا صحیح و مکمل بیان پولیس کی رپورٹ میں مل سکتا ہے۔ لیکن اس رپورٹ کی کوئی ادبی وقعت نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح کسی افسانہ میں کسی واقعہ یا واردات، کسی "کیریکٹر" کسی فضا کی صحیح و مکمل "رپورٹ" جزئیات کی صحت کے ساتھ ہو سکتی ہے لیکن اگر اس میں "کچھ اور" نہیں تو پھر یہ افسانہ بھی ایک "رپورٹ" سے زیادہ

قیمتی نہیں ہوتا۔ افسانہ میں یہ واقعہ، کیریکٹر، فضا ایک حیرت انگیز معنی خیزی اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ معنی خیزی اسے اہم اور وقیع بنا دیتی ہے۔ اس معنی خیزی کی وجہ سے معمولی و سادہ واقعہ میں ایک روح، غیر فانی روح دوڑنے لگتی ہے۔ یعنی افسانہ نگار کسی بظاہر معمولی واقعہ کی معنی خیزی سے واقف ہو کر اسے آشکار کرتا ہے یا کسی معمولی واقعہ کو معنی خیز بنا دیتا ہے۔ اس کے علاوہ، کسی افسانہ نگار کی شخصیت بھی اہم حصّہ لیتی ہے۔ بظاہر وُہ اپنی شخصیت کو اپنے افسانوں سے علٰحدہ رکھتا ہے اور اپنی شخصیت کی خصوصیات کو افسانوں میں جلوہ گر نہیں ہونے دیتا لیکن پس پردہ اُس کی شخصیت ہمیشہ موجود رہتی ہے اور اگر یہ اہم، وقیع، ناقابل قدر ہے تو افسانوں کو ایک خاص زور، ایک تاثیر بخش دیتی ہے۔ اگر افسانہ نگار کی شخصیت اوسط درجہ کی ہے، اگر اس کا مشاہدہ، اس کی قوتِ حساسہ، اس کا دماغ یہ سب چیزیں اوسط درجہ کی ہیں تو پھر وُہ اوسط درجہ کا افسانہ نگار ہو گا اور اس کے افسانے بھی اوسط درجہ کے ہوں گے۔ لیکن اگر اس کی شخصیت وقیع ہے، پھر ہر لفظ با اثر اور مکمل افسانہ بے نظیر ہو گا۔

میں اختر کے افسانوں کے متعلق کچھ زیادہ کہنا نہیں چاہتا۔ اختر نوجوان ادیب ہیں۔ ان کی شہرت بہار کی حدود میں محدود نہیں۔ ان کی تحریریں ہندوستان کے اکثر و بیشتر رسالوں میں شائع ہوتی ہیں اور شائع ہوتی رہتی ہیں۔ اختر کے ادبی کارنامے محدود قسم کے نہیں۔ وُہ افسانہ نگار ہیں، شاعر ہیں، نقاد ہیں اور انہوں نے دو ڈرامے بھی لکھے ہیں، ان کے افسانوں، ان کی نظموں، ان کی تنقیدوں سے اردو دُنیا واقف ہے۔ ان کے

افسانے خصوصاً نہایت مقبول ہیں۔ نقاد کا فرض محض رہبری ہے۔ میں نے افسانوں کے بنیادی اصول پر روشنی ڈالی ہے۔ مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ اختر کے افسانوں کا ان اصول کی روشنی میں مطالعہ کیا جائے۔ ان افسانوں میں سے زیادہ تر "معاصر" میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان کا معاصر میں شائع ہونا ہی ان کی اچھائی کی دلیل ہے۔ میں یہاں آل احمد سرور صاحب کے چند جملے نقل کرنے پر قناعت کرتا ہوں۔ وہ کہتے ہیں: "اختر کے افسانے مجھے پسند آئے۔ اختر کا مشاہدہ بہت تیز ہے۔ وہ خارجی اور داخلی ہر قسم کی مصوری کر سکتے ہیں۔ کردار نویسی کے گُر سے بھی واقف ہیں اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انہیں دراصل کچھ کہنا ہے اور یہ ایک بڑی بات ہے۔"

کلیم الدین احمد
پروفیسر پٹنہ کالج

ٹائپسٹ

میں نے بی، اے پاس کیا۔ ایم، اے کی ڈگری لی اور اُس کے بعد میری نظر اخبارات کے "ضرورت ہے" والے کالموں پر رہنے لگی۔ پہلے پہلے تو صوبجاتی گزٹ میں ڈپٹی مجسٹریٹی اور پولیس سپرنٹنڈنٹی کی اسامیوں کے اعلان کو ڈھونڈھتا تھا۔ مگر اب "ہرچہ پیش آید" کے اصول پر عمل کرنا پڑا رہا تھا۔ اسی سلسلہ میں میں نے چند ملازمتوں کے اشتہار دیکھے اور جھٹ درخواستیں لکھ کر انہیں ٹائپ کرانے کی فکر میں لگا۔ ٹائپ نویسوں کی کیا کمی، مگر میری جیب میں پیسوں کی تو کمی تھی۔ مجھے کسی ایسے ٹائپسٹ کی تلاش تھی جو کم اجرت پر میرا کام کر دے۔ میرے ایک دوست نے میری رہنمائی کی اور ایک ٹائپسٹ کے یہاں مجھے لے چلا۔

ہم لوگ چوک سے گذر کر گلی در گلی ہوتے ہوئے ایک نیم ویران محلہ میں پہنچے۔ ہر چند کہ یہ بد قسمت

محلہ شہر کے اندر ہی تھا مگر شہر کی تمام چم وخم، چمک دمک، بھیڑ بھاڑ سے معرا تھا۔ سنسان، اداس بیہوش سا لٹا ہوا۔ شہر کے پُر رونق بازاروں، وہاں کی سر بفلک عمارتوں کے مقابلہ میں یہ آشفتہ حال محلہ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے دن کے مقابلہ میں رات معلوم ہوتی ہے مگر دولت کی راتیں بھی پُر کیف اور شاداب ہوتی ہیں اور یوں بھی راتیں فطرت کے عیوب پر پردہ ڈال دیتی ہیں مگر اس بدبخت محلہ کو غربت کی تیرگی نے اور تاریک کر دیا تھا۔ اسی وجہ سے یہاں کی ویران حالی اور شہر کی عام آبادی کا تقابل بہت نمایاں ہو کر اثر انداز ہو رہا تھا۔ مٹی اور اینٹ کے شکستہ مکانات نیچے نیچے پائے، مکانات کے درمیان ملبوں کا ڈھیر، گھروں کی شکستہ و نیم شکستہ دیواریں اکثر جگہ ان بڑے بڑے رخنوں کو ٹاٹ کی چٹائیوں سے پاٹا گیا تھا مگر کہنہ چٹائیاں بھی جھڑ جھڑی ہو رہی تھیں۔ چھپر جھکے جاتے تھے۔ چہار دیواریاں مٹی کے ڈھیر میں تبدیل ہو گئی تھیں. گلیوں میں کوڑے کے ڈھیر تھے، جنھیں محلہ کے میلے کچیلے، نحیف و زار بدشکل بچے بکھیرتے پھرتے تھے۔ گھر کے اندر کی نالیاں سیاہ، بدبودار کیچڑ گلیوں میں لا کر اس طرح بکھیرتی تھیں جیسے کوئی سیاہ دل ظالم بدکار دنیا میں گناہ اور فسق و فجور بکھیرتا ہے۔ محلہ میں چہل پہل بالکل مفقود تھی۔ موت کی سی ایک منحوس اداسی ہر طرف چھا رہی تھی۔ اِکا دُکا کوئی گلیوں میں نظر آ جاتا تھا۔ سر جھکا ہوا، آنکھیں مایوس، بے رونق، نڈھال، پریشان حال کپڑے پھٹے ہوئے۔ اِدھر اُدھر گندے اور ٹوٹے پھوٹے اساروں پر چند بدبختی اور افلاس کے شریکِ حال بیٹھے نظر آ جاتے۔ بیچ میں ایک حقہ ہوتا۔ نیچہ ٹوٹ کر دوہرا ہوا جاتا۔ مٹی کی پھوٹی ہوئی گڑگڑی رِس رِس کر تمباکو کا متعفن پانی بہا رہی تھی۔ جس سے اُسارے

کی خاک مل کر کیچڑ پیدا کر رہی تھی۔ چلم کا حلقہ ایک طرف سے فتح شدہ فصیل کی طرح ٹوٹا ہوا تھا جس کے اندر سے نیم فسردہ خاکستری ٹکیاں کسی بجھتی ہوئی چتا کی مانند نظر آ رہی تھیں ہر طرف دکھ، بدنصیبی، روگ کے مجسمے دکھائی دیتے، ہر سو اجاڑ پن، بربادی اور نحوست کے رستے آنکھوں کے سامنے آتے۔ یہ محلہ سود خوارانہ نظام کی آنکھ کا موتیا بند تھا۔ تہذیب و تمدن کے جسم کا کوڑھ اور انسانیت کے جگر کا پھوڑا۔ دیہاتوں میں تو سود خواری کے انسانیت کش دانتوں سے دہقان کے دل و جگر میں بنائے ہوئے زخموں پر مادرِ فطرت اپنے ہاتھوں سے مرہم رکھتی ہے مگر تمدن کے قلعوں میں سرمایہ داری کے حریص، قاتل پنجوں کے شکار بسمل ہو کر اتڑپ تڑپ اور سسک سسک کر جان دینے پر مجبور ہوتے ہیں اور اُن کا کوئی پوچھنے والا بھی نہیں ہوتا۔

اس ستم رسیدہ محلے کے شمال میں قرض دینے والے سکھوں کی آبادی تھی اور اس سے پرے مہاجنوں کا ٹولہ۔ یہ بڑے بڑے مہاجن تو ان نیم مردہ شکاروں کو پوچھتے نہیں۔ ان کے تیرِ ستم کے نشانے تو عیش پرست رؤساء ہوتے ہیں۔ رہے یہ نصیبوں جلے تو ان کے جسم کا خون یا تو چھوٹے سرمایہ کے سکھ سود خوار چوستے ہیں یا سخت دل کابلی۔ میں اور میرے دوست نے اس نیم جاں محلہ میں ایک دو مظلوم گھروں کے دروازوں پر کٹار بند سکھ قرض لگا لینے والے کو تقاضہ کرتے ہوئے اور لٹھ دار کابلیوں کو ادھر ادھر اس طرح گشت کرتے دیکھا جیسے باز اور شکرا اپنے شکار پر منڈلاتا ہے۔

آخر کار ہم لوگ ایک شکستہ مکان کے سائبان کے نیچے رُکے۔ یہ ایک سہ درہ لانبا سا

سائبان تھا۔ خام پائے اور خام دیواریں۔ چھپر رکوع کی حالت میں۔ سائبان میں بائیں جانب ایک ٹوٹی ہوئی چوکی بچھی ہوئی تھی۔ کسی ڈوبتی ہوئی طوفان زدہ کشتی کے تختوں کی طرح اس کے تختے بھی اُکھڑے جاتے تھے اور ایک کنارے کا تختہ تو اکھڑا ہی ہوا تھا۔ دیوار کے گوشوں میں مکڑی کے جالے تھے اور اوپر کی طرف جھول۔ سائبان سے لگی ہوئی ایک کوٹھری تھی جس کے اوپر ٹاٹ کا میلا سا پردہ پڑا ہوا تھا۔ دائیں جانب ایک پلنگڑی بچھی ہوئی تھی، جس پر ایک پھٹا ہوا گدا اور ایک کہنہ رضائی رکھی ہوئی تھی۔ رضائی جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی تھی۔ مٹیالے رنگ کے استر اور ابرے کے اندر سے میلی روئی برص کے داغوں کی طرح جھانک رہی تھی سائبان کے بیچ میں ایک لڑکھڑاتی میز اور اس سے لگی ہوئی ایک کمزور سی کرسی۔ کرسی پر ٹائپسٹ بیٹھا ہوا تھا اور میز پر ٹائپ رائٹر رکھا تھا۔ ٹائپسٹ ایک ادھیڑ عمر کا آدمی تھا ڈاڑھی منڈی مگر حجامت کے لئے ترسی ہوئی۔ سانولا رنگ۔ چوڑی ہڈی مگر ڈھیلا ڈھالا۔ چہرے پر شکن، ماتھے پہ بل، ناک پر ایک پرانی سی عینک جس کی ٹوٹی ہوئی کمانیوں کو دھاگے سے جوڑ لیا گیا تھا۔

شروع جاڑے کا زمانہ تھا مگر اس ہفتہ میں بارش ہو جانے کے سبب سے سردی چمکی ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زمین کی ساری حدّت بادل بن کر اڑ گئی اور اب کھلا ہوا نیلا آسمان صرف سردی برسا رہا تھا۔ صبح کے دس بج چکے تھے مگر ہم لوگ بھی جو کوٹوں میں لپٹے ہوئے تھے خاصی ٹھنڈک محسوس کر رہے تھے۔ غریب ٹائپسٹ صرف ایک واسکٹ، میلی سی قمیص کے اوپر پہنے ہوئے تھا۔ سائبان گلی کے مشرقی جانب واقع تھا۔ صبح کو وہاں دھوپ

کا گذر بھی نہیں ہوتا تھا۔ اور شام کو آفتاب اِس طرح سے وہاں سے اپنا دامن بچا کر نکل جاتا تھا جیسے امیر لوگ غریبوں سے کتراتے ہیں۔ اس وجہ سے یہ جگہ مرطوب تھی۔ ٹائپسٹ تھر تھر کانپ رہا تھا مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُسے سردی کی اتنی پرواہ نہیں جتنی فکر اُسے کسی اور امر کے متعلق ہے۔ وہ کسی خیال میں غلطاں و پیچاں معلوم ہو رہا تھا۔ دماغ میں جب کوئی تجویز کامیابی کی جانب اقدام کرتی ہے تو چہرے پر باوجود غور و فکر کے آثار کے ایک زندگی بداماں روشنی اور ایک مسکراتا ہوا رنگ کھیلتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ مگر اس وقت ادھیڑ عمر ٹائپسٹ کے چہرے پر پژمردگی تھی۔ اس کی گہری ہوئی آنکھوں سے مایوسی ٹپکی پڑتی تھی۔ اس کی نگاہیں ایک ایسے دل کی ترجمانی کر رہی تھیں جس میں امید کا دیا بجھ گیا ہوا۔ اُسکے تھکے ہوئے دماغ میں ایسا معلوم ہو رہا تھا، کہ اب ایک بھی کامیاب تجویز کی کرن نور افشاں نہیں۔ وہ اس بھٹکے ہوئے جہاز راں کی طرح دکھائی دیتا تھا جس کا رہبری کرنے والا ستارہ ڈوب چکا ہو۔ اس کی خیالی تگ و دو اس مسافر کے اُٹھتے ہوئے قدموں کے مانند نہ تھی جو منزل کی طرف سیدھی سڑک پر بڑھ رہا ہو۔ بلکہ کسی غار میں گرے ہوئے اندھے راہرو کی طرح جو ایک ہی حلقے میں چکر کاٹتا ہو۔ کبھی تھک کر بیٹھ جاتا ہو اور کبھی اُٹھ کر بے مطلب امید موہوم کے پیچھے چلتا ہو۔

ہم لوگوں نے سائبان میں قدم رکھا۔ ٹائپسٹ چونک پڑا۔ اُس نے چشمہ کے اوپر سے دیکھا میرے ہاتھ میں درخواست کا مسودہ اور سندوں کا پلندہ تھا۔ ٹائپسٹ کی نظریں اسطرف پڑیں جیسے برسوں کا بیمار ناامیدیوں کے طمانچے کھایا ہوا بیمار طبیب کی آمد سے ایک لمحہ کیلئے مسرور ہو کر پھر اتھاہ بے آسی کے سمندر میں ڈوب جاتا ہے۔ اِسی طرح یہ ٹائپسٹ بھی ایک آن کیلئے

خوش ہو کر مایوس سا ہو گیا۔ اس کے پاس کون ٹائپ کرانے آئیگا ہفتہ اور مہینے گذر جاتے ہیں کوئی اِدھر نہیں پھٹکتا۔ کچہری میں البتہ گاہے گاہے کوئی آجاتا ہے۔ نووارد کے ہاتھ میں کوئی دوسرا کاغذ ہوگا۔ یہ کسی کے مکان کا پتہ پوچھتے ہونگے۔ ٹائپسٹ کو یقین نہ آتا تھا کہ کوئی گاہک آیا ہوگا۔

میرے دوست نے بتایا کہ یہ ٹائپسٹ ہے تو کارداں مگر بے چارے کی مشین بے حال ہے بصورت ذرا اوپر کی جانب اُڑے ہوئے چھپتے ہیں۔ دوسرے افلاس کے سبب مشین پر رنگ روغن بھی نہیں کرا سکتا۔ اپنی صورت سے بھی بدحالی ٹپکتی ہے۔ اور اس دور میں کہ لوگ ظاہر کی ٹیپ ٹاپ پر بہت جاتے ہیں، اسے کچہری میں کون پوچھتا۔ ایسے ہی کوئی غریب گاہک، ہر جگہ سے رد کیا ہوا آجاتا ہے تو اُسے کبھی کبھار کام مل جاتا ہے۔ اور اسکے گھر پہ تو سوائے قرضخواہوں کے کبھی کوئی آتا نہیں مفلوک الحال ٹائپسٹ دوسری مشین بھی نہیں خرید سکتا روپے کہاں سے آئیں۔ بال بچے ہیں بیوی ہے۔ روزینہ تو نکلتا نہیں پس انداز کس طرح ہو اسے جو نئی مشین مل جائے اور ذرا اس کے کپڑے لتے درست ہوں تو کام چل نکلے آدمی لیاقت کا ہے غلطیاں بہت کم کرتا ہے۔ اور کام جو چل پڑے تو پیٹ بھی بھرے، قرض کی ادائیگی کی صورت بھی پیدا ہو۔ مگر بیچارہ ٹائپسٹ تو ایک منحوس دائرہ میں گردش کر رہا ہے۔ غربت و افلاس کے سبب مشین بری، حالت زبوں اور صورت بے کشش بُری مشین اور تباہ حالت کی وجہ سے افلاس کی عمارت پہ فلاکت کی اینٹ پر اینٹ پڑتی جاتی ہے۔ یہ بدبختی کا چکر چل رہا ہے اور چلا جا رہا ہے۔

سائبان کے اندر پہنچ کر میں نے جلد ہی ٹائپسٹ کی حالتِ انتظار کو رفع کیا۔ میں نے کہا "جناب میں اپنی چند درخواستیں ٹائپ کرانے آیا ہوں" جب شکستِ تمنا روزمرہ کا معمولی واقعہ ہو کر رہ جاتی ہے تو پوری ہونے والی توقعات کے بارے میں بھی کوئی امید نہیں بندھتی۔ ٹائپسٹ کو یہ ساری باتیں خواب کی سی معلوم ہو رہی تھیں۔ وہ خاموشی اور حیرت سے ہم لوگوں کی طرف دیکھتا رہا۔ میں نے میز پر درخواستوں کے مسودے رکھتے ہوئے کہا۔

"جناب مجھے چند چیزیں ٹائپ کروانی ہیں" ٹائپسٹ کو اب یقین آیا کہ جو کچھ وہ دیکھ رہا ہے حقیقت ہے۔ اس کے چہرے پر مسرت کی روشنی چمکنے لگی، جیسے بجھتے ہوئے دیئے میں کوئی تیل ڈال دے اور وہ چمک اٹھے۔

میرا دوست مجھ سے رخصت ہوا اور میں پلنگڑی پر بیٹھ گیا۔ ٹائپسٹ نے مشین سنبھالی۔ اس میں کاغذ لگایا اور ایک درخواست کو غور سے پڑھ لینے کے بعد ٹائپ کرنے لگا کھٹ کھٹ ...... کھٹ کھٹ ...... کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ ......" وہ ٹائپ کر رہا تھا اور میں گردوپیش کا خاموشی سے جائزہ لے رہا تھا۔

مرطوب سائبان کی دیواریں چولھے کے دھوئیں سے سیاہ ہو رہی تھیں۔ کونے میں چولھا ایک گرسنہ فقیر کی طرح منہ پھاڑے ہوئے تھا۔ نہ جانے کب سے چولھے کا پیٹ نہیں بھرا تھا۔ چولھے کے منہ میں لکڑی کا ایک ٹکڑا بھی نہیں تھا اور نہ کوئی بجھا ہوا کوئلہ... صرف کچھ راکھ بکھری ہوئی تھی اور بس۔ ہر چند کہ سائبان سے ملی ہوئی کوٹھری پر ٹاٹ کا پردہ لٹک رہا تھا مگر وہ صاحبِ نگاہ نہ تھا۔ کوٹھری تاریک تھی اور ہوا سے بالکل محروم۔ وہاں ایک کھٹولا بچھا ہوا تھا

اور کھٹولے سے لگا کوئی بیٹھا ہوا تھا، ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ کھاٹ پر کوئی مریض لیٹا ہوا ہے
یہ تھی ٹائپسٹ کے گھر کی کائنات۔ گلی کے دوسری جانب ذرا سامنے سے ہٹ کر ایک نانبائی کی
دوکان تھی۔ میلے کچیلے المونیم کے برتن بدسلیقگی سے بکھرے ہوئے تھے کسی کا کنارہ غائب کسی کا
دستہ ٹوٹا ہوا۔ تامچینی کے برتنوں کی چینی اکھڑی ہوئی۔ رکابیوں پر سوکھے ہوئے بسکٹ، نان خطائی اور
میلے میلے سموسے رکھے ہوئے تھے مکھیاں بھنک رہی تھیں۔ نانبائی میلے چکٹ کپڑوں میں لپٹا
ہوا دوکان پر اونگھ رہا تھا۔ دوکان کے نیچے دبلے گرسنہ، مکروہ کتے زمین پر روٹیوں کے بچے
کھچے ٹکڑے اور چچوڑی ہوئی ہڈیاں تلاش کر رہے تھے۔ میں گرد وپیش نظر ڈال ہی رہا تھا
کہ پلنگڑی کے موٹے موٹے کھٹملوں نے مجھے کاٹنا شروع کیا۔ میری توجہ اس طرف پھر گئی میں نے
دیکھا کہ کئی موٹے موٹے کھٹمل میرے کپڑوں پر چہل قدمی کر رہے ہیں۔ اُف وہ کھٹولی ان موذیوں
کی گڑھی تھی۔ اب جو پھر میں ٹائپسٹ کے گھر کی طرف متوجہ ہوا تو مجھے کوٹھڑی کے اندر سے کسی
کے سسک سسک کر رونے کی آواز سنائی دی۔ ٹائپسٹ بھی اس طرف متوجہ ہوا۔ اور فوراً اٹھ
کر وہاں چلا گیا۔ میں منتظر تھا کہ وہ آئے تو ماجرا پوچھوں۔ وہ آیا بدحال، پریشان، دلگیر، گریہ خاموش
کی صورت میں نے حالت پوچھی۔ کہنے لگا "جناب! میرا بچہ ایک ہفتہ سے بیمار تھا، کل رات
سے اُس کی حالت بہت خراب ہو گئی ہے۔ محلہ کے ایک حکیم صاحب کو دکھلایا تھا۔ وہ نمونیہ
بتلاتے ہیں مگر صاحب پیسے کہاں جو دوائیں خریدوں۔ کسی ڈاکٹر کو بلا سکتا نہیں سوائے
صبر کے کیا چارہ ہے۔ ابھی اُس کا بخار بڑھ گیا ہے۔ وہ اپنی ماں تک کو اب نہیں پہچانتا۔
ٹائپسٹ کی آنکھیں پُرنم ہو گئیں۔ میرا دل بھی بھر آیا۔ وہ پھر ٹائپ کرنے لگا۔ اُسے یہ اُمید

بندھی ہوگی کہ پیسے مل جائیں گے تو بھاگ کر حکیم صاحب کے ہاں سے دوا لے آؤں گا۔ وہ تیز تیز ٹائپ کر رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ فطرت بھی کتنی ظالم ہے۔ جس طرح ٹائپسٹ کی انگلیوں کے اشارے پر ٹائپ رائٹر کی سلائیاں اُٹھتی ہیں اور گرتی ہیں اور ٹائپسٹ جو چاہتا ہے سفید کاغذ پر اُن سے لکھوا لیتا ہے' اُسی طرح انسان بھی فطرت کے ہاتھوں مجبور رہے۔ فطرت کا ہاتھ اُسے جہاں چاہتا ہے لے جاتا ہے اور اُسے چون و چرا کی گنجائش نہیں ملتی۔ مگر کیا فطرت واقعی ظالم ہے؟ میرے دماغ نے پھر غور کیا۔ فطرت ظالم ہو مگر انسان اِس سے زیادہ ظالم ہے۔ فطرت کا قانون سب کے لئے یکساں ہے اور سرمایہ داروں کا بنایا ہوا قانون غریبوں کو پیسے جاتا ہے۔ سود خواری کے کولھو میں انسانیت پیلی جا رہی ہے۔ زلزلہ امیر اور غریب کیلئے یکساں آتا ہے۔ اور ہو سکتا ہے فطرت سیلاب اور زلزلوں کے ذریعہ غربا اور مظلوم فقرا کی ناقابل برداشت تکالیف کا خاتمہ کر دیتی ہو اور تہذیب و تمدن کے فرعونوں اور انبیائے اور پاپ کے راونوں کو سبق سکھاتی ہو مگر دولت کا قانون غریبوں کے لئے عرصۂ حیات تنگ کرتا جا رہا ہے اور امیروں کی جیبوں میں زر اور دماغ میں غرور و تکبر بھرتا جاتا ہے میرے دماغ میں مختلف خیالات ہجوم کر رہے تھے۔ یک بیک خیال آیا کہ میں ٹائپسٹ کی اجرت پہلے ہی کیوں نہ دیدوں۔ تاکہ وہ جا کر دوا لے آئے۔ کام وہ بعد میں کرتا رہے گا میں نے جیب سے پیسے نکالے اور ٹائپسٹ سے کہا۔ "یہ پیسے لیجئے مطلب سے جا کر دوا لے آیئے" اُس کی آنکھوں سے شکر و احسان مندی کا جذبہ ٹپکا پڑتا تھا۔ اُس نے کام چھوڑ دیا اور

پیسے لے کر اُٹھا کہ جا کہ دوا لے آئے۔

ٹائیپسٹ ابھی سائبان سے باہر نہیں نکلا تھا کہ ایک سکھ مہاجن کرپان لئے موٹے بلا کی طرح نازل ہؤا۔ جیسے کبوتر کا خون بلّی کو دیکھ کر خشک ہو جاتا ہے اور طاقتِ مدافعت نہ رہنے کی وجہ سے آنکھیں بند ہونے لگتی ہیں بالکل اسی طرح ٹائیپسٹ کے اوسان خطا ہونے لگے۔ سکھ نے آتے ہی کہا "کیوں جی! اس مہینہ کا سُود مجھے نہیں دو گے؟ ایک ہفتہ سے زیادہ ہو گیا۔ اِسی وجہ سے میں نادہندوں کو قرض نہیں دیتا۔

سکھ نے میری طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا اور پھر ٹائیپسٹ کی طرف یہ کہتے ہوئے لپکا . . . . "تمہارا کام تو چل رہا ہے اور تم پیسے نہیں دیتے دیکھوں تمہاری جیب" یہ کہتے ہوئے اُس نے ٹائیپسٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور سب پیسے نکال لئے۔

ٹائیپسٹ بے حس و حرکت ایک برق زدہ کی طرح کھڑا رہا۔ سکھ کہنے لگا "ارے یہ تو سود کا ایک چوتھائی ہؤا۔ اور نکالو پیسے" یہ ہو ہی رہا تھا کہ کوٹھڑی کے اندر سے دھاڑیں مار کر رونے کی آواز آئی۔ ٹائیپسٹ پلٹ کر اندر کی طرف بھاگا۔ رونے کی صدا پیہم آ رہی تھی۔ میں پریشان، دکھی، غصہ میں بھرا کھڑا تھا۔ ٹائیپسٹ دوڑ کر واپس آیا۔ اور میرا ہاتھ پکڑ کر یہ کہتا ہؤا کوٹھری کے اندر لے چلا "جناب میرا بچہ . . . . دیکھئے تو ذرا آپ اس کی نبضیں . . . . بند ہو گئیں کیا؟" سکھ کچھ سمجھ کر چلا گیا۔ میں نے اندر

جا کر دیکھا کہ لڑکے کی ماں روتے روتے بے حال ہوئی جا رہی ہے۔ بچہ بے سدھ پڑا ہے۔ میں نے نبضیں دیکھیں۔ وہ چلتے چلتے تھک کر ڈوب گئی تھیں۔ مریض دنیا کے جور و ظلم سے آزاد ہو چکا تھا۔

ٹائپسٹ نے بدحواسی کے عالم میں کہا: "ہائے میرے بچے! میں تیرا علاج بھی نہ کر سکا تو روٹھ کر چلا گیا اور اب کفن دفن کے لئے بھی میرے پاس کچھ نہیں"۔ ٹھیک اسی وقت تین بچے کھیل سے فارغ ہو کر روتے ہوئے آئے: "اماں کھانا! اماں کھانا!" اِن معصوموں کو کیا معلوم کہ زندہ رہنے کے لئے ان کے والدین پیسے کہاں سے لائیں جب مرنے کے لئے بھی اُن کے پاس پیسے نہیں۔

آخری اِکنّی

"رنگون ہیر سیلون" کی گھومنے والی کرسی پر بیٹھا ہوا سہیلؔ ماضی کی خاکستر میں چنگاریاں تلاش کر رہا تھا۔ حجام کے استرے سے کھر کھر کی آواز آرہی تھی۔ ایک طرف کی ڈاڑھی آدھی صاف ہو چکی تھی، ٹھڈی اور گالوں کے بقیہ حصّوں میں صابن کا سفید جھاگ لگا ہوا تھا اور باتونی حجام طرح طرح کی باتیں کیے جاتا تھا۔ "ٹیوشن" کی تلاش میں سہیلؔ نے تین چار روز سے "شیو" نہیں کیا تھا۔ داڑھی کے سیاہ نوکدار بال سفید جھاگ کے اندر سے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ جیسے دو بارہ چینی میں کالی چیونٹیاں لگ گئی ہوں۔

"حجور! آپ لوگ سیفٹی سے شیو کر کے داڑھی کو کڑا کر دیا ہے۔ سب بابو لوگ کو دیکھا سرو ڈس میں نرم نرم داڑھی۔ بلیڈ لگا نہیں کی کانٹا کی طرح کڑا ہی" حجام نے لطیف انداز میں اپنا

پروپیگنڈا کیا۔ سہیل خاموش بیٹھا ہوا عالمِ تصور میں غرق تھا۔ اور ٹیبل پر بجلی کا پنکھا مسلسل فر فر کرتا ہوا گردش کر رہا تھا۔

"زہرہ کی تعاقب کرنے والی نگاہیں! کتنی موثر نگاہیں! میرے دل میں ایک مدہوش کن احساس کی کیسی لطیف لہریں اٹھی تھیں چنبیلی کی طرح سفید رنگ اور اس پر گلابی گلابی دہک سی" سہیل کے دل میں پھر لہریں اٹھنے لگیں —— "بھولی بھالی سی زہرہ مگر اس بھولے پن میں کتنی ہوشیاریاں پوشیدہ تھیں۔ اُف! وہ چونکی ہوئی معصومیت! اس کی محبت انگڑائی لیکر اُٹھی تھی۔ اس نے کتنا خلوص مجھ پر نچھاور کیا تھا۔ وہ میرے لئے کتنی بیتاب تھی۔ کن کن بہانوں سے وہ میرے قریب آکر بیٹھتی۔ اُس کی نازک بیل جیسی انگلیوں کا میری انگلیوں سے مس ہونا۔ دانستہ۔ پھر میری جرأتیں —— ہاں میری اُنہی جرأتوں میں تو اس کی کامیابی پوشیدہ تھی۔ میں اُس کی میز پر بیٹھ کر خط لکھتا۔ یا کسی مضمون کے مکمل کرنے کی ناکام کوشش کرتا تھا اُس کا کہنیاں ٹیک کر میز پر اس طرح جھک جانا کہ اس کا کھلا ہوا چہرہ۔ اُس کی نرم اور چکنی ہتھیلیوں پر رکھا ہوا پھیلے ہوئے نازک پتوں کے درمیان کنول کا پھول معلوم ہوتا کتنا دلفریب ہوتا تھا وہ منظر! ——"

"کھر کھر کھر" حجام کا ہاتھ تیزی سے چل رہا تھا اور اتنی ہی تیزی و تسلسل سے اسکے لب بھی ہل رہے تھے —— "حجور! سنا کی ابھیج بابو کو نوکری نہیں ملی۔ بی۔ اے، ام۔ اے۔ او کالت آجکل کے جمانے میں سب بیکار۔ رحمت بابو، سنکر بابو، مکرجی بابو، چھلو بابو، رام نرائن بابو کس کس کا نام بتا دیں سب نوکری کے لیئے بیری کرتے کرتے تھک گئے۔ بابو کو لیج اور ہوسٹل کا

کھرچا کتنا مشکل ہے ؛ پال بابو نے تو درجی کا دوکان کھول لیا۔ مگر ہاسم بابو کے پسر ہٹے کی دوکان پھیل ہوگئی۔ سچ کہے ہیں سہیل بابو۔ کر گہہ چھوڑ گرہستی۔ کہاں تو ام۔اے۔ بی۔ اے یس، گڈ، بیری بل، اور کہاں آٹا دال کا بھاؤ! ....."

سہیل نے سُنی اَن سُنی کر دینی چاہی۔ مگر حسن کے رنگین تصور میں بھی وہ غم روزگار کو غرق نہ کر سکا۔ اس کے دماغ کے تاریک گوشوں سے نئے خیالات اُٹھنے لگے جیسے کوئی نشے سے ہوش میں آنے لگے۔ ماضی کی دلکشی کا فریب ٹوٹنے لگا۔ اور حال ؛ غیر یقینی، دُھندلا، لیے اُس، فسردہ، ناکام۔ اِسی بے روزگاری کے عفریت نے ہی راون کی طرح زہرہ کو اس سے چھین لیا تھا ــــــ سیلون کا حجام ریڈیو میں فٹ بال میچ کی روئداد بیان کرنیوالے کی طرح مسلسل بولتا جا رہا تھا۔ مگر سہیل کے تخیل کا قلم اُس سے بھی زیادہ تیز چل رہا تھا۔

"زہرہ! بے روزگاری! ..... آہ! مگر حسن کی رعنائیوں سے کتنی زیادہ اہم زندگی کی تلخ حقیقتیں ہیں ..... "! ماضی کے زریں لمحات کا تصور نہایت تیزی کے ساتھ گزر گیا اور اس کی تاریکیاں حال کی الم انگیزیوں سے ملکر اور بھیانک ہو گئیں۔

"...... محبت بھی شاید ایک موسمی پھول ہے۔ کھلا اور مرجھا گیا۔ زہرہ کیسی بدل گئی! اس کی آنکھوں کے افق میں محبت کے ستارے اب نہیں جگمگاتے۔ بی۔اے کی ڈگری، کانووکیشن، زہرہ کے گلنار کی طرح سُرخ دتر لب، اس کا گداز جسم ابھرے ہوئے سینوں کا زیر و بم، پھاگن کی دوپہر کی ہوا کی سی گرم و خواب آور سانس ...... "! سہیل گھومنے والی کرسی پر بیٹھا ہوا کھو سا گیا، وہ زہرہ کی سانس کی گرمی اور اس کے لبوں کی حلاوت

اب بھی محسوس کر رہا تھا۔

"حجور آپ کی نوکری کب تک ہوگی؟" آپ پر زور دیتے ہوئے سیلون کے حجام نے دریافت کیا۔

سہیل چونک پڑا، جیسے کسی کی آہٹ پاکر اُس نے زہرہ کو اپنی آغوش سے علیحدہ کیا ہو مگر اُس نے کوئی جواب نہ دیا ــــــ وہ پھر سوچنے لگا ــــــ شکستِ فریب! بیروزگاری ۔ بیکاری کا سوچ ۔ دو سال تک ملازمت کے لئے جد وجہد ۔ امیدوں کی بھول بھلیاں، ناامیدی کا لِبس، حال کا کھوکھلا پن ۔ طنز کناں ماضی کے قدموں کی آہٹ اب تک سنائی دے رہی تھی ۔

"کیا کروں! ام ۔ اے لوں تو کیونکہ لوں ۔ ٹیوشن مل جاتی تو شاید میں یہ آخری کوشش بھی کر لیتا ۔ ٹیوشن، کھانا اور دس روپے ۔ ام ۔ اے کی فیس ۔ ایک اور ٹیوشن ۔ شاید کوئی صورت نکل آئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

داڑھی منڈ چکی تھی ۔ پھٹکڑی لگانے کے بعد حجام نے پف کو پوڈر پریس کر کے سہیل کے رخساروں پر ملا ۔ سہیل بڑے آئینہ میں منعکس تصویروں کو بے دلی سے دیکھ رہا تھا ۔ سینما کے ستاروں کی تصویریں ۔ کانن ۔ دیویکا رانی اور لیلا چٹنس ۔ کیلنڈر کے مرقعے ۔ جواہر لال ۔ جناح اور دوسرے لیڈروں کی شبیہیں ۔ سہیل کی نگاہیں ایک فلم ستارے کی تصویر کے عکس پر جم کر رہ گئیں ۔ اس کے دیکھنے کی ادا کس قدر زہرہ کی ادائے نظر سے مشابہ تھی ۔ پیشانی کی لوٹ، چہرے کے بالائی حصے کی تراش، لبوں کا خم سبھی چیزیں زہرہ کی یاد دلاتی تھیں ۔ رفتہ رفتہ فلم ستارے کی تصویر کے عکس کا احساس غائب ہو گیا ۔ سہیل کو ایسا معلوم ہوا کہ زہرہ اس کے سامنے

بیٹھی ہوئی ہے۔ اس کی آنکھیں شرمندہ ہیں اور اس شرمندگی میں محبت کی تجدید کا پیغام مچل رہا ہے "چیری بلوسم" کی روح پرور خوشبو چلی آرہی تھی۔ وہ زہرہ کا پاؤڈر۔ زہرہ نے اسے بالکل اپنا بنا لیا تھا۔ اس کے سیمیں رخسار، اس کی مرمریں گردن سے ہوا کی نازک لہریں ہمیشہ ہی جان بخش شمیم چرا لاتی تھیں۔ یہی بوئے دلنواز ابھی بھی سہیل کے مشام جاں کو تازہ کر رہی تھی سہیل زہرہ سے باتیں کرنی چاہ رہا تھا۔ مگر ایک سال کی طویل مدت کے بعد وہ غیریت سی محسوس کر رہا تھا۔ زہرہ اُسے فراموش کر چکی تھی۔ اور ایک مالدار گھر کی مالکہ بن کے وہ غم ہائے روزگار کے مارے ہوئے سہیل کو کبھی کبھار کی ملاقات کے موقع پر بھی نظر انداز کرتی ہوئی گذر جاتی تھی ——— سہیل گوناگوں جذبات سے دبا جا رہا تھا اور "چیری بلوسم" کی خوشبو اُس کے سوئے ہوئے ارمان و تمنا کو بیدار کر رہی تھی، اس کی رُوح ایک خاص سکر، ایک لذیذ اطمینان میں غرق تھی۔ زہرہ اس کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ بہت ہی ہمت کر کے سہیل نے آہستہ سے کہا۔ "زہرہ!"

ٹھیک اُسی وقت سامنے بازار میں ایک بے فکرا زور زور سے سمع خراشی کر رہا تھا۔

"آہ جالم! مار ڈالا، آنکھ سرمائی ہوئی"

اس دماغ سوز نغمہ نے سہیل کے تصوّر کا طلسم توڑ ڈالا۔ زہرہ یہاں سے بہت دور کسی مالدار گھر کی مالکہ بنی بیٹھی تھی۔ آئینہ میں صرف فلم ستارے کی تصویریں سہیل کا منہ چڑا رہی تھیں۔ اور ایک گوشہ میں گاندھی جی کی تصویر ہندوستان کی غربت و فلاکت کا مجسمہ بنی ستیہ گرہ کے جالے بن رہی تھی، سیلون کا حجام سہیل کے رخساروں پر "چیری بلوسم"

کا پاؤڈر مل رہا تھا۔

سہیل کو ٹیوشن مل گئی، مگر صرف ایک۔ اس نے مشکلوں سے ام۔ اے میں نام لکھوا لیا اور نوکری کی مستقل تلاش بھی جاری رہی۔ بات بکھیڑے کی ایک اور بھی ام۔ اے کر لینے کے بعد فوراً ہی اس کی عمر ملازمت سرکاری کے لئے مقرر شدہ معیار سے زیادہ ہو جاتی تھی۔ لہذا وہ اس فکر میں نہایت ہی پریشان رہتا تھا کہ کوئی نوکری بھی جلد مل جائے۔ آفس گردی اور بنگلہ پیمائی اس کا مشغلہ سا ہو گیا تھا ——— کہیں تو اسے ٹکا سا جواب ملتا، کہیں ڈانٹ کہیں جھڑکی اور کہیں نصیحتیں ملتیں۔ ایسی نصیحتیں، جن کی بے کیفی، کھوکھلا پن اور سرد مہری جھڑکیوں سے بھی زیادہ وحشت ناک ہوتی: "آج کل کے نوجوان محنت سے بھاگتے ہیں۔ تجارت نہیں کرتے امتحان میں اونچے نمبروں سے پاس کرنے کے لئے محنت نہیں کرتے۔ رجسٹراری کے لئے درخواست دیتے ہیں تو ہندی پڑھنے کی مشق بہم نہیں پہنچاتے۔ . . . کھیتی اگر جدید آلات کے ساتھ کی جائے تو پھر بیکاری کیوں رہے۔ یورپ کو دیکھو۔ ہندوستان کے نوجوان سائنس اور صنعت میں بہت پیچھے ہیں۔ صابن بنانا، دوا سازی، ربڑ کی کاشت۔ کٹ پیس کا بیوپار، یہ سب کرنے کے کام ہیں مگر آج کل کے نوجوان" . . . . وغیرہ وغیرہ۔ غرض سہیل کو اطمینان نام کو بھی نصیب نہ تھا، رہنے کھانے اور پڑھنے کا انتظام تو ہو گیا تھا۔ مگر وہ "نیو ڈسٹ کالونی" کا ممبر تو تھا نہیں کہ "تن کی عریانی سے بہتر نہیں دنیا میں لباس" پر ایمان لے آتا۔ اس کے والد صاحب ایک بہت بڑے کنبے کے بہت غریب سرپرست تھے۔ مشکلوں سے سہیل کے

کپڑے لتے کا انتظام ہوتا تھا کسی طرح توڑ جوڑ کر انہوں نے سہیل کو بی۔ اے کرادیا تھا مگر اب خاندان اور زیادہ بڑا، دنیا اور زیادہ تنگ ہو گئی تھی۔ سہیل بڑی تنگی ترشی سے بسر کر رہا تھا۔

سنیچر کی شامیں خصوصاً فلم گھروں میں ہندوستان کے شہریوں کیلئے مسرت نہیں فریبِ مسرت کا سامان مہیا کرتی ہیں۔ ہماری بے کیف زندگیاں آنی فانی رومانوں کا سہارا ڈھونڈتی ہیں فلم کے پردہ پر حلقۂ دامِ خیال کے اندر شفق کی رنگینیاں، نغمہ کا ترنم، دلربا صورتیں، لہراتے ہوئے پلّو، لچکتی ہوئی کمریں، مٹکتے ہوئے بھرپور کولھے، سہمیں قہقہے، محبت کی نیرنگیاں، ایک عالم رنگ و بو، ایک فضائے سرمستی وسکر، ایک کیفیت انبساط وخود فراموشی پیدا کر دیتی ہیں ہم زندگی کی تلخ حقیقتوں کو وقتی طور پر بھول جاتے ہیں مگر سینما ہال سے نکلنے کے بعد حقیقت کے کچوکوں کی نشتریت اور قاتل ہو جاتی ہے سینما کی دنیا اور عام زندگی میں ہمارے یہاں ناقابلِ برداشت تضاد ہے۔ تاہم جہاں کچھ نہ ہو وہاں تھوڑا سا فریب رنگ و نور بھی بہت ہے سہیل کی دنیا تو اور زیادہ تاریک تھی۔ اس کے بیدار احساسات اُسکی جاگی ہوئی تمنائیں۔ اُسکے افقِ تصور کی وسعت، اس کی تعلیم و تہذیب۔ یہ سب چیزیں دنیا میں تنوع، رنگینی آبادی نشاط اور روانی کی متقاضی تھیں اور سب سے بڑھ کر محبت کی بہاروں میں کھیلا ہوا دل سہیل کو "فردوسِ گمشدہ" کے لئے بیتاب رکھتا تھا۔ اور حاصلِ اضطراب؟ مایوسی محرومی و ناداری!

سہیل فلم کی جنت گذراں میں کبھی کبھار داخل ہوا تھا لیکن اس کی موجودہ حالت اسے اس بھی محروم ہی رکھتی تھی۔ وہ نہ تو ہندوستان کا مزدور تھا کہ شراب کی بھٹی یا تاڑی خانہ

میں جا کر غم غلط کرتا اور نہ ایسا فارغ البال طالب علم کہ گویا فلموں کی ہزار داستان سنتا۔ وہ اکثر سینما ہال کے باہر میدان کے مزے پر تر سنے والوں کے ہجوم کے ساتھ کھڑا رہتا تھا لیکن اب "رنگون ہیر سیلون" سہیل کے لئے سامانِ صد نشاط تھا۔ وہ اس کی زندگی کے ریگستانوں میں ایک نخلستان تھا۔ زہرہ سے مشابہ تصویر آئینہ میں جلوہ فگن اور "چیری بلوسم" کی وہ خاص خوشبو اس کے لئے پیراہنِ یوسف کی بو تھی اور وہ جلوۂ طور۔ زہرہ اُسے بھول گئی تھی۔ وہ بھول سکتی تھی۔ اُسے اس کا موقع حاصل تھا۔ کھاتے پیتے گھر کی مالکہ کنجی کے بھبوں کی رکھنے والی اور ماماؤں پر حکومت کرنے والی ایک فلاکت زدہ نوجوان کو بھول سکتی ہے مگر وہ نوجوان ماضی کی عشرتِ رفتہ کو کیونکر بھول جائے جو اس کے لئے سرمایۂ نشاط ہو۔ سہیل زہرہ کو بھول کر اپنی زندگی کو بالکل ویران نہیں کر سکتا تھا۔ "چیری بلوسم" کی لپٹ اُسے گذرے ہوئے لمحات جنت نگاہ و فردوس گوش لمحات کی یاد دلاتی تھی۔ اس کی خوشبو کی موجوں کے جھونے پر جھولتا ہوا وہ ماضی کے پردوں کو چاک کر دیتا تھا اور "سیلون" کی چھوٹی سی دنیا میں سہیل زمان و مکان کی قید سے آزاد ہو جاتا تھا جب بھی اس کے پاس ایک اکنّی ہوتی اور اس کی داڑھی کو "شیو" کی ضرورت تو وہ "رنگون ہیر سیلون" کا رُخ کرتا۔ رنگین شیشے، لہراتے ہوئے قوس و قزح کے رنگ کے پردے، مسکراتی ہوئی تصویریں، قدِ آدم شفاف آئینے، صاف چمکتی ہوئی میز، سفید براق تولئے بے داغ چمچاتے ہوئے استرے، قینچیاں، بال تراشنے کی مشین، رنگ برنگ کی کنگھیاں، طرح طرح کے لوشن، تیل اور اُن کی خوبصورت شیشیاں، میز کے سامنے زہرہ سے مشابہ تصویر آئینہ میں جلوہ باد اور چیری بلوسم کی خوشبو یہ سب سامان قاف کی پریوں کی طرح یا کسی طلسمی محل کی حسین و جمیل شہزادیوں کی مثال سہیل کو اپنی

طرف اشاروں سے بلاتے تھے اور اکثر وہ ان کے بلاوے قبول کر لیتا تھا۔

موسمِ گرما کی لمبی چھٹیاں شروع ہو گئی تھیں سہیل امتحان کی تیاری کے خیال سے گھر نہیں گیا۔ جن صاحب کے یہاں اُس کی ٹیوشن تھی وہ تعطیلات میں شہر سے باہر چلے گئے۔ انہوں نے اتنی عنایت کی کہ اُسے مکان کی ایک کوٹھری میں رہنے کی اجازت دے دی سہیل اپنی کوٹھری میں رہتا تھا لیکن کھانے کا اب کیا انتظام ہو۔ ایک سستے ہوٹل میں اس نے اس کا بڑی مشکل سے اہتمام کیا۔ طے یہ ہوا کہ ہفتہ ہفتہ کھانوں کی قیمت ادا کر دی جائے۔ کیونکہ ہوٹل والے کو طلباء کا، بقول اس کے، اکثر تلخ تجربہ ہوا تھا۔ سہیل کے پاس پیسے نہ تھے وہ سخت متفکر تھا۔ قرض لینے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ وہ اپنے والد سے بھی روپے مانگنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ وہ خود بڑی تنگ حالی سے بسر کر رہے تھے مگر آخر وہ کرتا کیا چھٹی ہوتے ہی اس کے ایک آدھ دوست بھی گھر چلے گئے تھے۔ چاروناچار اُس نے والد صاحب ہی کو خط لکھا۔

ایک ہفتہ گزر گیا مگر سہیل کے والد کے یہاں سے نہ روپے آئے اور نہ کوئی خط ہی آیا۔ ہوٹل والے نے سخت تقاضا شروع کر دیا اور وہ تین روز کے بعد اُس نے کھانا کھلانے سے قطعی انکار کیا۔ اب سہیل کے لئے بڑی دقتوں کا سامنا تھا۔ اُس نے دوسرے ہوٹلوں میں کوششیں کیں مگر بعض نے سرے سے ہی انکار کر دیا اور بعض پہلے ہوٹل والے کے پروپیگنڈا سے متاثر ہوئے سہیل کے پاس کچھ پیسے تھے۔ بڑی کفایت شعاری سے وہ انہیں کھانے پر خرچ کرتا رہا یہاں تک کہ اس کے پاس ایک آخری اکنی رہ گئی۔

سہیل نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ وہ اپنی کوٹھری میں لیٹا ہوا ڈاکیہ کا انتظار سہ پہر تک کرتا رہا۔ شاید والد صاحب کے یہاں سے چند روپے آجائیں۔ ہر آہٹ پر چونک چونک پڑتا اور پھر سوچ فکر میں غرق ہو جاتا۔ امیدوں کا بندھ بندھ کر ٹوٹنا اور ٹوٹ ٹوٹ کر بندھنا۔ وہ اسی کیفیت میں غوطے کھا رہا تھا۔ شام ہو گئی۔ وہ بھوکا تھا اور مضمحل۔ تنہا کوٹھری کی تاریکی میں اس کا دم گھٹنے لگا۔ زندگی اس کے لئے ایک ظالم کے خواب کی تعبیر تھی اور اس کی رنگینیاں ایک مجنونانہ حقیقت، مگر اس حقیقت کے لئے وہ ترس رہا تھا۔ اس کا معدہ خالی تھا۔ اور اُس کا دماغ تخیل سے آباد۔ وہ روپوں کی طرف سے بالکل مایوس ہو گیا۔ انتہائے مایوسی میں بھوک کے احساس نے بھی دم توڑ دیا۔ وہ تخیل و تصور کے عالم میں پرواز کرنے لگا .....

"... نوکری فارغ البالی اطمینان، ایک گھر چھوٹا سا، خوبصورت سا، پُرامن۔ اس گھر میں زہرہ اور اس کی رعنائیاں، زہرہ کے سُرخ لب، سیمیں بازو ابھرے ہوئے گول گول چاند کی طرح سفید سینے ......" انہیں خیالات میں سہیل پر غنودگی طاری ہو گئی اور اسکی آنکھیں جھپک گئیں لیکن بھوک کی شدت نے اُسے تھوڑی ہی دیر میں بیدار کر دیا۔ وہ اُٹھ بیٹھا بستر سے اُٹھ کھڑا ہوا اور غیر شعوری طور پر اس نے چپلیں پہنیں، تکیہ کے نیچے سے اکنی نکالی۔ اور کوٹھری بند کر کے بازار کی طرف چل دیا۔ سڑکوں کی چہل پہل، سجی ہوئی دوکانوں کی جگمگاہٹ برقی قمقموں کی قطاریں فٹنوں پر حسن سرِ رہ گذر کی ارمان خیز ادائیں ایک ایسا منظر پیش کر رہی تھیں جو اس کی ویران کوٹھری کی مایوس فضا سے بہت مختلف تھا۔ اس کے دل میں بھی امنگ سی اُٹھی۔ ایک ہلکی سی موج۔ اس کی کچلی ہوئی آرزوئیں سر اٹھانے لگیں۔ کاش وہ بھی

ان نعمتوں کا حصہ دار ہوتا! پھر اس نے بھوک کی تکلیف محسوس کی اور اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک انتھاہ نا اُمیدی کے غار میں گر گیا۔ اس کا دماغ سوچنے لگا ——— "یہ بھی کوئی زندگی ہے! سر کھپانا اور بھوک مرنا۔ ایک ہی دفعہ موت کیوں نہیں آجاتی۔ مگر دنیا سے بغیر کچھ لیئے ہوئے اُس پر جان کی بھینٹ چڑھا دینی ——— حماقت ہے . . . . . . یہ رنگینی، یہ بہار، یہ شباب! اس میں میرا کچھ حصہ نہیں؟ . . . مگر ہے یہی پھر کیوں جیئے جائیے؟ جیئے جانے کی تہمت برداشت کیجیے؟ میں بھوکا ہی مر کر جان کیوں نہ دیدوں؟ یہ حماقت ہی سہی لیکن اس حماقت میں کتنا سکوت ہے، ابدی نجات، زندگی کی بیہودگیوں سے آزادی . . . ."

سہیل ابھی ادھیڑ بن میں "رنگون ہیر سیلون" کے سامنے پہنچا۔ خود بہ خود اُس کے قدم رکنے لگے۔ طلسمی محل کی حسین شہزادیاں اُسے اشاروں سے بلانے لگیں۔ گھٹا ٹوپ بادل کے درمیان ایک ننھا سا روشن ستارہ کتنا دلکش ہوتا ہے۔ سہیل نہ جانے کیسے سیلون کے اندر داخل ہو گیا۔ زہرہ سے مشابہ تصویر کے جلوے اور چیری بلوسم کی دلنواز خوشبو۔ وہ اپنی حالت کو بھول سا گیا۔ وہ سیدھا بڑھتا گیا اور جا کر گھومنے والی کرسی پر بیٹھ رہا لیکن جب اُس کی نگاہیں حجام سے چار ہوئیں تو اُسے یاد آیا کہ حجام کے کئی آنے جو شاید اب روپیہ بننے والے ہی ہوں، اس کے ذمہ باقی ہیں! بس خیال کے آتے ہی اس نے جیب سے آخری اکنی نکالی اور سامنے کی جھلکتی ہوئی میز پر رکھ دی۔ حجام نے اپنا کام شروع کیا۔ ایک بڑا سا سفید رنگیں دار تولیہ اُس نے سہیل کے گلے سے آویزاں کر دیا اور داڑھی میں صابن لگانے لگا ——— "حجور بہت دن کے بعد آئے؟ کاہے حجور کچھ بیمار تو نہیں ہے؟" توند حجام نے اپنا دوسرا کام بھی شروع کر دیا۔

سہیل یہاں فریبِ عشرت کھانے آیا تھا۔ باتیں کر کے وہ اپنی یکسوئی کو، اپنی تخییل کے رنگین و نازک جالوں کو صدمہ پہنچانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ آئینہ میں زہرہ کے جلووں کو ڈھونڈھ رہا تھا۔ اور اس کا خاص پاؤڈر "چیری بلوسم" سہیل اسی شمیم دلنواز کے انتظار میں تھا لیکن آئینہ میں کچھ ویرانی سی تھی۔ زہرہ سے مشابہ تصویر کا عکس آج اُس میں نظر نہیں آرہا تھا۔ اُس نے آئینہ کے ہر گوشہ کی طرف نظر کی مگر اسے ناکامی حاصل ہوئی۔ اس نے خیال کیا کہ تصویر کسی دوسرے گوشے میں لگ گئی ہے۔ داڑھی بن جانے کے بعد وہ سیلون کے ہر گوشے میں اسے تلاش کرے گا۔ سامنے آئینہ میں زہرہ سے مشابہ تصویر کی جگہ ایک صحت مند بچہ کا عکس تھا جو برطانیہ بسکٹ کھا رہا تھا۔ سہیل کو بھی بھوک لگنے لگی۔ اُس نے پیٹ میں اینٹھن محسوس کی۔ سامنے جھلکتی ہوئی میز پر اگنی مسکرا رہی تھی۔ اس کا عکس پتیل کی چمکیلی سطح پر صاف نظر آرہا تھا۔ سہیل "چیری بلوسم" کا منتظر تھا، جیسے کوئی شرابی دستِ ساقی سے شراب ملنے کا انتظار کھینچ رہا ہو۔ داڑھی بنا کر حجام "چیری بلوسم" ملے گا۔ آہ! وہ زہرہ کا خاص پاؤڈر! اُس نے محسوس کیا کہ اب زہرہ آرہی ہے۔ اب آرہی ہے، وہ پردہ در میں لرزش پیدا ہوئی وہ اُس کی خاص خوشبو کی لپٹ آئی . . . . .

حجام ٹھکری لگا رہا تھا۔ اُس نے پف کو پاؤڈر میں غلطاں کر کے سہیل کے رخساروں پر ملا۔ ایک تیز بُو اڑی جیسے اُن پاؤڈروں سے اڑتی ہے۔ جو اسپتال میں نرسیں وارڈ سوز پر مالش کرتی ہیں۔ باتونی حجام نے سوال کیا۔

"حجور! اس لڑائی میں سرکار کا کتنا کھرچ ہوتا ہو گا؟ ہر جگہ سے روپیہ جا رہا ہے حجور"

تیز بو کی لپیٹ نے سہیل کو چونکا دیا۔ حجام نے تولیہ سے پاؤڈر ہلکا کیا۔ سہیل کا سر چکرا رہا تھا۔ میز پر چیری بلوسم کے ڈبہ کی جگہ ہیڈ بکیٹیڈ ٹلکم پاؤڈر کا ڈبہ رکھا ہوا تھا۔ وہ آخری اکنی مسکرا رہی تھی۔

سہیل کرسی پر سے اٹھا اور بے تابی سے سیلون کے ہر گوشہ میں زہرہ سے مشابہ تصویر ڈھونڈنے لگا۔ جیسے کوئی تھوڑی سی بچی ہوئی شراب کے لئے مضطرب ہو مگر وہ تصویر کہیں نہ تھی۔ سہیل نے محسوس کیا کہ بال بنانے کی مشین اُسے کاٹ کھانا چاہتی ہے قینچیاں اُس کے دماغ کو کتر رہی ہیں اور استرے اُس کے گلے پر چل رہے ہیں۔ آخری اکنّی میز پر سے طنز آمیز چشمک کر رہی تھی۔

"...... کروڑوں روپیہ حجور؟" حجام نے دریافت کیا

سہیل تیورا کر سیلون کے فرش پر گر پڑا۔

بوڑھی ماما

"بابو ایک جروری بات ہے۔ بہت جروری بسنو گے؟"

میں چونک اٹھا۔ ماما دھیّا میرے لکھنے کی میز سے لگی بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس نے مجھے مخاطب کیا تھا۔ میں کچھ لکھنے میں منہمک تھا۔ وہ نہ جانے کب کی یوں بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے اُسے آتے ہوئے بھی نہ دیکھا۔ اُس کی آواز سن کر میں نے پلٹ کر دیکھا اور اُسے اپنے سر پر مسلّط پا کر بے اطمینانی کی ایک بے اثر احتجاجی انگڑائی لی۔

میں بوڑھی دھیا ماما سے بہت ڈرتا تھا۔ دنیا بھر کی شکایتوں کا دفتر بے معنی اس کی زبان کی نوک پر رہتا تھا۔ دائی نوکروں کی شکایتیں گھر کے لڑکوں بھرکوں کے شکوے مختلف لوگوں پر جارحانہ نکتہ چینیاں اور اکثر جملہ معترضہ کے طور پر ان خوش نصیبوں کے نام سو طرح کی صلواتیں

بھی ہوتیں، مگر حفظِ مراتب کا لحاظ رکھتے ہوئے شکایتوں، شکووں کے علاوہ ماما دھیا کے اپنے بھی حقیقی اور خیالی دکھڑے بھی ہوتے تھے۔ ایسی مسلسل گفتگو کے لئے زیادہ تر قسمتوں سے میرا ہی انتخاب ہوتا تھا۔

یہ بوڑھی ماما کوئی اسّی سال سے اوپر ہی کی ہو گی۔ اُسی کی اپنی روایت ہے کہ بڑّتیا اس کا بیٹا میرے نانا ابا کی برات کے دن پیدا ہوا تھا۔ ماما دھیا نے میرے گھرانے کی تین پشتوں کو اپنی گود میں کھلایا تھا۔ وہ میری بھی کھلائی رہ چکی تھی اور میری والدہ کی بھی۔ اور اب نئی پود کو سینچ رہی تھی۔ گھر بھر اُسے نانی یا دھیّا نانی کہتا تھا۔ بوڑھی ماما کو ٹال دینا آسان کام نہ تھا۔ اسکی ایک حیثیت تھی۔ یہیں گھر کا بڑا اگر اس کی بات نہ سنوں تو کون سنے۔ جو بے رخی برتوں تو پھر وہ میری عاقبت نہ بگاڑ دے۔ گو دنہ بخشنے کی ایک پوشیدہ دھمکی ہر وقت موجود تھی۔

اب جو میں نے بوڑھی دھیّا نانی کو بے موقعہ وقت پر اپنے سامنے حاضر و ناظر پایا۔ بس لمہ زہر کر تو رہ گیا، ضروری کاغذات دیکھوں، اہم باتیں لکھوں یا اس کی رام کہانی سنوں، مگر کرتا کیا، غصّہ تلخ دوا کی گھونٹ کی طرح پی گیا۔ اور بولا۔

"ہاں نانی کہہ نا کیا کہتی ہے؟"

نانی بولی۔ "کچھ نا بابو۔ یہی تورے پاس آئے تھے ہم پوچھے ہیں۔ ہٹنہ میں رہیں کی ناہیں۔ ــــــ جوڈر سے منصور بابو کے ایہاں سے بھاگے اوڈر میاں بھی ساتھ لگا رہا۔ تو ہیں کہہ نہ کہ ای لونڈہ ان چھکڑین سب ہمرے منہ لگتے لا گیھ ہیں؟"......

میں نے کلام کے سلسلۂ لامتناہی کو قطع کرتے ہوئے پوچھا "نانی کہہ نہ ٹھیک ٹھیک

بات! آخر ہوا کیا؟" ——— میں چاہتا تھا کہ کسی طرح تمت بالخیر ہو اور میں قلم کی گھس گھس پھر جاری کروں۔

بوڑھی نانی نے جواب دیا۔ "یہی مونڈی کاٹا شبر تیا ۔ ۔ ۔ مگر آکھر ہمرے بتاوے ہم کہاں جائیں؟ تو رے کھلایا، تو سے ماں کو کھلایا منصور کے بچن کو کھلا رہے ہیں۔ ہائے رسید! بچوا ہم سے الگ ہوتی رہے ؟ ہم جو آدے لگے تو بھکار مارکے کھوب نہ روئی۔ میرا دل کچوٹ کے رہ گیا۔ ادہی مجھپھر پور کی ببرجن۔ چولہا چکی سب ادہی کے ہاتھ۔ ہم سے بھلا گھر کا دولت لٹتے دیکھا جائے۔ یہی دو بات بولے۔ اسی کے گنہگار۔ لوٹ بابو لوٹ! آنکھ پر پٹی باندھ کے رہیں؟"

میں بے صبر ہوا جا رہا تھا۔ ذرا زور دیکر میں نے کہا۔ نانی مظفر پور کی بات چھوڑ نہ! یہاں کی کہہ کیا تکلیف ہے؟ شبر تیا نے کیا کیا؟" نانی نے سنی ان سنی کر دی اور پھر چلا چپہ خا۔

"ببرجن چل موہیں۔ نھی کیسی کھڑنی کی شکل کی۔ بابو گھر بھر لہیں، گھر۔ ہمرے جاڑا میں بڑسی تک تو بھرے دیوے ناکرے دو بھٹو کو نکہ کی بھی روا دار نا ——— اور سنیہو ——— لوٹ لاٹ کے بھاگ گئی۔ بچوا سب کو کِنا تکلیف ہوا۔ کوئی کھانا پکانے والا۔ کیسی بے ستی! ۔ ۔ ۔ ۔ مگر ادگئی تو کا ۔ ۔ ۔ "

میں نے گھبرا کے ٹوکا۔ "ارے بھائی اصل بات جلدی سے کہہ بھی دے!"

"کھپا ہو گیو بابو؟ ایک بات کہے کھاطر آئے تھے۔ تو آور بات سب بھی نکل آیا۔ مگر پیچھے بابو۔ سبر تیا ہمرے ٹیٹوں میں نا رہے دے گا۔ آج تک بھر پیٹ کھانا نا کالس ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آدرا ای بسلدتیا کو رٹھی؟ ستیا ناس! ستیا ناس! ایک دم کھاک! دن بھر ہمرے تنگ کر نا رہے ہے

گھر میں پلّو کے طرح آ وین او پلائے چلیں۔ مگر میرے حلک میں کوئی پانی بھی گرے گھڑی نا ٹپکا دے گا۔ وہ جُمّا گُجر گیا اور ہم نا نہانے۔ کوئی ایک چلّو پانی نا بھر دہیں۔ مر ہیو نہ جائیں سب۔ ہیجا ہو سب کو! پلیگ ہو! بلا جائیں سب . . . . !"

دوسری کوٹھری کی کواڑ کے پیچھے سلمتا یہ سب باتیں چھپ کر سُن رہا تھا۔ میری جو اُدھر نظر اُٹھی وہ دوڑ کر سیدھا دھب دھب کرتا ہوا سیڑھیوں سے نیچے اتر گیا۔ دھیّا نانی جب کبھی میرے پاس گھر کے ملازموں کی شکایات کرنے آتی تھی۔ تو سلمتا سایہ کی طرح اُس کے پیچھے لگا آتا تھا اور ساری روئیداد کی اطلاع وہ چٹ سے جا کر سارے نوکر نوکرانیوں کو کر آتا تھا۔ بوڑھی ما نے تنہا سارے گھر کے ملازمین کے خلاف محاذ قائم کر رکھا تھا۔

"بڑھیا! کھبرا وا ہمرے سب کے اکو سامت کر! ہم اکو سائٹن کر! ای گھر میں نوکری نہیں کریں گے۔"

نچلی منزل سے شبرتیا باورچی کی بپھری ہوئی آواز سنائی دی۔ سلمتا نے نیچے جا کر جھٹ کانا پھوسی کر دی تھی۔ "ارے مہجا دا! ڈگلے کا جنا ہمکو بڑھیا کہتا ہے رے؟ بڑھیا! بڑھیا! بڑھیا؟ ہوں! ہم فقیرنی ہیں؟ چمار دُسادھ کی بڑھیا ہیں؟ دھیا وائی کہنے میں حلک میں بھوکندر ہووے ہے؟" بوڑھی ماما نے جواباً صلواتوں اور بد دعاؤں کی بوچھار کی۔

میں لرز کر رہ گیا۔ اب ایک طویل جنگ کی ابتدا ہو چکی تھی۔ میں ذرا امن پسند واقع ہوا ہوں اور ایسے نازک موقعوں پر صرف "ارے بھائی جانے دو"، "اب ایسا نہیں ہو گا"، "ہو گیا ہو گیا"، "تم چپ رہو" "اچھا تم ہی ہٹ جاؤ" وغیرہ قسم کے فقرے مسلسل دہراتا جاتا ہوں۔ یہی میں نے

اس موقع پر بھی کرنا شروع کیا اور اُدھر سے ماما دھیا کا زور شور اور شبراتی کی رُک رُک کر چیخم دھاڑ۔

ماما دھیا کو شاید اس اسّی برس کے سن میں ریٹائر کرنا چاہیئے تھا اور ہم لوگوں نے اُسے سبکدوش کر بھی دیا تھا۔ لیکن وہ دنیا کو تیاگ دینے کے لئے بالکل تیار نہ تھی۔ اگر کوئی کہتا "نانی بوڑھی ہوئی۔ اب اُس سے کام دھام نہیں ہوگا، چپ چاپ بیٹھی رہے۔ کھائے اور آرام کرے تو اُسے سخت تکلیف ہوتی تھی۔ اس کا مستحکم عقیدہ تھا کہ دنیا کو اُس کی بہت ضرورت ہے وہ اپنی اہمیت ثابت کرنے کیلئے قریباً گھر کی ہر بات میں دخل دینا چاہتی اور دخل دیتی۔ وہ زندگی بھر بچّوں کی کھلائی رہی تھی۔ پر اب بچے اُس سے سنبھلتے نہ تھے۔ بوڑھی ماما کی طاقت جواب دے رہی تھی۔ ایک آنکھ میں موتیا بند اور دوسری کمزور۔ پھر بھی گویا زبردستی ہی وہ بچّوں کو گود اٹھائے پھرتی تھی۔ ایک دو بار وہ بچے کو لئے زینے پر سے لڑھک بھی گئی تھی۔ لیکن اُس کا الزام اُس نے کسی نوکر کے سر رکھا کہ سیڑھی پر روشنی جلا کر نہیں رکھی گئی۔ یا مالک مکان کو کوسا گیا کہ اُس بدبخت نے ایسی اونچی اونچی بے ڈھنگی سیڑھیاں بنائیں۔ جیوں جیوں اُس کی عمر رواں اُسے انجامِ حیات کے قریب تر لا رہی تھی۔ وہ اتنی ہی زیادہ حریصانہ طور پر زندگی کے ایک ایک لمحے پر اپنی اہمیّت و افادیت نیز تمنائے بقا کی مہر ثبت کرنی چاہتی تھی۔ بوڑھی ماما اکثر دائیوں سے اِس لئے لڑ جاتی تھی کہ اُسے سبزی ترکاریاں چھیلنے کو کیوں نہیں دی جاتیں۔ ہم لوگوں کے گھرانے پر وہ اپنی افادیت انتظامِ خانہ داری میں دخل دے کر ثابت کرتی تھی۔ دوسری کھلائیوں کو تو اُس نے کبھی قدم جمانے نہ دیا۔ لالچی سرمایہ دار کی طرح وہ اپنے

حلقۂ اثر میں اجارہ داری کی قائل تھی اور دوسروں کے دائرے میں دخل بے جا پر عامل۔ اگر غلطی سے کبھی کوئی کھلائی ٹمک گئی تو پھر غضب ہو گیا۔ ماما دھبا اسکے پیچھے پنجے جھاڑ کر پڑ جاتی تھی۔ اور پھر نتیجہ معلوم۔ فتح کا جھنڈا بلا انتشار ہمیشہ بوڑھی ماما کے ہاتھ ہی رہتا تھا۔ ہاں وہ اس کام پر چھپٹے چھوکروں کے رکھے جانے کی روادار ہو جاتی تھی۔ اس طرح منصب سیادت اس کے قبضہ میں ہی رہتا تھا۔ اور وہ حکومت جتا کر اپنی کمزوری اور ناکامی کے تلخ احساس کو بہت حد تک رفع کر لیتی تھی۔ مگر زمانہ بوڑھی ماما کو تیزی سے نیچے گرا رہا تھا اور وہ پھر کر اوپر اٹھنا چاہتی تھی۔ ایک مبہم و غیر متعین لیکن یقینی اور تیکھا جذبۂ انتقام اکثر بوڑھی ما پر طاری رہتا تھا۔

شاید ابھی بھی بوڑھی ماما کا یہی جذبہ بھڑک اٹھا تھا۔ میں واقعی اس جذبہ کی کارفرمائی سے کانپ جاتا تھا کیونکہ اس کی زد بالواسطہ مجھ پر پڑتی تھی۔ بوڑھی ماما جہاں کہیں رہی اس نے وہاں کے ایک دو نوکروں کو ضرور بھاگ جانے پر مجبور کر دیا۔ بڑھاپے میں بقا کی تمنا کے ساتھ بنیادی اسباب بقا کی حرص بھی بڑھ جاتی ہے۔ بوڑھی ماما کو باورچیخانہ سے خاص دلچسپی تھی۔ اس کے خیال میں باورچیخانہ ہی ایسی جگہ تھی جہاں سے زندگی بٹتی ہے وہ اس سرچشمۂ حیات پر قابض و دخیل ہونا چاہتی تھی۔ لہذا باورچی یا باورچن ہی اس کے حملوں کا پہلا نشانہ ہوتی تھی۔ بوڑھی ماما کی یلغار کے سبب کئی بار باورچیخانہ کا ٹاٹ الٹ چکا تھا اور کھانے پینے کا انتظام درہم برہم۔ اس کی تکلیف تو رہی ایک طرف۔ ہوم گورنمنٹ کی گھڑکیاں بھی مجھ پر ہی۔

ماما دھیا مسلسل اپنی تیز زبان سے گولہ باری کر رہی تھی اور نچلی منزل سے شبر بیٹا طیارہ شکن توپ کی طرح مدافعت میں باڑھ پر باڑھ چلا رہا تھا۔ میں نے جھلا کر لکھنے پڑھنے کو تہہ کر کے رکھا ایک طرف۔ اور اب باضابطہ صلح کرنے والے کی شان سے اٹھا۔ مگر ناکامیاب رہا یہ تو ہوم گورنمنٹ کو مجھ پر رحم آگیا کہ ایک ڈانٹ ڈپٹ کی گھٹا کی گرج کی طرح سنائی دی اور پھر گھر کا مطلع صاف تھا۔ ماما دھیا کھنکناتی ہوئی چلی گئی۔ شبر بیٹا بڑبڑاتا ہوا باورچی خانہ کے اندر داخل ہو گیا اور میں اپنی میز پر واپس آگیا۔

میں نے لکھنا پھر جاری ہی کیا تھا کہ ماما دھیا دوبارہ وارد ہوئی۔ میں بے چین ہو گیا جی چاہ رہا تھا کہ گھر سے نکل جاؤں میں نے سہمتے ہوئے بوڑھی ماما کی طرف دیکھا۔ اسکے اندر سے ابھی امن پسندی ٹپک رہی تھی۔ اس نے رازدارانہ گفتگو کی ابتدا کی۔

"بابو! ہم تو اصل بات کہے لا بھول گئے۔ سنو نے! آج ہم اپنا پیچ سب سکھا وے چاہے ہیں۔ یہی پیپا کا لٹ کھٹے اگر ڈم ہگڈم آوے گا؟"

"تو سکھاؤ نا!" میں نے بات کو جلد ختم کرنا چاہا۔

"ہاں بابو تم ہیں یاں نہ ہو؟ یہی چھت پہ تو رے نخبر کے سامنے پیچ سب سکھے گا۔ تم کہیں جیہو نانے؟ آج اتوار ہے۔ یہی کھانہ ہم آئے رہیں تو اتنا سا بات نکل آیا۔"

"ہاں ہم یہیں پر ہیں لے آؤ اپنی چیزیں۔"

بابو جرا ٹھیک سے دیکھتے رہیو۔ بلمتا مونڈی کا ٹا یا لڑکن کوئی ہمری پیچ سب نا

چھو چھا کریں۔ تم ڈانٹیو!"

"ہاں ہاں ضرور"!

ماما دھیا چلی گئی اور تھوڑی دیر میں اپنا پیپا اٹھا لائی۔ مجھے دکھاتی ہوئی کمرے سے ہو کر کھلی چھت پر جا نکلی اور پیپے میں سے اپنی چیزیں نکال نکال کر پھیلانے لگی۔ وہ بہت دیر تک شاید اسی کام میں منہمک رہی ہیں بھی لکھنے میں مشغول ہو گیا۔ کوٹھے سے نیچے اترتے ہوئے وہ پھر میرے پاس آئی اور سرگوشی میں کہنے لگی۔

"بابو! اپنا سب چیچ پسار دیا۔ ہوسیاری سے دیکھتے رہیو۔ بڑا دھوپ ہے نہ تو . . ."

"جا اطمینان سے بیٹھ نانی۔ نیچے جا کے بیٹھ!"

میں ڈر رہا تھا کہ کہیں وہ اپنی چیزوں کی حفاظت و نگہبانی کے سلسلے میں میرے کمرے ہی میں نہ بیٹھ جائے۔ دھیا نانی نیچے جانے لگی۔ جاتے جاتے پھر لوٹ آئی۔ اور بولی۔

"سنو ہو؟ بٹوا اٹوا بھی ہے۔ اور اس میں کھاک بلائے۔ لڑکا سب اس کو چھینٹ چھانٹ نا کرے۔ چھت پر کوئی کو مت آدے دیہو!"

"ہاں ضرور! کوئی نہیں آئے گا"۔

وہ چلی گئی میں نے ٹھنڈی سانس لی اور ذرا یکسوئی سے لکھنے لگا۔ زینے پر سے آواز آئی۔

"تو رے آس پر بابو۔ ہم نہا کے پھر آدیں ہیں"۔

"ارے بھائی جا! کچھ نہیں ہو گا"۔ میں نے اپنے اطمینان کی خاطر ماما دھیا کو تسکین دی۔

جب لکھتے لکھتے میں تھک گیا تو یوں ہی ذرا چھت پر جا نکلا۔ ماما دھیا کی چیزوں کے

پاس سے گذرا تو ایک عام تجسّس کے جذبہ کے ماتحت اُن کا جائزہ لینے لگا ــــــ کہ اسن تیل کا ایک پیپا جسے قلابہ لگا کر چھوٹے سے بکس کی شکل دے دی گئی تھی۔ ایک طرف پڑا سوکھ رہا تھا پاس ہی دو تین جوڑ پرانی چپلیاں رکھی ہوئی تھیں۔ مگر ان کا جوڑ ویسا نہیں تھا جیسا کارخانہ سے نکلتے وقت لگا تھا بلکہ بوڑھی ماما نے اُن کا جوڑ خود لگایا تھا۔ ہر چپلی اپنی طور پہ دوسرے سے بالکل مختلف تھی، کیا بہ اعتبارِ شکل و صورت وقد و قامت، کیا بہ لحاظِ عمر یا بہ نسبتِ مولد و مسکن۔ بالکل ایسا جوڑ جیسے ہندوستان میں بعض شادیاں ہوتی ہیں۔ ساٹھ اور سولہ کا فرق۔ ان بھانت بھانت چپلیوں کے پہلو میں پرانی قینچیاں ٹوٹے ہوئے زنگ آلودہ چاقو۔ ایک ٹین کے ڈبہ میں طرح طرح کے بٹن، مضمحل و فرسودہ سوئیاں، الائچیاں، لونگ ڈلیاں، قسم قسم کی کانٹیاں وغیرہ وغیرہ۔ پرانے کپڑے کے ایک بڑے ٹکڑے پر بہت سے کپڑوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے رنگ برنگ کے کپڑوں کے کترن اور لال نالے سے لپٹی ہوئی تھیلیاں اور بڑے چھوٹے بٹوے۔ انکے علاوہ دو تین ساریاں، کرتے، ایک دوہرا ایک پرانی اونی سوئٹر اور ایک چھوٹی گٹھری نما سی چیز۔

میں نے سب چیزوں کو چھوڑ کر اس گٹھری کو کھولنا شروع کیا۔ کئی گرہوں پر ناخن آزمائی کرنے کے بعد کامیابی نصیب ہوئی اور اندر سے ہنٹلی پامرس کے بسکٹ کا ایک بوڑھا سا ڈبہ نکلا۔ میں اس ڈبہ کو پہچانتا تھا۔ میرا جذبۂ تجسّس اور بڑھا کچھ بھولی بسری یاد آنے لگی۔ میرے لڑکپن میں دھیا نانی اکثر مجھے اس ڈبے کی سیر کراتی تھی۔ میرے دماغ میں دھندلے دھندلے خیالات تیر گئے۔ بوڑھی کھلائی مجھے اپنی کوٹھری میں لے جاتی تھی۔ اس کی گود میں میرے بھائی بہنوں میں سے کوئی ہوتا تھا۔ بڑی اہمیت اور کسی تقریب کی شان سے ڈبے کو کھولا جاتا تھا اور اس کے اندر

کی چیزیں مجھے تفصیل کے ساتھ دکھلائی جاتی تھیں۔ نہ جانے کیوں ڈبہ کو دیکھتے ہی میرے دل میں گزری ہوئی دلچسپی پھر پیدا ہونے لگی۔ یہ ڈبہ میرے لڑکپن کا اثاثہ تھا۔ یہ سیاہ شدہ ٹین کا ڈبہ جن میں چھوٹے چھوٹے قلابے لگے ہوئے تھے۔ اس میں ایک معمولی سا تالا لگا ہوا تھا۔ میں اسے کھولکر ماضی کی دلکش یاد کو تازہ کرنا چاہتا تھا۔ مگر کنجی ندارد۔ مایوس ہو کر میں نے بٹوؤں کا جائزہ لینا شروع کیا۔ ایک مبہم سی امید بھی ناامیدی کے ساتھ دست و گریباں تھی۔ کئی بٹوؤں کی دیکھ بھال کے بعد ایک بٹوے کے اندر مجھے ایک چھوٹا سا بٹوا ملا۔ اُسے ٹٹول کر دیکھا تو اس میں ایک کنجی تھی۔ بٹوے کو کھولا تو اور کئی چیزوں اور چند آنے پیسوں کے ساتھ ایک ننھی سی کنجی نکلی۔ یہ کنجی ڈبے کے تالے میں ٹھیک آئی۔ ڈبے کے کھل جانے سے مجھے بڑی مسرت ہوئی۔ اس میں وہی سب آشنا چیزیں تھیں جنکی لڑکپن میں میری نگاہ میں بڑی قدر و منزلت تھی۔ اس وقت بھی میں ان معمولی سی چیزوں سے دلچسپی لیتے ہوئے در اصل اپنی زندگی کے ایک حصہ سے دلچسپی لے رہا تھا۔

ڈبے میں ایک چاندی کی ہنسلی تھی۔ چند چاندی کی بالیاں جن کے پھولوں میں میل جما ہوا تھا۔ ایک کانچ کا پھول دان، ایک تعویذ، چند خاکِ شفا کی ٹکیاں اور ایک بڑا سا بٹوا۔ میں نے بٹوے کو کھولا تو اس کے اندر سے کاٹھ کی ایک بہت ہی پرانی میلی سی کنگھی نکلی اور ایک چھوٹا سا بٹوا۔ اس دوسرے بٹوے کے اندر سے ایک تیسرا بٹوا نکلا۔ اور اس میں سے کانچ کی ایک لانبی سی شیشی اور ایک سرمہ کی جست والی سلائی۔ اس شیشی کے اوپر کچھ پھول سا بنا ہوا تھا۔ جیسے عطر کی شیشیوں پر بنا ہوا ہوتا ہے۔ شاید یہ اگلے وقتوں میں عطر کی شیشی ہی رہی ہو مگر ایک زمانہ دراز تک اس سے سرمہ دانی کا مصرف لیا جاتا رہا تھا۔ میں نے اسے اپنے بچپن سے یہی فرض انجام دیتے ہوئے دیکھا تھا اور

اب ایک عرصہ سے غالباً اس میں سُرمے کے صرف مٹے مٹے آثار ہی رہ گئے تھے۔ شیشی کی دیوار پر کچھ سیاہی سی تھی اور سیاہی کو چیرتی ہوئی بہت سی سفید لکیریں گذر گئی تھیں۔ یہ لکیریں سُرمہ کی سلائی نے سالہا سال میں مختلف زاویوں سے بنائی تھیں۔ لہٰذا یہ ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی نکلی تھیں، ماما دھیا ہمیشہ نہا دھو کر اپنے ڈبے کو کھولتی تھی اور اس کے اندر کے بٹوے سے یہ پُرانی بڑے اہتمام سے نکالی جاتی تھی جس کی سلائی نے شیشی میں غوطہ لگایا۔ وہ اُس کی دیوار سے ٹکرائی کھٹ کھٹ کی آواز اور ایک دو خراشیں پیدا کرتی ہوئی باہر آگئی اور ماما دھیا کی آنکھوں میں پھر گئی یقیناً۔ اب بھی بوڑھی ماما اسی اہتمام کے ساتھ سُرمہ لگاتی ہوگی اور اپنے خیال میں آنکھوں کی بینائی میں ترقی ہوتی ہوئی محسوس کرتی ہوگی۔ شیشی کی دیوار سے چمٹے ہوئے سُرمہ کے موہوم سے غبار میں ایک دو خراشوں کا اور اضافہ ہو جاتا ہوگا۔ مگر میں اس اہم تقریب کو اب دیکھتا نہ تھا۔ بوڑھی کھلائی کی زندگی کا راستہ میری راہِ حیات سے بہت جدا ہو چکا تھا۔ میں نے ساری چیزوں کو ایک درد آمیز احترام کے ساتھ قرینہ سے رکھ دیا اور جیسے کوئی کسی تبرک کو حفاظت سے رکھتا ہو یا مندر کا پٹ بند کرتا ہو میں نے ڈبہ کو بند کر دیا اور سلیقہ سے گٹھری بھی باندھ دی۔ ایک خاص طرح کے پھیلاؤ اور دل کی رقت کے ساتھ میں اپنے کمرے میں واپس آیا۔ واپس آتے ہوئے میں نے ایک سایہ کو سیڑھی پر غائب ہوتے ہوئے دیکھا۔ کوئی دبے پاؤں زینے سے نیچے اتر گیا تھا۔

میں اپنے کمرے میں واپس آکر کام کی تکمیل میں پھر مشغول ہو گیا۔ تھوڑی ہی دیر ہوئی ہوگی کہ میں نے ماما دھیا کی بیتابانہ چیخ سنی۔

"ہائے ہائے! سب پھینک پھاگ دیں۔ ہیجا ہو سلتا کو! لپک گئیں مرے!.... دیکھو بابو!

"دیکھو!..." میں بھی گھبرا کر اٹھا جھٹ پر سلمتا بوڑھی ماما کی بیش قیمت چیزوں کو اُلٹ پلٹ رہا تھا۔ مجھے آتا دیکھ کر سلمتا جلدی جلدی چیزوں کو درست کرنے لگا۔ دھیا نانی اُس کے سر پہ بوڑھی چیل کی طرح جھپٹ کر پہنچ چکی تھی اور مسلسل نو بہ نو گالیاں، صلواتیں، مفرد و مرکب بدعائیں سلمتا کی گذشتہ، آئندہ اور حال کی نسل و خاندان پر عذاب کی طرح نازل کر رہی تھی۔

میں دھیا نانی کی چیزوں کے پاس جا پہونچا۔ سلمتا بالکل گھبرایا ہوا تھا۔ کاٹو تو لہو نہیں بوڑھی ماما کا وہ تاریخی ڈبہ کھلا ہوا تھا۔ سلمتا شرمندگی، خوف اور شرارت میں ناکامیابی کے ملے جلے احساس کے بوجھ سے دبا جا رہا تھا۔ سرمے کی شیشی کو تھرتھراتے ہوئے وہ ڈبے میں رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس نے کنکھیوں سے مجھے دیکھا۔ سرمے کی شیشی اُس کے ہاتھ سے گر کر چھن سے ٹوٹ گئی۔

"ہائے اجاڑ!" دھیا نانی نے ایک دل دوز صدا بلند کی اور سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ اس پر بالکل سکتہ طاری تھا۔ اس کے لب اچانک سِل گئے۔ آواز گھٹ کر رہ گئی۔ نہ کوئی واویلا تھا۔ نہ بدعائیں اور گالیاں تھیں نہ حرفِ شکایت۔ سلمتا کے خلاف اس کا غضب سرد پڑ گیا۔ ایک طرف مجرم سر جھکائے بیٹھا ہوا تھا اور ایک جانب مدعی مہر بہ لب، ساکت و صامت، بے حس و حرکت۔

مجھے سخت حیرت ہوئی کہ دھیا نانی کے یوں یک بیک بُت بن جانے کا کیا سبب ہے میرے بہت سوال کرنے پر ماما دھیا بولی۔

"اب کا بابو! ہر تیا کے باوا ای سیسی دین تھا"

دل کے انتہائی رنج و اندوہ اور روح کے گہرے درد و کرب کے ساتھ یہ جملہ ادا ہوا تھا

میں اس منظر سے بہت متاثر ہوا اور بوڑھی دھیا نانی کی تالیف قلب کی بہتیری کوششیں میں نے کیں۔ میں نے ایک اچھی سی سرمہ کی شیشی لا دینے کا وعدہ کیا اور اچھا سا سُرمہ بھی بیلمتا کو میں نے بے حد ڈانٹا، مارا، اُس کے اٹھک بیٹھک کرائی کان امیٹھا اور آدھ گھنٹے تک اُسے مُرغ بننے کی فوری سزا دی۔ مگر ان باتوں کا بوڑھی نانی پر کوئی اثر نہ ہوا۔ بہت دیر کے بعد وہ اُٹھی کانچ کے ٹکڑوں کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر جمع کرنے لگی اور انہیں بڑی احتیاط سے بٹوے میں رکھا۔ اُس نے چاندی کے زیوروں کو بھی نظرانداز کر دیا جب اُس نے بٹوے کو ڈبے میں رکھ لیا تو یونہی بے دلی سے زیوروں کو اٹھا کر ڈبے میں ڈال دیا۔ یہ زیور اس کی اپنی کمائی کے بنائے ہوئے تھے۔ پھر اور سب چیزیں پیپے میں رکھی گئیں۔ ماما دھیا پیپے کو اس طرح اٹھا کر لے چلی جیسے کوئی جنازہ لئے جاتا ہو۔

اِس سانحہ کے بعد بوڑھی ماما بالکل بے آزار اور قطعی گوشہ نشیں ہو گئی

چند مہینوں کے بعد ہم لوگوں نے بھی اِس کے جنازے کو اِسی طرح کندھا دیا جیسے وہ سرمے کی ٹوٹی ہوئی شیشی کے امانت دار پیپے کو چھت پر سے اٹھا کر لے گئی تھی۔

کام

"سب سے بڑا افسانہ نویس خدا ہے"۔ اکثر یہ خیال میرے دماغ میں اس وقت پیدا ہوتا ہے جب میں ہنگامۂ ہست و بود کی طرف نظریں اٹھا کر دیکھتا ہوں۔ زندگی نام ہے ایک افسانۂ مسلسل کا، واقعات و سانحات اپنی اپنی جگہ پر "مختصر افسانے" ہیں، یہ انسانی آبادیاں بدبخت کردار کے محیر العقول کارنامے ہیں اور یہ لالہ و گل، برق و طوفان، صبح و شام، شبِ تیرہ و روزِ روشن ماحول و فضائے بعید کے رنگ برنگ سامان۔

تبسم، ایک دلدوز انوکھا سا تبسم، پُردرد، ملتجی، مایوس، مسترحم، آج بھی میرے افقِ تصور

میں اسی طرح برق بساماں ہے جس طرح جیٹھ کی ایک گرم شام کو سرِ راہ ہوا تھا۔ ایک ایسا تبسم جس میں لب و دنداں کے علاوہ چشم و نگاہ بھی برابر کے شریک تھے۔

وہ ایک مزدور تھا، عمر رسیدہ مزدور۔ اس کے خزاں رسیدہ اعضا سے بھی اس کی بہارِ صحت کا پتہ چلتا تھا۔ عضلات گرچہ ڈھیلے تھے پر اب بھی اُن میں مچھلیاں بنی ہوئی تھیں مضبوط شانے جن پر گٹھوں کے نشانات تھے۔ استوار گردن جس میں ڈور کی طرح موٹی موٹی رگیں ابھری ہوئی تھیں شکن آلودہ پیشانی، بھدی بھدی، ہتھیلیاں اور تلوے گذشتہ سخت محنت و مشقت کا افسانہ دہرا رہی تھیں، مگر اس کے سراپا پر ایک غم انگیز اضمحلال طاری تھا، وہ ماضی کے آباد شہروں کے کھنڈر کی طرح معلوم ہوتا تھا۔ اس کے گرد ڈور لپٹی ہوئی تھی۔ ایک ہاتھ میں ڈور کا ایک میلا، گرہ پر گرہ پڑا ہوا، ربو دسا لچھا تھا اور دوسرے ہاتھ سے وہ ایک موٹا سا لٹھ کاندھے پر اٹھائے ہوئے تھا۔ اس کا سارا جسم عریاں تھا، صرف کمر میں ایک میلی سی پھٹی ہوئی لنگوٹی تھی۔

جلیٹھ کی تپتی ہوئی سہ پہر لو کی شعلہ فشانیوں سے نجات حاصل کر کے شام میں تبدیل ہو رہی تھی، پر اب بھی ہوا کی گرم گرم لپٹیں آ رہی تھیں، زمین تپ رہی تھی۔ اور ہنوز دھوپ پر نظریں جمتی تھیں میں قصبے سے باہر آم کے باغ کے کنارے بیٹھا ہوا تھا۔ وہ آیا۔ ڈرتا ہوا سہما ہوا وہ میری طرف بڑھ رہا تھا۔ آہستہ آہستہ تاڑتا ہوا۔ بیچارگی و محتاجی کی ایک چلتی پھرتی مورت افسردگی و مایوسی کی زندہ تصویر۔ . . . . . وہ میرے نزدیک آ گیا۔ آتے ہی خمیدہ ہو کر اُس نے مجھے سلام کیا۔ اور وہی اندوہناک تبسم۔ اُس کی متبسم آنکھوں سے اُس کی مجروح روح،

اس کا پُر داغ دل جھلک رہا تھا۔ اُس کے ظاہری تبسّم کا منبع ایک المناک رُوحانی ابتسام تھا۔ آج تک میں نے کسی کے دل کو اتنا آشکارا نہ دیکھا تھا، کسی کی رُوح کو اتنے فاش طور پر عریاں نہ پایا تھا۔ وہ اس وقت "آرزوئے متشکّل" تھا۔ "جذباتِ مجسّم" "امید و بیم" کی ایک مرئی تعبیر۔ وہ سراپا اظہار تھا۔ وہ سر بسر اپنے دلِ ریش کی تفسیرِ محسوس تھا۔ وہ اکھڑی ہوئی آواز میں بولا "حضور.... کام.....؟" اس کے لہجے میں ایک مایوسی تھی پر اس کے اندر کام کے تلاش کی انتہائی خواہش اور کوئی کام مل جانے کی شدید تمنا پوشیدہ تھی۔ رلبودگی و ماندگی اس کے بشرے سے ظاہر ہو رہی تھی.... وہ پھر بولا "سرکار! بہت تکلیف ہے...... کوئی کام.... بہت تکلیف ہے ـــــ مالک...... دو تین بچے ہے حضو..... کوئی کام..... مل جاتا..... ہے.... سرکار..... کوئی کام؟" اس کی آواز میں ایک ارتعاش تھا "آئیں..... سرکار.... ہے کوئی کا.... کام"؟ اس کے بے پناہ تبسّم سے بھی یہی آواز نکل رہی تھی اور زیادہ بہت زیادہ مؤثر انداز سے ـــــ وہ تھکا ہوا تھا، پاؤں ٹخنوں تک گرد سے اٹے ہوئے پریشان سر کے بال بے ترتیب گچھوں کی صورت میں پسینے اور گرد میں چپکے ہوئے اور چہرہ اداس پژمردہ و مضمحل تھا۔ اس شدید گرمی کے موسم میں وہ دن بھر کام تلاش کرتا رہا تھا اور ناکام۔ وہ ہمہ تن التجا تھا اور میں خاموش..... وہ مضطرب ہو کر پھر بولا "حضور! کوئی کام..... ہے؟" اس کے اندازِ تکلّم میں مایوسی کا پہلو نمایاں تر ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے دریافت کیا "تم کیا کرتے ہو؟" اس نے بیتابی سے جواب دیا "سرکار جو کام کا حکم ہو۔ کام ملجاتا تو پیٹ پالنے کا سہارا ہو جاتا.... بچے سب بھوکا ہے۔ کوئی کام نہیں ملتا۔ ایک مہینہ ہوا ہر جگہ کھوج لگایا.... آپکے پاس

ہے کوئی کام ؟" وہ سراپا استفہام تھا۔ اس کی تمام کائنات، امید صرف اسی سوال کے اثباتی جواب پر منحصر تھی۔ وہ بے چینی سے میرے قریب تر آگیا اور پھر وہی درد آگیں ، درد خیز تبسم! ــــ میں اس قصبے میں محض تبدیل آب و ہوا کے لئے آیا تھا۔ اس غریب مزدور کیلئے میرے پاس کوئی کام نہ تھا میں نے کہا " بھائی میرے پاس کوئی کام نہیں " جیسے کسی ملزم کو فیصلے کے تکلیف دہ انتظار کے بعد پھانسی کا حکم سنایا جائے، جیسے کسی پر بجلی گری ہو، غریب، بیکار، تھکا ہوا، کمزور، بھوکا، بوڑھا مزدور کمر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ سر بزانو، خاموش، بے آس، وہ حسب معمول تمام قصبے کی خاک چھان چکا تھا۔ ہر جگہ اس کی آس ٹوٹی تھی۔ پر آہ یہ امید ــــ سینکڑوں آرزوؤں کی مزار پر پیدا ہونے والا لالۂ پر داغ، مزاروں ناکامیوں کے افقِ تیرہ پر چمکنے والا ننھا ستارہ ــــ اس کے دل میں ایک آخری بار پھر پیدا ہوئی اور وہ قصبے کے باہر نکل آیا۔ تمام گرد و پیش کی رہ گردی کے بعد وہ اس باغ کی طرف امیدوار آیا تھا۔ اور یہاں قسمت نے اُسے پھر ایک بار چرکا دیا ــــ غریب، گرسنہ، ناامید مزدور!! دل تو میرا بھی دُکھ رہا تھا۔ پر اس وقت میں مسافر اُسے کیا کام دیتا! میں نے ہمدردانہ انداز میں اس سے پوچھا " کیوں جی! گاؤں بھر میں نہیں کوئی کام نہ ملا۔ یہ تو بڑا سا گاؤں ہے ؟"

مزدور نے سر اٹھایا اور بولا " بابو جی! میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ کوئی مجھے کام نہیں دیتا۔ دو مہینے سے بیکار ہوں، پہلے لالہ جی کے یہاں باغ کا مالی تھا۔ زمانے تک ان کی خدمت کرتا رہا۔ اب سنا ہے، باغ کا کام، وہ کہتے ہیں مجھ سے نہیں نپٹتا۔ سرکار! میں تو جہاں تک ہوتا تھا، دن بھر کام پر لگا رہتا تھا۔ لالہ جی کہتے ہیں کہ ان کا خرچ بڑھ گیا ہے۔ دو تین مالی اور رکھنا پڑا ان کو . . . . . . ایک دن مجھے انہوں نے کام سے ہٹا دیا۔ اور اُس دن سے مجبور بیکار ہوں بسب کہتے ہیں

بوڑھے سے کیا کام ہوگا۔ کوئی مجھے کام نہیں دیتا۔۔۔“ یک بیک جیسے بجھتی ہوئی شمع بھڑک اُٹھے، جیسے سوکھی ہوئی پہاڑی ندی میں طوفان آجائے، بوڑھا کمزور مزدور کھڑا ہوگیا۔ اپنی لٹھ اُس نے زور سے پکڑلی اور ایک معصوم وقار کے ساتھ گویا ہوا۔ ”حجور میں سب کام کرسکتا ہوں، دن دن بھر دھوپ میں کھرپی چلا سکتا ہوں۔۔۔ دوپہر کو کیاری میں پانی ٹپا سکتا ہوں ۔۔۔ اور اب حجور جو کام بھی ملے کرسکتا ہوں۔ یہ ہے میری بہنگی دو من بوجھا اوٹھا نونگا سرکار ۔۔۔ لوگ کاہے کہتے ہیں کہ میں کام نہیں کرسکتا۔ ابھی جرا جلدی نہ ہوگی۔ پھُرتی نوجوانی کے ساتھ گئی۔۔۔۔ مزدور نے ایک آہِ سرد کھینچی۔۔۔ ”اس سے کیا سرکار؟ کام تو جرور کرلوں گا۔ ۔۔۔۔ مزدور کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور طرفہ یہ کہ وہ پھر مسکرا رہا تھا۔۔۔ وہی قاتل تبسم! الجاجت آمیز، مایوس، پژمردہ، درد آگیں! میرا دل پگھلا جا رہا تھا۔۔۔ میں نے جیب سے نکال کر ایک اکنی اس کی طرف بڑھائی۔۔۔ بوڑھے بھوکے مزدور نے اسے آرزومند مگر بے حرص نظروں سے دیکھا اور بولا۔ ”سرکار کوئی کام نہیں ہے؟ حجور مجھے کہیں کوئی کام دلوا دیجئے۔۔۔ مالک۔۔۔ کام!“ میں نے کہا ”بھائی میں مسافر ہوں۔ میرے پاس کوئی کام نہیں۔ اسے لے لو ۔۔۔“ مزدور خاموش بیٹھا رہا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اس کے دل کی ہر دھڑکن کے ساتھ لفظ ”کام“ نکل رہا ہے، اس کی روح اس سوال کو غیر مسموع طور پر دہرا رہی تھی۔۔۔ آہ ایک بیکار مزدور! میں نے بعد اصرار پیسے دیئے۔۔۔ اُس نے لے لئے مگر خوشی، ندامت اور حسرت سے ملی ہوئی ایک کیفیت کے ساتھ، آخر تو یہ خیرات تھی۔ مزدور کی قوتِ بازو کا وقار اسے کب گوارا کرتا پر وہ اور اُس کے بے کس بچے بھوکے تھے۔۔۔ اور اُسے کام نہ ملتا تھا۔۔۔ وہ اٹھا اور ایک

اندازِ منت پذیری کے ساتھ رخصت ہونے لگا . . . اُس نے سلام کیا اُسی مجروح، رقت انگیز، حسرت ناک، پُر اثر تبسم کے ساتھ اور چلا گیا ناکام !

اِس واقعہ کے بعد میں اُس بوڑھے مفلوک الحال مزدور سے اکثر ملا۔ دنیا نے اُسے چھوڑ دیا مگر تبسم، پُر اسرار تبسم نے اس کا ساتھ نہ چھوڑا تھا۔ کبھی وہ کاندھے پر کدال لیے نظر آتا، کبھی کوئی ربوڈ ٹوکری، اور کبھی ٹوٹی پھوٹی ڈور۔ وہ جب ملتا یہی کہتا سنائی دیتا۔ "سرکار کوئی کام؟" وہی المناک تبسم، وہی لجاجت، وہی سوال، وہی ربودگی، وہی تباہی کی حد تک خاکساری، مگر ہاں زمانہ اُس بیکار مزدور میں ایک نمایاں تبدیلی پیدا کر رہا تھا۔ اُس کی اُمیدیں مردہ ہو چکی تھیں اور اُس کا خوف بھی مر چکا تھا۔ وہ محض اضطرار اور عادت کے طور اپنا سوال دہراتا جاتا۔ . . . "کام؟" "کام . . . ؟" اُسے اس کی کوئی فکر نہ باقی رہی تھی کہ اس کا سوال مردود ہوگا یا مقبول وہ اب اپنے بیم و رجا کا ایک چلتا پھرتا مزار تھا اور بس۔ اب اس کا تبسم ایک بے معنی التجا کا مظہر تھا، زار و نزار، شکستہ، موت کی حد تک مجروح، دل کی گذشتہ حسرتوں، مرحوم ارمانوں، ناکام آرزوؤں پر ایک "طنز ناکام"!! وہ اپنی بربادی کا ایک اشتہار تھا، دنیا کی بے دردی کا ایک اعلان، مزدور بوڑھا، گرسنہ، بیکار مزدور روز بروز بھیانک حد تک دبلا ہوتا جا رہا تھا۔ گردن پر جھریاں پڑ گئی تھیں پسلیوں کی ہڈیاں کسی مکروہ بھوت کی انگلیاں معلوم ہوتی تھیں، جو اپنے شکنجے میں کسی بدقسمت شکار کو دبائے ہوتے ہوں۔ اُس کا پیٹ دن بدن دھنستا جا رہا تھا، کسی دھنسی ہوئی قبر کی طرح، سر جنید لا ہوا جاتا تھا اور بے رونق کسی پنجر کی کھوپری کی مانند۔ آنکھیں حلقے میں تھیں اور تبسم کے وقت لب و دنداں اس انداز سے

کھلے تھے، جیسے ممی کی ہوئی لاش۔ کے لب و دنداں کھلے ہوئے ہوں۔ بدقسمت مزدور کی حالت جتنی زیادہ زبوں، پُراثر اور عبرتناک ہوتی جاتی تھی۔ دنیا اُس سے اسی انداز سے روگرداں ہو رہی تھی۔

سب سے زیادہ المناک تبدیلی جو گرسنگی، بیکاری و محتاجی کے ہاتھوں زمانے نے اُس بوڑھے مزدور کی حالت میں کی تھی۔ وہ وقار کا فقدان تھا۔ پہلے وہ خیرات لینے میں ہچکچاتا تھا اور اُسے مجبوراً قبول کرتے وقت اُس کا دل مجروح ہوتا تھا اور اب وہ ہر داد و دہش پر بھوکے کتّے کی طرح ٹوٹتا تھا۔ اور خیرات لینے کے وقت اُس کے انداز میں ضرورتمندانہ پہلو سے زیادہ حریصانہ عنوان پایا جاتا تھا ——— یہ مزدور کی روح کے پُرالم انجام کی تکمیل تھی!!

اب بھی وہ "کا . . . . . . م ! . . . . . کا . . . . . . م" رٹتا جاتا تھا مگر زیرلب، بے ربط، نحیف، بے اثر لہجے میں جیسے کسی دوسرے عالم سے کوئی بھولی بھٹکی روح اہلِ دنیا کو ایک مبہم سا پیغام پہنچانے کی سعیٔ لاحاصل کر رہی ہو اور اب اس کے مخصوص تبسّم سے ایک پسپا، مردہ، بے حس، بے روح انفعالیت ٹپکتی تھی ؎

بے بس

رحمو، ڈاکٹر واحد کے یہاں خدمتگار تھا۔ یوں تو فرصت کے اوقات میں وہ مانگ سٹیبکہ شہر کی مخصوص گلیوں میں چکر لگایا کرتا، اور ناکامیاب بھی نہیں رہتا۔ مگر غریب کا ایک ارمان پورا ہوتا نظر آتا تھا۔ رحمو کی دلی آرزو تھی کہ اس کی شادی کسی خوبصورت، نیک چال چلن والی لڑکی سے ہو جائے۔ مگر اس کے طبقے کی جو لڑکیاں خوبصورت تھیں، انہیں عام طور پر لوگ نیک چال چلن کی رہنے نہیں دیتے تھے اور جو اچھے ڈھنگ کی تھیں وہ بدشکل تھیں۔ رحموں کی عمر زیادہ ہوتی گئی اور اسی تناسب سے اس کا معیار کم ہوتا گیا۔ رفتہ رفتہ اُسے صرف شادی کی تمنا رہ گئی۔ وہ اب اتنا ہی چاہتا تھا کہ اُس کی کوئی بیوی ہو۔ اتفاقاً ایک "گنج باد آورد" قسم کی چھوکری سے رحموں کی شادی کر دی گئی۔ یہ زبردستی کی شادی تھی۔ رحمو کرمین سے نفرت کرتا تھا شاید وہ اسکی

جوانی کی عام بخششوں سے واقف تھا مگر جب دھیرے دھیرے اُسے یہ پتہ چل گیا کہ پسند کی لڑکی گویا نہیں ملتی، اور اس کا سن بھی نسبتاً زیادہ ہو گیا ہے تو وہ اپنی قسمت پر راضی ہو گیا۔ نہیں سے ہاں تو بھلا۔ کچھ زمانہ اسی طرح گذر گیا۔ عرصہ بعد یک بیک رحمو بے قرار سا نظر آنے لگا۔ شاید پرانی حسرتیں اس کے دل میں پھر کروٹیں لینے لگی تھیں۔ وہ اداس اداس رہتا اور کرمین سے روز روز لڑ پڑتا تھا۔ ہوتے ہوتے طلاق کی نوبت پہنچ گئی۔ اب رحمو پھر مفلس کا مفلس تھا۔

بیچارہ رحمو اب اِدھر اُدھر قسمت آزمائی کرتا چلتا تھا۔ اپنی برادری کی ہر معقول صورت کنواری لڑکی کی ماں سے نیازمندانہ ملتا اور خوشامدیں کرتا۔ مگر اس کے طبقہ کی لڑکیاں چونکہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی پوری صلاحیت رکھتی ہیں۔ اسی لیے ان کی ماؤں کو ان کی شادی کی کچھ ایسی فکر نہیں ہوتی۔ رحمو کے ارمان کیسے نکلیں۔ دن بیتتے گئے اور رحمو بن بیوی کا ہی رہا۔ اُسے بڑی فکر تھی۔ سن ہے کہ بڑھا جا رہا ہے۔ اور مشاہرہ بھی نہیں بڑھتا کہ کوئی روپیوں کی لالچ ہی میں آ کر اس سے شادی کر لے۔ رحمو کو ایک جیون ساتھی کی تلاش تھی، اس کا خیال تھا کہ بغیر بیوی کے زندگی ادھوری ہے۔ بلکہ زندگی ہی نہیں بلکہ بدقسمتی سے اس کی نظر ذرا اونچی تھی۔ شروع جوانی میں وہ شہر کی بیسواؤں سے اپنی پیاس بجھا چکا تھا۔ اسی لئے اُسے چمک دمک اور سندر روپ کی چاٹ سی لگ گئی تھی، بازاری عورتوں کے لاج شرم بیچنے سے بھی وہ اکتا گیا تھا۔ اسی دوہرے اثر کے ماتحت بیوی کے متعلق اس کا خیال یہ بن گیا کہ بیوی روپ رنگ کے ساتھ حیا و شرم بھی رکھے مگر اس رجحان سے بڑھ کر رحمو کی فطرت کا یہ پہلو تھا کہ وہ گھر گرہستی کی زندگی بسر کرنی چاہتا تھا۔ وہ یہ چاہتا تھا کہ اس کی ایک اپنی عورت ہو جو اُسے چاہے

اُس سے پریم کرے۔ زمانہ دیکھ کر رحمو کی پسند دبتی گئی، مگر اس کی فطرت کی اصلی پیاس بڑھتی گئی پھر بھی تجربہ کی راکھ کے اندر سے پسند کی دبی ہوئی چنگاری نکل ہی پڑتی تھی۔ شاید اسی جذبہ کے ماتحت رحمو نے کریمن کو طلاق دیدی تھی۔

جب روپ پیار اور عصمت پسندی کا جذبہ پھر دھیما پڑ گیا، تو رحمو کی تمنا کا بجلا دھارا زور دل سے بہ نکلا۔ اور وہ ایک بیوی کی چاہ میں گھلنے لگا۔ وقت کی بات ہوتی ہے، ڈاکٹر واجد کے یہاں اُن کی ایک رشتہ دار ملنے آئیں۔ اُن کے ساتھ ایک نوخیز خادمہ نوبہار تھی۔ سانولا کھلتا ہوا نمکین رنگ، لانبے لانبے بال، ترشا ہوا چہرہ، آنکھیں شربتی نکلتا ہوا قد، گداز جسم اور بیگانہ ادائیں۔ نوبہار بڑی ہنس مکھ تھی، مگر گھر یا محلہ کے کسی ملازم کو وہ آنکھ نہیں لگاتی تھی۔ وہ سب سے کھنچی کھنچی رہتی تھی۔ جوان خدمتگار بلکہ بہت سے منچلے سفید پوش بھی نوبہار کی تاک میں تھے۔ لیکن وہ کسی کے ہتے چڑھنے والی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ روپ رنگ جوانی اور اس پر ان کا انمول ہونا یہ سب باتیں رحموں کو یاد دلا کرنے کے لئے کافی سے زیادہ تھیں۔ رحمو نوبہار کی پوجا کرنے لگا۔ وہ سوچتا کہ اگر ایسی لڑکی اس کی بیوی بن جائے تو دنیا اُس کے لئے جنت ہے۔ حسن اتفاق دیکھئے کہ نوبہار کی بیوی نے خود رحمو کو اس کے لئے پسند کیا۔ رحمو کو جب یہ خبر ملی تو اس کا دل اس کے سینے سے نکلا پڑتا تھا۔ وہ خوشی سے دیوانہ ہوا جاتا تھا۔ آخر کار رحمو کی شادی نوبہار سے کر دی گئی۔ وہ دوستوں سے کہتا کہ تقدیر سے فقیر کو بھی موتی مل جاتا ہے جو راجہ کو نہیں ملتا۔ وہ نوبہار کے قابل نہ تھا۔ یہ اللہ کی دین ہے۔ غرض رحمو اپنے کو دنیا کا سب سے خوش نصیب شخص سمجھ رہا تھا۔

رحمو نے سارے سیر و تماشے بند کر دیئے۔ وہ پیسہ پیسہ جمع کر کے نوبہار کے لئے اچھے سے اچھا کپڑا خریدتا اور اس کے سنگار کا سامان لاتا۔ وہ اُس پجاری کی طرح تھا جو تن من دھن لٹا کر بھی یہ محسوس کرتا ہے کہ "حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا"۔ نوبہار بُت بنی ہوئی تھی۔ بلکہ خود دیوی۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس شادی کا اس پر کوئی خاص اثر نہیں، وہ اسے کوئی اہمیت نہیں دیتی تھی۔ وہ ابھی تک جوانی کی ایسی تھرکتی ہوئی موج تھی جو ساحل سے گلے لگ کر بھی آرزو بے پروا ہو۔ رحمو قبول صورت تھا مگر اُس کی اداؤں میں کوئی ایسی بات نہ تھی جو اُسے دلبری کا دیوتا بنا سکتی، شاید مرد میں تھوڑی سی بجلی اور آندھی بھی ہونی چاہیئے۔ رحمو تو صرف سبز گھاس کی طرح تھا جو کسی کے قدموں پر بچھی جاتی ہو۔

رحمو اُس مسافر کی طرح تھا جو منزل پر پہنچکر آسودہ ہو چکا تھا، مگر نوبہار کو شاید اپنی منزل ابھی تک نہیں ملی تھی۔ اس کی جوانی کی تمنائیں ابھی تک پیاسی تھیں۔ رحمو برسا ہوا بادل تھا اور نوبہار تڑپتی ہوئی بجلی۔ نوبہار کے شباب کی ندی چڑھی ہوئی تھی۔ رحمو اس کے کنارے گنگا کے پجاری کی حیثیت سے آیا، عقیدت کے پھول لیکر، وہ ایک شناور کی حیثیت سے نہ آیا جو گنگا کو محض بازی گاہ سمجھتا ہو اور اُس ملاح کی طرح بھی نہیں جو اسے مچھلی پکڑنے کا ایک ذخیرہ جانکر اُس کی قدر کرتا ہے۔ نوبہار اب جوانی کی لذتوں سے واقف ہو گئی تھی اور وہ ان نگاہوں کے پیام کو اچھی طرح سمجھنے لگی تھی، جو ہر طرف سے چاہنے والوں کی بے قراریاں لئے آتے تھے۔ مگر وہ ذرا اونچا مذاق رکھتی تھی۔ وہ سستی نہ تھی۔ وہ انمول رتن تھی۔ وہ بکنا پسند نہیں کرتی تھی۔ بلکہ وہ پسندیدہ مردوں کا شباب اور محبت خریدتی تھی اور اُس کی قیمت وہ اپنی کھلتی پھولتی جوانی

سے ادا کرتی تھی۔ رحمو نوبہار کی جوانی اور محبت صرف نکاح کے دو بول اور اپنے نیاز مندانہ تحفوں سے نہیں خرید سکا تھا۔ اس کی پریم بھگتی اور عاشقانہ فتادگی کے سبب بلکہ نکاح کی مجبوری کی وجہ سے نوبہار اسے اپنے شباب کی زکوٰۃ تو دیتی تھی اور کبھی کبھی میٹھی بولیوں کی بھیک بھی مگر رحمو نوبہار کی محبت کبھی نہ حاصل کر سکا۔

جب کوئی خواہش حد سے بڑھ جاتی ہے تو انسان اکثر فریبِ آرزو دکھانے لگتا ہے رحمو کی دلی تمنا تھی کہ اس کی ایک بیوی ہو اور وہ ایک دوسرے کو دل سے پیار کریں۔ وہ اپنے ہردے کے مندر میں ایک دیوی کو براجمان دیکھنے کی حسرت رکھتا تھا۔ یہ ارمان تو پورا ہو گیا۔ مگر دیوی صرف ایک مندر میں نہیں رہتی، پھر بھی رحمو کو یہ دھوکا تھا کہ نوبہار اُسے چاہتی ہے اور صرف اسی کی ہے۔ وہ اِس مغالطہ میں عرصہ تک مبتلا رہا۔ وہ نوبہار جیسی بیوی پا کر اتنا مگن تھا کہ سوائے اس احساس کے اور کوئی دوسری حس اس کے دل میں تھی ہی نہیں۔ وقت گذرتا گیا" اور نوبہار بہار بنکر بہت سی گودوں میں مچلی۔ مگر رحمو اُسے ایک ایسی بہار سمجھتا رہا۔ جو صرف اس کے چمن میں آئی ہو۔

کچھ سمے بیتنے کے بعد جب نوبہار کی شوخیاں حد سے تجاوز کر گئیں تو رحمو کی مالکن نے اس کی توجہ اس طرف پھیرنی چاہی، مگر رحمو پر وہ جادو چلا تھا کہ کیا کہئے۔ وہ ان الزامات کو محض مالکن کا ظلم سمجھتا۔ "اب دو گھڑی کے لئے کوئی ہنسے بولے بھی نہیں۔ دن رات کام میں جتا رہے میری نوبہار سے یہ لوگ جلتے ہیں۔ جلنے دو انھیں یہ ناحق کا بیر ہے۔" یہ تھے رحمو کے خیالات دوست احباب بھی رحمو سے نوبہار کی شکایت کرنے لگے۔ وہ سوچتا، ان جھوٹے یاروں سے میری قسمت دیکھی نہیں جاتی تو نوبہا نام رکھتے ہیں۔ یہ حسد کی آگ میں جھلسے جاتے ہیں۔

میری نوبہار ایک دولت ہے بیش قیمت دولت ہے۔ لوگ کہتے کہتے تھک گئے اور رحمو نوبہار پر سختی تو کیا کرتا۔ اُسے یقین ہی نہیں آتا تھا کہ اس کی بیوی کا چال چلن خراب بھی ہو سکتا ہے۔ نوبہار کو ایک بیٹی پیدا ہوئی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ یہ بچی اُس ڈرائیور کی ہے۔ جو اپنے صاحب کا بریجز پہنکر اکثر ڈاکٹر واجد کے یہاں آتا تھا۔ یہ ڈرائیور نہایت اچھا کباب لگاتا۔ اور صاف ستھرا رہتا تھا۔ کباب لگانے کے بہانے بارہا اُسے ڈاکٹر واجد کے دسترخوان پر کھانے اور رات کو انہیں کے گھر سونے کا موقع ملتا۔ یہ حضرت رنگیلے تھے' اور کارواں۔ نوبہار اور ڈرائیور کے تعلقات کوئی چھپا ہوا راز نہ تھا اور جو بچی پیدا ہوئی وہ بھی ڈرائیور سے حد درجہ ملتی جلتی تھی۔ مگر رحمو اس بچی کو اپنی تصویر سمجھتا رہا۔ اُس کی نظر میں بچی کی پیشانی اس کی اپنی پیشانی جیسی تھی۔ اُس کے لب کے خم بالکل اس کے لبوں کے خم جیسے تھے اُس کی آنکھیں، اس کے کان غرض سب کچھ اس کے انہیں اعضا سے ملتے جلتے تھے۔ باپ بننے کے بعد رحمو کے گھر گرہستی والا جذبہ اور تیز تر ہو گیا۔ اب وہ بیوی کی ضرورت پہلے سے زیادہ محسوس کرنے لگا۔ نوبہار اب اُس کی زندگی تھی۔

کچھ دنوں بعد نوبہار نے پھر وہ ہاتھ پاؤں نکالے کہ ڈاکٹر صاحب کی اہلیہ کو اُسے اپنے ایک عزیز کے یہاں دیہات بھیج دینا پڑا۔ ملازم پھر ملازم۔ حکم حاکم۔ رحمو صبر کا گھونٹ پی کر رہ گیا۔ جب بھی موقعہ ملتا غریب گاؤں جاکر اپنی بیوی بچے کو دیکھ آتا۔ برہ کے دن بڑی بیقراری سے کٹتے اور جب رحمو گاؤں سے واپس آنے لگتا تو اُس کی وفاشعار آنکھوں میں آنسوؤں کی ندی امڈ آتی۔ گاؤں میں نوبہار خوب کھل کھیلی۔ بڑے زمیندار کا گھر تھا۔ لالہ، چپراسی، پیادے

منشی سبھی تھے۔ یہاں بھی نو بہار اپنے کو لیے دیئے رہتی تھی، اور اس کا کھل کھیلنا یوں بار عام نہ تھا۔ نو بہار نے ہمیشہ اپنی نظر بلند رکھی، بہت سے لوگوں کو نوازنے کے بعد نو بہار اپنی عنایتیں ایک نوجوان منشی پر صرف کرنے لگی۔ منشی جی گورے رنگت کے خوبصورت جوان تھے۔ نو بہار کی وابستگی ان سے اتنی بڑھی کہ بچہ بچہ اس بات سے واقف ہو گیا۔ منشی جی کے والدین کو بھی خبر ہو گئی اور وہ لوگ بہت چراغ پا ہوتے۔ کیونکہ ذلیل لونڈی انکے شریف بیٹے پر چھائی جا رہی تھی۔ گھر میں شریف بیوی موجود۔ مگر منشی جی نو بہار ہی کا کلمہ پڑھتے تھے۔ ان ساری باتوں کی خبر رحمو کو شہر میں بھی ملی۔ مگر اس نے ان افواہوں کو محض بادِ ہوائی سمجھا۔ جب رحمو نو بہار سے ملنے گاؤں آیا تو اس کے کانوں میں ہر طرف سے یہی صدا آئی کہ اس کی بیوی منشی کریم کی داشتہ ہے۔ ایک ہی بات سنتے سنتے رحمو کا دل پک گیا اور وہ سب سے لڑنے بھڑنے لگا۔ ایک بار اس کی نشکور خدمتگار سے لڑائی ہو گئی۔ نشکور نے اس کو طعنہ دیا۔

"بے شرم کہیں کا۔ ہے نہ جورو اتیری باجاری رنڈی!"

"زبان سنبھال کر بول، نہیں تو گلا نکال دیں گے۔" رحمو نے جواب دیا۔ "آنکھ کا اندھا۔ اکل کا پورا۔ تیری جورو تو منشی کی رکھنی ہے۔ سب کے آگے تو آچکی ہے۔ تیرا باپ بھی پتہ ہے۔ بھڑوا کہیں کا۔ اور الٹا ہم کو آنکھ دکھاتا ہے۔" نشکور غصّہ سے بھر کر بولا۔

"سب جھوٹ بات ہے۔ دشمن کی لگائی۔ اب جو کوئی اس کا نام لیگا تو ہم سے برا کوئی نہیں!" رحمو نے کہا۔ مگر رحمو کے لہجہ میں شک کا ہلکا سا رنگ تھا۔ "ہوں دھتکار!" نشکور یہ کہتا ہوا دوسری طرف چلا گیا۔

رحمو ابھی بہت دنوں تک گاؤں میں رہا اور طرح طرح کی باتیں نوبہار کے بارے میں سنتا رہا۔ نوبہار کو خود رحمو کی سعادت مندی پر اتنا بھروسہ تھا کہ اس کی آنکھوں کے سامنے وہ منشی جی سے ہنس ہنس کر باتیں کرتی اور ان کو چھیڑتی۔ رحمو چاہتا کہ ان افواہوں پر یقین نہ کرے۔ لیکن وہ روز روز ایسی باتیں سنتا کہ برداشت نہ کی جا سکتیں۔ وہ بہت پریشان ہو گیا۔ وہ اس دوہدھے کا بوجھ اٹھا نہیں سکتا تھا کہ نوبہار اُس کے سوا دوسرے کی بھی ہے۔ وہ اپنے شبہات کو تھپک تھپک کر سلا دینا چاہتا تھا۔ اس دنیا میں ہم جان بوجھ کر فریب کھاتے ہیں کیونکہ حقیقت تلخ ہوتی ہے۔

کانوں سنی بات کو آدمی اَن سُنی بھی کر سکتا ہے، مگر آنکھوں دیکھی کو بھلا کیونکر ٹال جائے۔ وہ اکثر دیکھتا کہ اس کی بیوی منشی کریم سے گھُل مل کر مزے مزے کی باتیں کرتی ہے اور کبھی کبھی مختلف بہانوں سے راتوں کو غائب بھی ہو جاتی ہے۔ رحمو چاہتا تھا کہ یہ سب محض بُرا خواب ہو۔ وہ چاہتا تھا کہ آنکھیں بند کرے اور جب جاگے تو حقیقت صرف یہ ہو کہ نوبہار اُس کی وفادار بیوی ہے۔ وہ سخت کشمکش میں مبتلا تھا۔ لوگ اُسے غیرت دلاتے تھے۔ لیکن جب وہ نوبہار سے تنہائی میں باتیں کرتا تو اس کے سارے شبہات کافور ہو جاتے۔ اگر کبھی وہ دبے الفاظ میں نوبہار سے یہ کہتا کہ دنیا بُری ہے، تم ذرا سنبھل کر رہو ورنہ ناحق کی جگ ہنسائی ہوگی تو نوبہار اتنا تن کر جواب دیتی کہ رحمو بھیگی بلی بن جاتا۔ کچھ روز اور گاؤں میں رہ کر وہ شہر چلا گیا۔

شہر سے رحمو نوبہار کو برابر تحفے بھیجتا رہا۔ تیل، کنگھی، آئینہ، گلدار کپڑے، اچھی ریاں اور

نو بہار ان سے اپنا سنگار کر کے منشی جی کی آغوش کی زینت بنتی رہی۔ نو بہار پھر امید سے تھی۔ چند ہی مہینے بعد اُس کو ایک لڑکا پیدا ہوا۔ لڑکا پیدا ہونے کی خبر رحمو کو بھی ملی۔ بات صاف تھی حساب سے لڑکا رحمو کا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ بیچارہ رحمو بے حد غمگین رہنے لگا۔ اب وہ اپنے کو فریب بھی نہیں دے سکتا تھا۔ لوگوں نے اس کو مشورہ دیا کہ نو بہار کو چھوڑ دے لیکن یہ اس کے بس کی بات نہ تھی۔ پھر یہ صلاح ہوئی کہ نو بہار کو سیدھے راستے پہ لایا جائے۔ اس کی سزا ہو اور سخت سزا ہو۔ رحمو یہ ارادہ کر کے گاؤں چلا کہ اپنی بیوی کے ساتھ سختی کرے گا اور اُسے پارسا بنا کر رہے گا۔ گاؤں میں اُسے اور لوگوں نے بھی حالات بتائے اور اُسے غیرت دلائی۔ ہر روز رحمو ارادہ کرتا کہ نو بہار سے دو ٹوک باتیں کرے گا اور اس کو سزا دے گا اور ہر روز وہ نو بہار کے سامنے پہلے کی طرح نیاز مند ہی نظر آتا۔ لوگ اُسے زن مرید بھڑوا اور دیوث کہتے۔ وہ قسمیں کھا کھا کر اپنی بیوی کو سزا دینے جاتا اور اُس کے پاس جا کر اس کی منتیں کرنے لگتا۔ نو بہار بھی رحمو کو کوڑی کا تین سمجھنے لگی۔ اب نو بہار خود ہی بڑھ کر یہ کہتی کہ اگر ہم بُرے ہیں تو رحمو ہمیں چھوڑ کیوں نہیں دیتا۔ رحمو یہ باتیں سنتا اور پٹے ہوئے گدھے کی طرح سر نیچا کئے ہوئے کھڑا رہتا۔ اس میں اتنی تاب کہاں تھی کہ نو بہار کو چھوڑ دے۔ وہ ایک عورت چاہتا تھا۔ جو اس کی کہلائے نو بہار جیسی عورت اُسے کہاں ملتی نو بہار کو رحمو کی کچھ پرواہ نہ تھی اور رحمو کو نو بہار کی بے حد پرواہ تھی۔ وہ رحمو کیلئے ناگزیر تھی۔

غریب رحمو غم غلط کرنے کے لئے تاڑی پینے لگا۔ نشہ کے عالم میں وہ نو بہار کی درستگی کی بہت سی تجاویز مرتب کرتا اور کبھی وہ پاگلوں کی طرح بکتا اور دوسروں پر یہ الزام لگاتا کہ انہوں

نے اس کی نیک پارسا بیوی کو بُری راہ پر چلنے دیا لیکن وہ نوبہار کی تادیب اصلاح کے لئے کوئی عملی قدم اٹھانے میں کامیاب نہ ہو سکا اور نہ اُس سے علیحدگی اختیار کر سکا۔ دو سال گذر گئے اور ہر تین چار ماہ کے بعد رحمو بڑے دم خم کے ساتھ بیوی کی اصلاح کا بیڑا اٹھا کر آتا۔ اور اُس سے شکست کھا کر واپس چلا جاتا۔ منشی کریم نے نوبہار کے لئے ایک علیحدہ چھوٹا سا مکان بنا دیا۔ اور وہ اسی میں اُٹھ گئی۔ اب وہ کسی کی ملازمہ نہ تھی۔ بلکہ باضابطہ منشی جی کی داشتہ تھی۔

ایک بار رحمو شہر سے آیا اور اُس لڑکی کو جسے وہ اپنی بیٹی سمجھتا تھا نوبہار کے پاس سے چھپا کر چپ چاپ واپس شہر لے گیا۔ گویا یہ کمزور سا اعلان تھا کہ اب نوبہار اُس کی بیوی نہیں۔

جب نوبہار کو اس اغوا کی اطلاع ملی تو وہ بپھری ہوئی ناگن کی طرح رحمو کے یہاں شہر گئی۔ اور اس سے طلاق مانگی۔ رحمو، نوبہار کے سامنے ایک ملازم کی طرح گردن جھکائے کھڑا تھا۔ اور وہ اس پر برس رہی تھی۔ پٹے ہوئے مہرے کی مانند رحمو نوبہار کے سامنے سے ہٹ گیا۔ اور دور کھٹولے پر لیٹے ہوئے اس کے نونہال کو گود میں لیکر ٹہلانے لگا۔

جب نوبہار واپس گاؤں چلی تو اس کے ساتھ اس کی بیٹی بھی تھی اور رحمو کے دئیے ہوئے بہت سے تحفے ۔

پاگل

گاؤں میں برات آئی ہوئی تھی۔ وہاں کی خاموش فضا غیر معمولی طور پر جاگ اٹھی تھی۔ ہر طرف چہل پہل، ہر سو داد و دہش۔ بغرض بستی بھر میں ایک پرکیف انتشار طاری تھا۔ شام ہو چکی تھی۔ اور گاؤں کے رئیس کے بنگلے پر لوگ روشنی کے سامان میں مشغول تھے۔ ضروری اور غیر ضروری طور پر یہ لوگ دوڑے پھر رہے تھے۔ چیخے جا رہے تھے۔ اور اپنی کارکردگی کا مظاہرہ بلند بانگ کیے چلتے تھے۔ برات یہیں ٹھہری ہوئی تھی۔ بنگلے پر رونق ہی رونق تھی۔ شامیانے ٹنگے ہوئے تھے۔ دریاں اور چاندنیاں بچھی ہوئی تھیں۔ کہیں پر چوکیاں بھی پڑی تھیں اور کسی جا میز کرسیاں بھی قرینے سے لگی ہوئی تھیں۔ برات والے شامیانے کے نیچے بیٹھے مختلف ٹولیوں میں مصروف لطف اندوزی تھے۔ گراموفون بج رہا تھا۔ تاش اور شطرنج سے ابھی ابھی لوگ فارغ ہو کر مصروف بذلہ سنجی تھے۔

کہیں پر کوئی منچلا جوان دھیمے سُروں میں کوئی غزل گا رہا تھا اور کسی رنگین مزاج بانکے کی حریص و آرزومند نگاہیں حویلی سے آنے جانے والی نوخیز چھوکریوں کی طرف اُٹھی جا رہی تھیں، بارات والے اپنی منڈلی علیحدہ جمائے ہوئے تھے منتظمین کی چیخ پکار نوبت بنوبت مجلس کی یکسانیت میں پر لطف تبدیلی پیدا کر دیتی تھی۔ دلہن والوں کے مجمع میں ذہین ایک سپید و سُرخ رنگ، بلند پیشانی پتلی نوکیلی ناک والا نوجوان اپنی لطیفہ گوئیوں، پرلطف جملوں، موزوں شعر خوانیوں، دلچسپ پھبتیوں سے سامانِ گرمیِ محفل بنا ہوا تھا اس کے انداز میں وہ موہ لینے والی کشش تھی کہ برات والے بھی اس طرف متوجہ ہوتے جاتے تھے۔ "یہیں" یہاں بھی ایک موزوں گوشے میں بھاری بھر کم انداز میں بیٹھے ہوئے تھے چھوٹی پیشانی چھوٹے چھوٹے کچے پکے گولمرچ نمک بال، ڈاڑھی منڈی ہوئی۔ دوہری ٹھوڑی بڑے کلّے جبڑے کے فربہ آدمی عربی وضع کا پاجامہ اور لانبا کرتہ پہنے کاندھے پر چارخانہ رومال ڈالے ہوئے سرِ شام سے وہ اس طرح بولے جا رہے تھے کہ کسی نے ہفتہ بھر کی چابی بھر دی ہو۔ ان کا موضوعِ سخن زیادہ تر اگلی پچھلی تقریبات کے متعلق تھا۔ ننھے نواب کی بڑی لڑکی کی شادی کے موقع پر سومن بریانی پکی۔ پیر پہاڑی کے رئیس کی برات میں ہاتھیوں گھوڑوں کی تعداد، ننھو میاں کی سالی کے رخصتانہ کے وقت "شادیات کے کل لوازمات" کا انتظام خود ان کے سر پڑ جانا اور ان کا مجبوراً اس ہمت شکن فرض کو براہِ مہربانی قبول کر لینا اور پھر اس مہم کی فتح کا سہرا ان کے سر چڑھنا وغیرہ وغیرہ۔

اس مسئلہ خاص میں ان کی واقفیت اس درجہ کامل تھی اور تواریخ شادیات پر انہیں اتنا عبور حاصل تھا کہ آپ اُن سے ناطق قاموس کا کام لے سکتے تھے۔ فلاں شادی میں زردے

میں زعفران کی کمی کے سبب باراتیوں کی شُکلی کی قسم کی تاریخی حقیقتوں کے علم سے لے کر چوتھی میں دلہن کے موباف کے مناسب رنگ کی واقفیت تک ان کے نوک زبان تھی۔ امین میاں کے قریب ہی ایک پست قد موٹا سا گول مول چہرے والا شخص ان کی ہر بات کو اس انداز سے سن رہا تھا جیسے اس کی نجات اسی پر منحصر ہے اور وہ بار بار واقفکارانہ طور پر اپنا چھوٹا سا سر ہلاتا جاتا تھا مشکور دادا (سارے بستی والے انہیں اسی نام سے یاد کرتے تھے) ایک ہاتھ میں لاٹھی لئے ہر کس و ناکس سے مذاق اور خوش دلانہ حرکتیں کرتے پھر رہے تھے اور اپنے زعم میں کامیاب ظرافت پر مسوڑوں تک دانت کو نمایاں کرتے ہوئے اور اپنے چوکور چہرے پر جسکے بالائی محاذ کے قریب ایک میلی سی دوپلی رکھی ہوئی تھی، شکن اندر شکن پیدا کرتے ہوئے قلقاریوں پر قلقاریاں لے رہے تھے سب سے دور سائبان کے ایک نمایاں گوشے میں محترم مولوی صاحب بصد انداز تمکنت درعونت "شجر الزقوم" بنے بیٹھے تھے۔ پُر روغن چہرہ پر خشونت مستمرہ سے کانٹے سے بن گئے تھے۔ سیاہ لانبی، الجھی ہوئی بے ترتیب سی ڈاڑھی، سر پر اعلان سیادت کے طور پر متکبرانہ عمامہ، لانبا کرتہ، دکھلاوے کی حد تک اونچے نہری کا عجیب القطع مولویانہ پاجامہ یہ تھی۔ ان کی وضع۔ مولوی صاحب مجلس کی خوش فعلیوں اور زندہ دلانہ مشاغل کو نظرِ حقارت و استکراہ سے دیکھ رہے تھے اور ان کی مجموعی کیفیت سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ اگر ان کی ذات تقدس مآب اس محفل نغمہ و سرود، اس مجلس بدعت و عصیاں میں نہ ہوتی تو پھر عذاب خداوندی کو روکنے والی کوئی صورت، باقی نہ رہ گئی تھی۔ باجے بج رہے تھے۔ زنانخانے سے گیت کی آوازیں مختلف سُروں میں پے بہ پے آ رہی تھیں۔ مولوی صاحب ایسی مجلس میں ہرگاہ نہ شریک ہوتے

مگر وہ عورت طعام کو روک کر کے گنہگار بننا پسند نہیں فرماتے تھے۔ اور اب بھی وہ اُٹھ کر اس فضائے گناہ سے چلے جاتے لیکن ایسی تقریبوں میں کھانے کا وقت کم بخت بہت دیر میں آتا ہے بھلا بغیر اس فرض کو ادا کئے ہوئے قبلہ اپنی جگہ سے کیسے اُٹھ جاتے۔ غرض مختلف ہیئت و وضع کے لوگ اپنی اپنی جگہ پر مشغول تھے۔ رات ہو چکی تھی، گیس بتیاں اور ڈے لائٹرز روشن کر دی گئی تھیں۔ گرمیٔ محفل تیز ہو رہی تھی کہ ایک سمت سے آواز آئی۔ اونچی آواز، بھاری غصہ اور نفرت سے بھری ہوئی، بیباک، بے خوف، بے قید آواز ...... "پکڑ لو، مجمع خلافِ قانون، بدمعاشو، شیطانو، تم پر کڑکتی ہوئی بجلی گر جائے ...... یہ سب مسمریزم ہے، غضب خدا کا برادری کی شادی اور مجھے نوید تک نہیں دیا گیا ...... تم سب لوگ گاندھی ہو، کانگریس ہو ...... ابھی دارو غہ جی کو میں خبر کرتا ہوں۔ ہم گورنمنٹ ہیں ... ہم گورنمنٹ ہیں .... ہاں ہم گورنمنٹ ہیں۔ کون کہتا ہے کہ ہم گورنمنٹ نہیں ہیں۔ اگر یہ سچ ہے اور ہے، ضرور ہے کہ تم لوگ سوراج ہو، مسمریزم ہو اور ہم سرکار ہیں۔ سب جھوٹ ..."

مجمع کی نظریں یک بیک اس نو وارد کی طرف اُٹھ گئیں، تفرد و تمسخر سے لبریز نظریں، استفہام و استعجاب سے بھری ہوئی نگاہیں کسی کے تیوروں میں انقباض، کسی کے انداز میں ناپسندیدگی و انتشار اور کسی کے بشرے سے شرارت آمیز مسرت ظاہر ہو رہی تھی۔ باجے والے بھی مڑ مڑ کر دیکھنے لگے۔ ایمن میاں کا چرخہ لمحہ بھر کے لئے رک گیا، شکور دادا کی پیرانہ سالی کی حرکتیں بھی موقوف ہو گئیں، مولوی صاحب خواہ مخواہ چہرے کے دونوں جانب سے پھول کر زیادہ مضحکہ خیز ہو گئے۔ گاؤں کے ایک وضعدار بزرگ نے نہایت متانت کے ساتھ نو وارد کو مخاطب کر کے کہا "جواد! ایسے موقعوں پر

بھی تمہارا پاگل پن نہیں چھوٹتا"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نووارد جس کی آنکھیں شعلہ بار ہو رہی تھیں بالکل بپھر گیا۔ اس کی پیشانی اور گردن کی ابھری ہوئی رگیں اور تن گئیں اور وہ گرج کر بولا۔

"پاگل۔ ۔ ۔ تم۔ ۔ ۔ تم! ہم پاگل ہیں؟ کوئی کہہ تو دے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہم نہیں ہیں پاگل۔ ۔ ۔ ۔ ہم نہیں ہیں پاگل۔ ۔ ۔ ہم ہم نہیں ہیں پاگل!"

جواد بابو اپنے زمانۂ عروج میں نہایت ہوش و خرد والے شخص مانے جاتے تھے۔ وہ بستی کے رئیسِ اعظم کے دستِ راست تھے۔ ۔ ۔ لوگوں کا خیال تھا کہ رئیسِ دیہہ کی روز افزوں ترقی کا سبب بابو جواد اور اُن کے شریکِ کار موہن سنگھ ہیں۔ ان کی جلتی کے زمانہ میں گاؤں کا ہر فرد ان کی بے انتہا عزت و احترام کرتا تھا۔ کس کی مجال کہ ان کے قریب سے بغیر مؤدبانہ سلام کئے ہوئے گذر جائے۔ دیہاتیوں میں ان کا طوطی بولتا تھا۔ ہر جگہ ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے تھے اور باوجود لاابالی حرکتوں کے ان کی قدر و منزلت ہوتی تھی۔ مذہبی خشونت اور تنگ نظری عقیدے کی حد تک ان میں بدرجۂ اتم تھی۔ مگر جہاں تک سوال اعمال و افعال کا ہے وہ یکسر آزاد واقع ہوئے تھے۔ بیساکھ کے زمانہ میں ان کی شوراشوری بہار پر ہوتی تھی اور مزہ بدلنے کے لئے وہ ہر اُس چیز کا استعمال جائز سمجھتے تھے جس سے "یک گونہ بیخودی" دن رات حاصل ہو سکے بابو جواد ہمیشہ سے فضول گو واقع ہوئے تھے اور اوائل ہی سے رستہ چلتے ہوئے بھی اُن کے سرِ انگشت میں فلسفیانہ جنبش ہوتی رہتی تھی۔ ایسی حالت میں وہ زیرِ لب کچھ بولتے بھی جاتے تھے۔ لوگ اُسے معاملہ فہمانہ انداز اور سیاسی غور و فکر سمجھتے تھے۔ بابو جواد بہت ہوشیار مشہور تھے عقلِ معاش کا عملی ثبوت انہوں نے کافی دولت جمع کر کے دیدیا تھا۔ رفتہ رفتہ ان کے انداز میں بے عنوانیاں

بڑھتی گئیں اور اُن کے مشاغل روز بروز احتیاط و سنجیدگی کی قیود سے آزاد ہوتے گئے۔ ان
کے اندوختہ میں کمی آنے لگی۔ اور اب یہ حال تھا کہ ان کی مالی حالت اچھی نہ رہی تھی۔ انکی وہ
حرکتیں جسے کبھی لوگ سعیٔ نکتہ رسی خیال کرتے تھے تھوڑے عرصہ کے بعد آثارِ جنون سمجھی جانے
لگیں۔ اور ایک زمانہ ایسا آیا کہ وہ مستقل پاگل مشہور ہو گئے۔ مگر ابھی ایسی حالت نہیں ہوئی
تھی کہ فوری گفتگو کے بعد لوگ انہیں پاگل سمجھنے لگیں۔ گاؤں والوں نے انہیں چھیڑنا شروع
کر دیا۔ بیکار لونڈے ان پر پھبتیاں کسنے اور ان کے پیچھے پڑنے لگے۔ ہیجانی تحریکات کے
سبب اُن کا پاگل پن بڑھنے لگا۔ بستی کا سنجیدہ طبقہ بھی گاہے گاہے ازراہِ تفریح ان سے
الجھنا پسند کرتا تھا۔ بظاہر معصوم چھیڑ چھاڑ ان کی پوشیدہ مجنونانہ صلاحیتوں کیلئے تازیانہ
ثابت ہوئی اور وہ پاگل پن کے سارے ساز و برگ سے آراستہ ہو گئے۔ شور و غل کے ابتدائی
مرحلوں سے گذر کر اب وہ جنون کے اعلیٰ منازل طے کرنے لگے جس زمانہ میں بابو جواد جنون کے
مذکورہ دور سے گذر رہے تھے تحریک ترک موالات کا زور تھا۔ مخالف سرکار اور موافق سرکار
کی تفریق ہو رہی تھی۔ انہوں نے ہمیشہ کے لئے انسانیت کی تقسیم کر ڈالی تھیں۔ ان کے
نزدیک ایک شخص یا جماعت یا تو "گورنمنٹ" تھا یا "گاندھی" کبھی وہ "سرکار" اور "کانگریس" کے الفاظ
بھی برائے تفریق استعمال کرتے تھے۔ وہ راہ چلتے لوگوں سے دریافت کیا کرتے کہ "تم گورنمنٹ
ہو یا گاندھی؟" اپنے کو وہ یا تو گورنمنٹ سمجھتے یا ابنِ سعود۔ تحریک ترک موالات کے معنے انکے
نزدیک مسمریزم کے تھے۔ بابو جواد جب صحیح الدماغ تھے تو برادری کی تقریبات میں شریک ہونا
ان کے لئے مذہب تھا بغیر چوک کے وہ ہر تقریب میں شرکت ضرور فرماتے تھے اور آج اس

تقریب میں اہلِ برادری نے انہیں فراموش کر دیا تھا۔ پاگل کو کون پوچھتا ہے۔ دنیا والے سمجھتے ہیں کہ پاگل کے پاس احساس وجذبات نہیں ہوتے۔ درحالیکہ دیوانے کے احساس و جذبات شعلہائے جہنم کی طرح بھڑکتے رہتے ہیں۔ وہ ایک طوفان کی طرح اُٹھتے ہیں اور سیلاب کی مانند ہر قید و بند کو توڑ کر بیکراں ہو جانا چاہتے ہیں۔ اس کے کوہِ آتش فشاں حیات ایک بے پناہ زلزلے کی صورت بنیادِ عقل و خرد کو کارگہِ شیشہ گراں کی مثال مسمار کر ڈالتے ہیں۔ اگر اہلِ دنیا دیوانے کے دل وجگر کے آتشکدہ کی ایک چنگاری بھی دیکھ سکتے تو ان کے دل اسقدر برف کی مانند سرد نہ ہوتے۔

دیوانہ سرِ تقریب کھڑا ہوا تھا۔ دنیا نے اس کے ساتھ بے انصافی اور بدسلوکی کی اس کے اعصاب تن گئے تھے۔ بجلی کے تار کی طرح اس کے اعضا لوہے کی سلاخوں کی صورت سخت ہو رہے تھے۔ اس کا دل تیز بہت تیز اس کی پھڑکتی ہوئی رگوں میں اُسکے جلتے ہوئے دماغ میں گرم گرم خون پہنچا رہا تھا۔ اس کی مٹھیاں سخت طور سے بند تھیں۔ بے ترتیب سر کے بال ایک ہیبتناک خوابِ پریشان کے بھوتوں کی طرح تنے ہوئے تھے۔ دیوانے کا چہرہ گرم بھٹی کی طرح سُرخ ہو رہا تھا۔ خونِ کبوتر کی مانند احمریں آنکھیں آتش چکاں تھیں۔ اس کے دانت کٹ کٹ بج رہے تھے۔ جیسے کوئی عفریت جانداروں کی ہڈیاں چبا رہا ہو۔ منہ سے طوفانی سمندر کی جھاگ کی مثال کف جاری تھا۔ بے پناہ نفرت کے مجنون دھارے اسکے اعصاب میں تیر رہے تھے۔ حقارت کا مہیب سمندر اس کے اعماقِ قلب میں طوفان خیز تھا اور غیظ و غضب کا ایک زہرہ گداز دوزخ اس کے دماغ میں زہرناک اژدہوں کی زبان کی طرح

شعلہ فشاں تھا۔ کسی نے اُسے پاگل کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ دیوانے کی دکھتی ہوئی رگ چھیڑنا کیا اتنا آسان ہے۔ جیسے لاکھوں وولٹ کے تارِ برق کو چھیڑ کر بجلیوں کو آزاد کر دیا گیا ہو اس کے جذبات کی رو میں ہیجان آگیا تھا جس کے کہربائی اثرات سے مجمع پر ایک ایسی کیفیت طاری ہو گئی جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا ہو۔

تھوڑی دیر تک یہی سماں رہا۔ دیوانہ سب کو گھور رہا تھا۔ ابوالہول مصر کی مانند مجلس کی مجلس کسی افسانوی سحر زدہ قلعہ کے مکینوں کی طرح اپنی مختلف حرکت و ادا کے ساتھ بت بنی ہوئی تھی۔ اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ یہ سکوت و جمود اس وقت تک قائم و دائم رہیگا جبتک صور قیامت نہ پھونک جائے۔ یہی عالم تھا کہ پاگل یک بیک مڑ گیا اور ایک جانب ہو کر تیز تیز ٹہلنے لگا۔ طلسم ٹوٹ چکا تھا۔ محفل میں حرکت و زندگی کے آثار پھر سے پیدا ہو گئے۔ بہت سے لوگ یک زبان ہو کر بول اُٹھے، "نکالو اسے یہاں سے" امین میاں نے محنت و مشقت سے سانس لیتے ہوئے کہا۔ "شادیات میں ایسی بے عنوانیاں مجھے ذرا نہیں بھاتیں ہیں اس زندگی میں سینکڑوں تقریبات میں شریک ہوا ہوں مگر......" اُن کا دم پھولنے لگا۔ پسینے کے چند قطرات پیشانی پر نمایاں ہو گئے اور وہ بولتے بولتے رُک گئے۔ شکور دادا ایسے جان جھونکوں کے موقع پر یقیناً ایک طرف سرک جاتے تھے۔ کون جانتا ہے۔ جان پر بن آئے۔ حفظِ ما تقدم کے طور پر وہ پانی پینے کے بہانے گھڑونچی کی طرف چلے گئے۔ ایک نوکیلی ڈاڑھی والے دبلے پتلے بوڑھے صاحب جو ہر شخص کی رفتار و گفتار کے پیچھے پالیسی کو چھپا ہوا دیکھنے کے عادی تھے بڑے فیصلہ کن انداز میں گویا ہوئے "یہ سب نقل ہے۔ پاگل پن کا ڈھونگ رچایا گیا ہے۔ لوگوں کا رویہ

بچانا ہو تو پاگل بننا نہایت مفید ہے۔ ہم سب سمجھتے ہیں "۔ غریب پاگل پیش وپس انگلیوں سے اشارہ کرتا ہوا، سر ہلاتا ہوا ٹہل رہا تھا۔ اُس کا چہرہ بالکل ساکن ہو گیا تھا۔ اُسکے دماغ کا باجا تبدیل شدہ قطعی تبدیل شدہ سُر پر بج رہا تھا۔ اُس کے انداز میں ایک بے خودی سی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ جھومنے لگا ـــــ "مدھو بنوا گئے ہو . . . . مدھو بنوا گئے ہو . . . . سیاں مورا مدھو بنوا . . . . . یہ سب مسمریزم . . . . جو نہ کرے گاندھی نماز کے وقت دخل اندازی . . . . اب ہم دافع شرک استعمال کریں گے تو پھر مت کہیو کہ جواد پاگل ہے . . . . اگر یہ سچ ہے۔ ہم نہیں کہتے کہ ہے . . . مگر دیکھو بھائی مذہب میں دخل دو گے تو ہم ابن سعود کو بلا لیں گے۔ تین خدا کو ماننا . . . . ہاہیں ہیں ہیں۔ اہاہاہاہا۔ پاگل تو یہ ہے۔ ڈبی بھیجو چاہے کچھ۔ ہم نہیں ہیں پاگل ہم نہیں ہیں پاگل ہے

بہر رنگے کہ خواہی جامہ مے پوش   من اندازِ قدت را می شناسم

دل بدست آور کہ حج اکبر است تا حج کرنے میں کس کی مجال جو دخل دے۔ ابنِ سعود بھی نہیں روک سکتا ہے۔ تم جاؤ نہ بھائی بیت المقدس ہم رو کے ہیں تم کو . . . . "

سیاں مورا مدھو بنوا گئے ہو۔ مدھو بنوا گئے ہو . . . . .

ایک طرف سے چند چھوکروں نے ملکر "ہوا ہو ا!" کی صدا بلند کی . . . پاگل ایک مہیب گرج کے ساتھ ان بدتمیزوں کی طرف بپھرے ہوئے شیر کی طرح حملہ آور ہوا۔ وہ تو پہلے سے بھاگ جانے کو تیار تھے، نکل گئے۔ دیوانے کے سامنے ایک گیس بتی پڑی۔ اُس نے اسے گھونسوں اور ٹھوکروں سے چور چور کر دیا۔ اس پر ایک سخت انتقامی جذبہ طاری تھا وہ چاہ رہا تھا کہ ان چھوکروں کو

پیس کر رکھدے۔ اس کے دماغ میں خیال آیا کہ اہلِ محفل ہی نے ان موذیوں کو اشارہ کر دیا تھا تب ہی تو وہ لوگ ہنس رہے تھے۔

"یہ اخوان الشیاطین مجھ پر خندہ زن ہیں۔ میری ناکامیابی پر انکے دانت کھلے پڑتے ہیں میں ایک ایک گیس بتی کو ایک ایک کر کے انکے سر پر دے ماروں گا تاکہ ان کا بھیجا نکل جائے۔ انکی کھوپڑیاں کو ہر طرف اسی طرح دانت نکلا ہوا بکھیر دوں گا۔ انکے ہنستے ہوئے سروں پر اچھلوں گا۔ دوڑوں گا۔ ناچونگا۔ گاؤں گا۔۔۔" یہ اور اسی قسم کے اور خیالات دیوانے کے سر میں چکر لگا رہے تھے۔ انکی آنکھوں میں ایک مافوق الفطری لرزہ خیز چمک تھی۔ اور ہر دو آنکھ سے شبو دنیا کی جہنم وسطی کی طرح ہلاکت اور موت کی بھسم کر دینے والی چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ معاً اسی وقت دو پیادوں نے پاگل کو آ کر عقب کی جانب سے پکڑ لیا۔ مجمع سے پراگندہ سی مختلف آوازیں نکلیں "نکالو بدذات کو۔۔۔ ہاں ہاں مارو اسے۔۔۔۔ بند کر دو کوٹھڑی میں۔۔۔ پاگل، دیوانہ، پاجی۔۔۔ موذی۔۔۔ شیطان۔ ابھی اس ناہنجار کو باہر کرو۔ دیکھنا، زور سے اس کی مشکیں کس دو۔۔۔" ملازموں نے اور بڑھ کر اسی قسم کے طرزِ تخاطب کو استعمال کیا بعض موقع شناسوں نے دیرینہ عداوت و بغض نکالنے کے اس نادر وقت کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ دیوانہ فرزانوں کے ہاتھ میں تھا لیکن دور سے دیکھنے والے ہرگز یہ تمیز نہیں کر سکتے تھے کہ دیوانہ کون ہے پاگل ایک آہنی عزم کے ساتھ ان ہوشمندوں کی گرفت سے نکل گیا۔ اسکی شہ زوری کے آگے ہر شخص طفلِ نوخیز معلوم ہو رہا تھا۔ لوگوں نے اسے دوبارہ گرفتار کیا اور وہ دوسری بار بھی سب کو جھاڑ کر اس طرح علیحدہ جا کھڑا ہوا جیسے یہ سب گہر وار محض بازیچۂ اطفال تھا۔ دیوانہ ایک ریگستانی بگولہ معلوم ہو رہا تھا یا ایک متحیر انگن طوفان یا ایک زہر ناک سموم جس کے پیچھے جھٹے پڑے اور ربود ہوئے

جا رہے تھے۔ وحشیاں اس طرح زبان نکالے ہوئے تھیں۔ جیسے صحرائی اژدہے اپنے شکار پر جھپٹنے سے پہلے زبان نکال لیتے ہیں۔ وہ چیخ رہا تھا پیہم دیوانہ وار بپھرے ہوئے شیر کی طرح ہلاکت آفریں "سائیکلون" کی مانند وہ رقص کناں تھا۔ ان شیاطین کی طرح جو اپنے شکار کو شعلوں کے سپرد کر کے اس کے گرد رقص کرتے ہیں ہر جانب متخاصمین گر رہے تھے شاخہائے نازک کی مثال: بنیاد سے اکھڑے ہوئے درختوں کی طرح کرسیاں، میزیں، لیمپ، آبخورے ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرے جاتے تھے۔ دیوانے کے سر سے خون جاری ہو رہا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں بھی لہولہان ہو رہے تھے مگر وہ غیر مفتوح تھا۔ پاگل کا عزم وارادہ بے پناہ ہوتا ہے۔ ناقابلِ شکست آہنین کوہ وقار۔ کوئی اس پر فتح نہیں پا سکتا، کوئی اسے تسخیر نہیں کر سکتا۔ اگر وہ کسی امر پر تُل جائے تو اہلِ خرد کا عزم اس کے آگے پرکاہ کے برابر بھی وقعت نہیں رکھتا۔ دیوانے نے جست لگائی اور دور جا کھڑا ہوا۔ نفرت کی ہنسی ہنستا ہوا اور حقارت کی نگاہیں ڈالتا ہوا نفرت وحقارت کے ساتھ فتح وظفر کی ایک ایسی مسرت بھی اس کے انداز میں نمایاں تھی جو ایک مجنون کو ہو سکتی ہے۔ اس نے دوسری جست لگائی اور نظروں سے غائب تھا۔ مجمع پر ایک انفعالی غیظ وغضب کی کیفیت طاری تھی بس پا شکست خوردہ، مضمحل امین میاں توند کے پیچھے سے ہانپتے ہوئے نیم بیہوشی کی حالت میں کچھ بڑبڑا رہے تھے۔ شکور دادا کو پانی پینے میں مصلحتاً غیر معمولی دیر ہو رہی تھی اور ذہین جو سارے واقعات کو ابتک خاموشی سے دیکھ رہا تھا سوچنے لگا کہ ایک دیوانے کے سامنے دوسرے لوگ بھی کیوں پاگل سے ہو جاتے ہیں۔ ان کے مفروضہ ادعائے اخلاقیات کو کیا ہو جاتا ہے۔ ذہین گو ظاہرا خوش باش نوجوان تھا مگر باطنی طور پر بہت ہی ذکی الحس واقع ہوا تھا۔ اس نے سوچا کہ دنیا والوں کے اخلاق وتہذیب بجز دکھلاوا ہوتے ہیں۔ سراسر فریب تارِ عنکبوت کی طرح ناپائدار اخلاق ومراسم کے

نازک رنگین شیشے میں بد اخلاقیوں کے کالے ناگ رہتے ہیں جس طرح چیتے کے نرم و نفیس پنجے کے غلاف میں خونریز ناخن پوشیدہ ہوں۔ یہ ظاہرداری کے چلتے پھرتے پیکر خود غرضی و خود نمائی کیلئے اخلاق کو روا رکھتے ہیں۔ ان کے ملنے جلنے میں صداقت نہیں ان کے سلام و کلام میں خلوص نہیں جب ہی تو ایک ایسے شخص کے لئے جو تباہ حال ہو برباد ہو مفلس ہو مجبور ہو مختل الحواس ہو ان کے اخلاق پر رونے کار نہیں آتے۔ بلکہ اس سے بھی بڑا یہ کہ قابلِ رحم ہستیوں کو خداوندانِ تہذیب و شائستگی سامانِ تفریح بنا ڈالنے میں ذرا شرم محسوس نہیں کرتے

ذہین انھیں خیالات میں محو تھا۔ کہ ایک خشونت سے بھری ہوئی آواز سمع خراش ہوئی " یہ سارے واقعات بابداہت جواد کے افعال شنیعہ کے نتائج قبیحہ ہیں۔"

یہ تھے قبلہ مولوی صاحب اجارہ دار مذہب و اخلاق۔ دوسرے ایک بے ربط سے نغمے کی آواز آئی۔ پاگل گلیوں میں گاتا جا رہا تھا۔۔

کون بن کو کت کو نیّا بورا ....!

کون بن!"

جینے کا سہارا

اسے ہر راہگیر جانتا تھا۔ شام سویرے وہ بانکی پور پٹنہ کی سڑکوں پر یا گلیوں میں کہیں نہ کہیں ضرور نظر آجاتی تھی۔ وہ کھڑی نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ بیٹھی بیٹھی گھسک کر چلتی تھی اکڑو بیٹھی ہوئی وہ دائیں بائیں ملتی جاتی تھی۔ کلاک کے پنڈولم کی طرح وہ ہلتی جاتی تھی۔ اور اس طرح ناقابلِ محسوس طور پر آگے بڑھتی رہتی تھی۔ ایسی اکتا دینے والی جنبش کے ذریعہ وہ گلیوں اور سڑکوں کی خاک چھان لیتی تھی۔ راہی اسے دیکھتے ہوتے یا نظر انداز کرتے ہوئے گذر جاتے تھے، یکے، بگھیاں، فٹن، رکشے اور بیل گاڑیاں اس کے پہلو سے گزرتی رہتی تھیں اور وہ گھڑی کی سوئی کی طرح عمرِ رواں کی مثال آہستہ مگر یقینی طور پر آگے بڑھتی جاتی تھی، کچھ زیرِ لب گاتی ہوئی۔ ناقابلِ فہم انداز میں گنگناتی ہوئی۔ کون جانے وہ کیا گاتی تھی۔ دکھ کے گیت یا مٹے ہوئے سکھ کا راگ۔

وہ سڑک یا گلی کے کنارے کھسکتی جاتی تھی اور اُس کے پہلو میں نالے کا پانی خس وخاشاک لئے اینٹ روڑے سے اٹکتا، سرسراتا ہوا، بہتا جاتا تھا، اُسی بوڑھی، تباہ حال زمانے کی ٹھکرائی ہوئی فقیرن کی زندگی کی طرح۔

مجہول، اپاہج، بوڑھی فقیرن شاید اندھی تو نہ تھی۔ مگر میں اُس کی آنکھیں کبھی نہ دیکھ سکا۔ اس کے پپوٹے سوجے ہوئے تھے، اور پپنیاں ایک دوسرے سے اُلجھی رہتی تھیں۔ وہ ہماری سماج کی طرح اندھی تھی۔ آنکھ رکھ کر اندھی، بیمار، بیکار آنکھیں، اُس کے سر کے بال منڈے ہوئے تھے اور اُس کے پاؤں میں جنبھڑے لپٹے رہتے تھے۔ اس کا لباس صرف ربود ہی نہ رہتا تھا بلکہ اکثر وہ آدھی ننگی ہی ہوتی تھی، نہیں ننگی سے بڑھکر ننگی، کیونکہ بدحالی میں بیشتر اس کے جسم کے وہ حصے عریاں رہتے تھے جنہیں مستور ہونا چاہئے اور وہ حصے بُرے بھلے چھپے رہتے تھے۔ جن کے پوشیدہ رہنے کی چنداں ضرورت نہیں۔

وہ کسی سے بھیک نہیں مانگتی تھی۔ بلکہ اپنے حال میں گرفتار گٹھری بنی ہوئی ہلتی جلتی، گنگناتی آہستہ، بہت آہستہ آگے بڑھتی جاتی تھی۔ دن بھر میں وہ گلیوں اور بھرے بازار کا سفر کر لیتی تھی۔ اسے بہت کم بھیک ملتی تھی۔ فقیرن کے حال کی یکسانی ایسی روزانہ کی بات ہوگئی تھی کہ لوگوں کی توجہ بھی اس طرف نہیں پھرتی تھی۔ اُسے دیکھ کر میں سوچتا کہ اس کی زندگی میں کیا کشش ہے۔ کہ وہ جئے جاتی ہے۔ اس کے جینے کا کیا سہارا ہے، میری سمجھ میں نہ آتا، بے مقصد زندگی زندگی نہیں، زندگی کی تہمت ہے، فقیرن کی زندگی بے کیف، بے اسرار، دھیمی پھیکی اور سپاٹ ہی نہ تھی بلکہ دکھ درد اور روگ سے بھری ہوئی تھی۔ پھر بھی وہ جئے جاتی تھی، وہ زندہ رہنے کی کوشش کرتی تھی۔

اس کی زندگی میں حرکت پیہم تھی۔ استقلال تھا۔ شاید جینا خود ایک مقصد ہے۔

بوڑھی فقیرن سبزی باغ میں گوبی کی ڈنٹھل، کرم کلّے کے پتے، سڑے ہوئے شلجم، کچلے ہوئے ولایتی بیگن اور داغدار آلو سڑک پر سے جمع کر لیتی تھی اور پھر اسی جنبشِ پیہم کے ساتھ اپنی راہ لگتی تھی۔ عدالت کے ہوٹلوں کے سامنے وہ چچوڑی ہوئی ہڈیاں اور روٹیوں کے کنارے چن لیتی تھی، بھوکے بازاری کتّے اُس سے اس قدر مانوس ہو گئے تھے کہ اُس پر بھونکتے نہ تھے۔ شاید وہ فقیرن کو اپنا جائز حصّہ دار سمجھتے تھے، مگر کوئی نیا آوارہ کتّا جو اُدھر آنکلتا تو فقیرن کا ہاتھ ضرور اُس کے پنجوں سے مجروح ہو جاتا اور لباس زیادہ تار تار ——

یہ اپاہج بھکارن سرِ راہ کسی مہترانی یا کسی بوڑھے مزدور کو کبھی کبھار اپنی جیون کہانی سناتی ہوئی پائی جاتی ہیں نے بھی ایک بار وہ کہانی سنی ہے۔ کہانی بہت ہی مختصر ہے ——

وہ ایک بوڑھے فقیر کی بیٹی تھی۔ اُس نے اپنی ماں کو نہ دیکھا تھا۔ وہ اپنے بوڑھے باپ کے ساتھ اسی شہر میں بھیک مانگا کرتی تھی۔ دن بھیک مانگتے گذر جاتے اور راتیں کلکٹری کچہری کے برآمدے یا کسی پیپل کے درخت تلے بسر ہو جاتیں۔ پہرہ دار انہیں بہت ستاتے تھے۔ گرمی کی راتیں تو کھلے میدان میں گذاری جا سکتی ہیں، مگر برسات اور جاڑے کی راتیں بڑی بیرن ہوتی ہیں۔ انہیں دشمن راتوں کو کاٹنے کے لئے کسی پناہ کی جگہ کی ضرورت ہوتی۔ پہرہ دار دل کو کچھ دے دلاکر ایسی جائے امن میسّر آجاتی تھی۔ وہ اب جوان ہو چلی تھی اور زندگی کے دکھوں کو زیادہ محسوس کرنے لگی تھی۔ کبھی کبھی وہ جوانی کے سنہرے خواب دیکھتی اور ترس ترس کر رہ جاتی

کچھ دنوں سے ایک نوجوان پہریدار اُس پر بہت مہربان تھا۔ وہ بغیر پیسے لئے انہیں کچہری کے برآمدے میں سونے کی اجازت دیدیتا تھا۔ اور گاہے گاہے رات گئے ان کے پاس آبیٹھتا تھا وہ انہیں اپنی دلاوری اور جیالے پن کے قصے سناتا تھا چوروں کو پکڑنے کے قصے ڈکیتوں کو گرفتار کرنے کے واقعات بلووں میں گولیاں چلانے کے واردات۔ فقیرن پہرہ دار سے مانوس ہوتی جاتی تھی اور جب کبھی وہ پہرہ کی تبدیلی کے سبب نہ آتا تو وہ اداس رہتی اور اسکی راتیں بڑی بے چین کٹتیں۔ بھری برسات کی ایک سسکتی ہوئی ظالم رات کو فقیرن کی جوانی کا سہانا خوابِ حقیقتِ عریاں بن گیا۔ وہ دن بڑے مزے میں کٹ رہے تھے۔ چند مہینوں کے بعد پہرہ دار کہیں چلا گیا اور فقیرن اس کا انتظار کرتی کرتی تھک کر بے آس ہو گئی۔ اب وہ ماں بننے والی تھی۔ مگر ان فکر و مسرت کے دَورسے دنوں میں کوئی اس کی دل دہی کرنے والا نہ تھا۔ ہونیوالی بات اب کے جو دوسرا پہرہ دار آیا تو اُس نے جاڑے کے ٹھٹھرے ہوئے ایام میں فقیرن اور اسکے بوڑھے باپ کو کچہری کے برآمدے سے نکال دیا۔ بے آسرا ہو کر وہ لوگ درخت کے نیچے رین بسیرا کرنے لگے۔ کیسا پاپی تھا۔ پہرہ دار۔ فقیرن کو اپنا "دیالو" پہرہ دار یاد آجاتا۔ مگر وہ بھی "نرموہی" نکلا۔ کڑاکے کا جاڑا پڑ رہا تھا۔ فقیرن کے باپ کو نمونیہ ہو گیا اور وہ چل بسا۔ اس بے تھاہ جگ میں اس اندھی نگری میں اُسے تنہا چھوڑ کر وہ رخصت ہو گیا۔ نکلتے جاڑے میں فقیرن کو ست ماسو بچہ پیدا ہوا۔ اسی درخت کے نیچے جہاں وہ رہتی تھی۔ تیسرے روز بچہ مر گیا اور ہفتہ کے اندر اندر فقیرن کو کمر سے نیچے فالج آگیا۔ اُسی روز سے وہ "لنگوڑی" "پنا نگر" ہو گئی۔ اور اب اس کا یہ حال تھا۔

اپنا دکھڑا سنا کر فقیرن رونے لگتی تھی، اُس کے آنسو ٹوٹے ہوئے تاروں کی طرح دھول میں گر کر رائیگاں ہو جاتے تھے قصہ سننے والے محض بے معنی ہمدردی سے فقیرن کو دیکھتے ہوئے گذر جاتے اور وہ پھر شکستہ امید کی طرح کانپتی ہوئی رہ نوردی کے لئے آگے بڑھنے کی ایک ناتوان سی کوشش کرتی۔

میں اُس فقیرن کو روزانہ دیکھتا تھا اور میرے دل میں ایک مبہم سا جذبۂ جستجو پیدا ہوتا تھا کہ وہ اِن دنوں کہاں رہتی ہے اور کیونکر۔ ایک شام کو میں بھنور پوکھر جا رہا تھا کہ میں نے اُس مفلوج بھکارن کو سبزی باغ سے لوٹتے ہوئے دیکھا۔ شام کی تاریکی گہری ہو کر رات بننے والی تھی۔ میں نے قیاس کیا کہ وہ اب اپنی قیام گاہ کو واپس جا رہی ہے۔ میں وحید خلیفہ کی دوکان پہ ٹھہر گیا تا کہ بھکارن آگے بڑھ لے۔ مجھے بہت دیر تک انتظار کرنا پڑا۔ میں دکان سے اٹھا اور آگے بڑھ کر میں نے دیکھا کہ مجبور بڑھیا ابھی تک صرف ایک موڑ طے کر سکی ہے، وہ کچھوے سے بھی آہستہ گھسک رہی تھی۔ انتظار کی گھڑیوں کی طرح آہستہ۔ میں اگلی موڑ پر ایک دواخانہ میں چلا گیا اور بہت دیر تک دوا فروش سے بے تکی باتیں کرتا رہا، میں نے دواؤں کی قیمتیں دریافت کیں، انکے فوائد سے بحث کی، انگریزی اور ہندوستانی دواؤں کا مقابلہ و موازنہ کیا اور سارے شہر کے طبیبوں پہ تبصرہ کر ڈالا اور آخر کار سیاستِ حاضرہ پر لوگوں سے الجھ پڑا تا کہ وقت کٹے۔ میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ آج میں بھکارن کے سر چھپانے کی جگہ کو ضرور دیکھوں گا۔ جب میں دواخانے سے نکلا تو سامنے کی سڑک پر دوسری موڑ تک بڑھیا نہ تھی۔ میں موڑ تک گیا۔ بھنور پوکھر والی سڑک پہ بھی فقیرن نہ تھی میں حیران حیران اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ ایک پلّے کے بھونکنے کی آواز نے میری توجہ اُس طرف

منعطف کرائی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ مجبور و معذور بھکارن ایک کھپریل میں، جو ایک مکان کی پشت سے لگا ہوا تھا، داخل ہو رہی ہے اور اُسے دیکھ کر ایک کتے کا چھوٹا سا پلہ دُم ہلا ہلا کر دھیمے دھیمے بھونک رہا ہے۔ پلہ کھونٹے سے کھپریل میں بندھا ہوا تھا۔ ٹوٹی پھوٹی کھپریل موڑ کے پاس پرنالے والی گلی میں شکستہ بانسوں پر پڑی ہوئی تھی۔ چاروں طرف کوڑے کرکٹ کا ڈھیر تھا اور پرنالے کا پانی رُک رُک کر بہہ رہا تھا۔ دوطرفہ مکانوں کی موریاں اُسی گلی میں آ کر گرتی تھیں بھکارن کھپریل میں داخل ہوئی پلّے کے پاس پہنچی اور اپنی ساری کے آنچل سے بندھی ہوئی ہڈیاں اس کے سامنے کھول دیں۔ پلّہ غراتا ہوا بڑھیا کے آنچل سے ہڈیاں کھاتا رہا۔ فقیرن نے دوسری پوٹری سے روٹیوں کے کنارے نکال کر پلّے کو دیئے اور خود اُس سے پیار کی باتیں بولتی رہی میں کھڑا ہوا یہ سارا ماجرا دیکھ رہا تھا۔ جب بھکارن پلّے کو کھلا چکی تو اُس نے خود کچھ روٹی کے کنارے کھائے اور اِس کے بعد پلّے کو کھونٹے سے کھول کر گود میں لے لیا اور بچھی ہوئی پیال پہ جا کر اُسے پہلو میں لئے لیٹ گئی۔ بھکارن کچھ لوریاں سی گاتی جا رہی تھی۔ اور پلّہ آغوش کی گرمی کے مزے لیتا ہوا غوں غوں کر رہا تھا۔

میں یہ سوچتا ہوا آگے بڑھ گیا کہ شاید یہ پلّہ ہی بے آسرا بھکارن کے جینے کا سہارا ہے۔

تسکینِ حسرت

گاؤں کے اکثر کھیتوں سے ربیع کی فصل کٹ چکنے کے بعد تال کی سیاہ کوال مٹی بہت ہی نمایاں معلوم ہو رہی تھی۔ لیکن ابھی تک یہاں وہاں گیہوں اور بونٹ کے سنہرے کھیت شام کی دھوپ میں چمک رہے تھے۔ پچھوائی چل رہی تھی جس کی لہروں میں گیہوں کے خوشے اور بونٹ کی چھوٹی اور گداز ڈھیریاں جھول رہی تھیں۔ ہوا میں ہنوز گرمی تھی۔ گاؤں کے قریب، بھیٹھ کی قسم کے کھیتوں میں ترکاریوں کی لیتن اور پودے اپنی ہریاول سے دل نظر کو فرحت و تسکین بخش رہے تھے۔ ان سبز و شاداب کھیتوں کے درمیان کنوؤں پر لاٹھے لگے ہوئے تھے۔ جو اکثر چل رہے تھے اور ان کے چلنے سے مسلسل 'چوں چوں' کی آواز پیدا ہو رہی تھی۔ دہقان کھیتوں

گو پیار ہے تھے۔ پنگھٹ اور پگڈنڈیوں پر عورتیں اور البیلی لڑکیاں پانی بھرتے یا گھڑوں اور کلسیوں کو سنبھالتے نظر آرہی تھیں۔ ان کی سرخ اور زرد ساریاں، جن پر گذشتہ ہولی کے رنگوں کی گلکاریاں چیپت کے شباب کی رنگ رلیوں کی خوشگوار یاد دلارہی تھیں، بہت ہی دلفریب تھیں۔ ان کی چہلیں اور شرمیلی ہنسی اس سارے منظر کی روحِ رواں تھی۔ میدانوں میں لڑکے اور نوجوان کبڈی اور گلی ڈنڈا کھیل رہے تھے اور گلیوں میں بھی گولیاں کھیلی جارہی تھیں۔ گاؤں کی فضا پُرمسرت اور طمانیت چھائی ہوئی تھی۔

چودہ سال کا چھوکرا شبرتیا گاؤں کے زمیندار کے چھوٹے بچے کو گود میں لئے بنگلے کے چبوترے پر خیالات میں گم ٹہل رہا تھا۔ وہ لڑکا کھلانے اور اوپر کا کام کرنے پر ملازم تھا۔ وہ سوچنے لگا "بلا سے، ہم ہی تو ایک نہیں۔ رحموا اور دھوکر بھی تو رحمت بابو اور فرید بابو کے یہاں کے کام سے چھٹی نہیں ملتی ——— اور عبیدوا۔" عبیدوا کا نام ذہن میں آتے ہی شبرتیا آپ ہی آپ مسکرایا۔ "منجھلی دلہن سے کیسی جوتیاں کھاتا ہے وہ۔" اسے تسکین سی ہوئی جیسے اُن جوتیوں کی مار سے وہ خود بچ نکلا ہو۔ "مگر للوسا و بنیا کا لڑکا اور رمتوور سونار کا چھوکرا، شرفو بابو، بھولا بابو، غنیا . . . ." اپنے ہم عمر بہت سے لڑکوں کے نام اُس کے خیال میں آتے۔ یہ لڑکے زمینداروں، تاجروں اور فارغ البال کسانوں کے تھے۔ شبرتیا کے چہرے پر مایوسی اور حسرت کے آثار پیدا ہو گئے۔ زمیندار کا لڑکا اُس کی گود سے پھسلا جارہا تھا۔ اُس نے لڑکے کو سنبھالا اور ٹہلنے لگا۔

کلکتہ سے صغیروا کل ہی آیا ہے۔ اُس کا باپ جوٹ پر کماتا ہے اور صغیروا بھی بیڑی

بنا کر خوب پیسے کما لیتا ہے۔" شبر تیا کی آنکھیں یک بیک چمک اُٹھیں اور پھر بجھ سی گئیں۔ اُس کی چشمِ تصور نے صغیروا کی رنگ برنگی لنگی دیکھی اور جاپانی رَبڑ کا پمپ شو۔ اُسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ اُس خوبصورت لنگی کو خود پہنے ہوئے ہے اور وہی ربڑ کا جوتا اُس کے پاؤں کو گدگدا رہا ہے لیکن یہ فریبِ رنگیں بہت جلد حقیقت کی بے رنگی کے سامنے سرنگوں ہو گیا۔

"ہم بھی کلکتہ کیوں نہ بھاگ جائیں اور پھر رنگ برنگی لنگیاں، پمپ شو اور سب سے بڑھکر آزادی۔ ہر کام سے آزادی۔" اُس نے اپنے طور پر کلکتہ کے وسیع شہر کا تصوّر کیا۔ پھر اُسے وہ قصّے یاد آنے لگے جو صغیروا اور دوسرے کلکتے سے آنے والے بیان کرتے ہیں۔ اُس کا جی چاہا کہ لڑکے کو پٹک کر بھاگ نکلے اور جبار میاں کی دکان پر جا کر کلکتے کے قصّے سنے۔ اس ایک لمحے میں شبر تیا کے لئے زندگی کا مقصد صرف کلکتہ کے قصّے سننا تھا۔ ٹریم گاڑی، جادو گھر، چڑیا خانہ، ہوٹل، بائیسکوپ . . . . . بیڑی کی دکان، پیسے، رنگین لنگیاں اور پمپ شو۔ ان کے متعلق اُس نے جانے کیا کیا تصوّر قائم کیا۔

زمیندار کا بنگلہ گاؤں کے کنارے ایک اونچی جگہ پر واقع تھا۔ شبر تیا نے پہلو کے میدان میں گاؤں کے لڑکوں کو کبڈی کھیلتے دیکھا اور دور چند لڑکے پہاڑی کے کنارے والے آم کے باغ کی سمت میں جا رہے تھے۔ اُس نے حسرت بھری نظر سے اُن لڑکوں کو دیکھا اور گود سے پھسلتے ہوئے بچّے کو غصّے سے جھٹک کر کمر کے اوپر سنبھال لیا۔ سامنے کھیت میں کھیرے پھلے ہوئے تھے۔ اس کا جی چاہا کہ رات کو کھیروں پر شبخون مارے۔ اُسے پھر آم کے ٹکولوں[1] کا خیال آیا اور اُس کے منہ میں پانی بھر آیا۔

[1] کیریوں کو بہار میں "ٹکولے" کہتے ہیں

"شبر تیا، شبر تیا رے!" ـــــ شبر تیا چونکا ہو کر بنگلے کی طرف دیکھنے لگا۔ اُس نے سمجھا کہ کسی اور سخت بدمزہ کام کے لئے اُسے بلایا جا رہا ہے۔ پھر آواز آئی "شبر تیا! ابے شبر تیا! کبڈی نہیں کھیلے گا؟ آؤ نہ رے شبر تیا!" رضیا اور غنیا میدان سے شبر تیا کو آواز دے رہے تھے۔ اُس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور ذرا آگے بڑھ کر وہ جواباً چلایا۔ "کیسے آویں ہم رے۔ ہم کو لالٹین صاف کرنا اور پانی بھرنا ہے" اُس کی آواز گلوگیر تھی۔ لڑکے کبڈی کھیلنے لگے۔

"کبڈی کبڈی کبڈی ۔ ۔ ۔ ۔ کبڈی! کبڈیہہ! کبڈیہہ! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چل کبڈی تارا سلطان گنج مارا، سلطان گنج مارا ۔ ۔ ۔ کیسی دلفریب آواز دی۔ بول کا ترنم شبر تیا کو بیقرار کئے دیتا تھا۔ وہ کچھ دیر چپ چاپ بصد حسرت تماشہ دیکھتا رہا اور پھر ایک خشمگیں مایوسی کے ساتھ حویلی کی طرف چلدیا۔

"ابے او شبر تیا! مر گیا کمبخت! ہر وقت کھیل، ہر وقت تماشہ! بس بچہ کو گود میں لے لیا، سارے کام دھندے سے فراغت، نظارہ بازی کو نکل کھڑے ہوئے۔ کام چور، نمک حرام! ـــــ غارتی! مردار! ـــــ سارے کام پڑے ہوئے ہیں اور حضور سیر سپاٹے کر رہے ہونگے ۔ ۔ ۔" یہ الفاظ بڑی بیگم کے تھے جو شبر تیا نے حویلی میں داخل ہوتے ہوئے سنے۔ اس کا جی جل گیا۔ لیکن کیا کر سکتا تھا غریب ـ قہر درویش بر جانِ درویش اس کے دل میں بغاوت کی کمزور سی لہر اُٹھی اور بے بسی کی اتھاہ گہرائیوں میں جا کر غائب ہوگئی۔

بڑی بیگم اُسے دیکھ کر بے حد چراغ پا ہوئیں۔ اور انہوں نے اسے مسلسل نہایت ہی شگفتہ صلواتیں سنائیں۔ جھڑکیاں سہتا ہوا شبرتیا اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ کنوئیں سے پانی لانا، جھاڑو دینا، لالٹین صاف کرنا وغیرہ وغیرہ۔" اوپر کے کام" کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ جو آدھی رات تک قائم رہا۔

"کبڈی، کبڈی، کبڈی، کبڈی، کبڈی . . . ."

"ابے پاگل تو نہیں ہو گیا" موذی کاٹے، دن چڑھے تک سویا ہوا ہے" گھر کی بوڑھی ماما نے سوئے ہوئے شبرتیا کو جھنجوڑتے ہوئے کہا۔

"——چل کبڈی تارا سلطان گنج مارا، سلطان گنج . . . ."

بوڑھی ماما نے شبرتیا کے ایک دوہتڑ دیا۔ وہ چونک کر گھبرایا ہوا اُٹھ بیٹھا۔ پھر وہی "اوپر کے کام" کا غیر فانی سلسلہ۔

بوڑھی ماما بڑبڑاتی، کوستی باورچی خانے کو چل دی۔ وہ دو روٹیوں کی آس لگائے ہوئے تھی۔ بوڑھوں کی زندگی کا اہم ترین مقصد صرف کھانا ہے۔

شبرتیا ایک ہاتھ میں جھاڑو لئے اور دوسرے سے آنکھیں ملتا، جھکا ہوا ایک کمرے میں جھاڑو دے رہا تھا۔ اُسے بوڑھی ماما کا دوہتڑ اور بڑی بیگم کی صلواتیں یاد آ رہی تھیں۔ اُس کی گرد آلود پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔ وہ سوچ رہا تھا "یہ بڑھیا ہم کو مارنے والی کون ہوتی ہے اِس کُتیا کا چڑا چڑا کے ناک میں دَم نہ کر دیا تو میرا نام شبرتیا نہیں۔ ارے یہ بڑی بیگم کے برتے پہ ہم کو آنکھیں

دکھائی ہے نا" بڑی بیگم کا خیال آتے ہی شبرتیا کو بڑی بیگم کے سارے مظالم اور اپنی ساری حسرتیں یاد آگئیں۔ اس کے چہرے پر خون کی پچکاری سی پڑ گئی۔ "نمک حرام اور کام چور۔ اور اوپر سے جوتیاں ہم اب بھی نہیں رہیں گے ان کے یہاں۔ میری عمر کے لڑکے تو طرح طرح کے کھیل کھیلیں، کبڈی، ٹپو گلی ڈنڈا، تیرنا اور ہم اُن کے گھر سڑا کریں۔ آدمی نہ ہوئے بیل ہوتے۔ جیسے ہم بے جان سے ہیں، بیل سے بھی بدتر۔"

شبرتیا کا جی چاہتا تھا کہ ابھی فوراً بھاگ نکلے لیکن یک بیک اُسے اپنے ماں باپ کی غربت یاد آگئی۔ وہ بھاگ کر کہاں جائے۔ کلکتہ؟ اتنی دور پیدل جانا ناممکن اور پاس کوڑی بھی نہیں کہ ریل پر بیٹھ کر جائے۔ ریل پر بیٹھنے کے خیال سے اس کا دل ایک مبہم سے سرور کے احساس سے رُک رُک کر دھڑکنے لگا۔

وہ سوچنے لگا کہ اُس کے ماں باپ غریب کیوں ہیں۔ پھر اُسے دوسرے غریب لوگ یاد آئے اور اس کے بعد امیر لوگ اور آخر میں بڑی بیگم۔ بڑی بیگم سے اُسے شدید نفرت محسوس ہوئی۔ شبرتیا جھاڑو دینے بیٹھ گیا۔ خیالات و تصورات کی شدت مانع حرکت و عمل ہوتی ہے۔ اُس کے دل میں الجھاو سا تھا۔ وہ کچھ سمجھنا چاہتا تھا۔ صاف اور واضح طور پر۔

"۔ ۔ ۔ آخر ہم رجموا، دھوا، اور عیدوا کیوں آزادی سے کھیل کود نہیں سکتے۔ کیا اس لئے کہ ہمارے ماں باپ غریب ہیں۔ ہاں شاید اسی لئے۔ ٹھیک۔ تب ہی تو بھولا بابو، شرفو بابو شنکر جی، کرن ساؤ کے بیٹے جی، خوب آزادی سے گھومتے پھرتے ہیں۔ مگر جلیبو اور سلمتا، یہ تو ہم جیسے غریب ماں باپ کے بیٹے ہیں۔ یہ کیوں آزاد ہیں؟" شبرتیا کو گذشتہ دوپہر کا وہ منظر یاد آگیا جب

حلیموا اور سلمتا لالہ کاشی لعل کی گھوڑی پکڑ کر نواری کی رسی کا لگام لگائے اُس کی کھلی پیٹھ پر سوار کھیتوں اور باغوں میں دندناتے پھرتے تھے۔ حویلی سے ملی ہوئی گلی میں غیر معمولی چہل پہل تھی۔ کسان اور مزدور زمیندار کے تالاب میں مچھلی مارنے جارہے تھے۔ شبرتیا لوگوں کی آوازیں سُنکر چونکنا ہوا۔ "اوف او- آج مچھلی کی سالانہ ٹپائی کا دن ہے۔ تالاب پر میلا سا لگا ہوا ہوگا۔ ٹھٹ کے ٹھٹ لوگ جمع ہونگے"۔ جال، پلوون[1]، ٹاپے، ڈنڈے مختلف ناپ تول کے چھوکرے طرح طرح کے بوڑھے قسم قسم کے گپاڑے بھانت بھانت کے بے فکرے زمیندار لوگ لالہ پٹواری، براہل مجمع کا مجمع شبرتیا کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا اور وہ دل مسوس کر رہ گیا۔ اُسے ناقابل برداشت طور پر اپنی بے بسی کا احساس ہو رہا تھا۔ اُس نے اِس دکھ کا علاج پھر خیالات کی دنیا میں تلاش کیا۔ "آخر حلیموا اور سلمتا کو کوئی کچھ نہیں کہتا"؛ شبرتیا کے حافظہ نے اِس خیال کی فوراً تردید کی "نہیں، یہ دونوں تو کئی بار اپنے ماں باپ سے پٹے ہیں' اور اُس دفعہ جب عماد بابو کے یہاں سے سلمتا بھاگا تھا۔ تو پکڑے جانے پر عماد بابو نے اُسے کیسا ادھ مؤا کر دیا تھا مگر اُس کی بلا مانے۔ وہ پھر ایسا بھاگا کہ جنم جنم کا آزاد ہو گیا اور حلیموا نے تو کبھی پٹھے پر ہاتھ رکھنے ہی نہیں دیا"۔ شبرتیا کا چہرہ پھول کی طرح کھل گیا۔ شاید اُسے اپنے درد کا درماں حاصل ہو گیا تھا۔ اُس کے دل میں بغاوت کی ایک تیز لہر اُٹھی اور اُس گھڑی وہ اپنے آپ کو آزاد اور سربلند محسوس کر رہا تھا۔

"ہاں!! امیر لوگوں کے زمینداروں کے مہاجنوں کے لڑکے آزادی سے کھیلتے ہیں اور غریبوں

[1] جاپون مچھلی پھنسانے کے جال کی ایک قسم

کے وہ لڑکے بھی جو کسی کی غلامی نہیں کرتے اور شیروں کی طرح آزاد رہتے ہیں۔ وہ ظلم سہتے ہیں مگر من کے ہٹیلے ہیں اور وہی کر گزرتے ہیں جو اُن کا جی چاہتا ہے۔ اور وہ تو، بزدل غریب لڑکے جنم بھر کولھو کے بیل ہی بنے رہتے ہیں۔ ہم اب حلیمو اور سلمتا کی طرح آزاد رہیں گے اور کسی کی نہیں سنیں گے، چاہے جو کچھ ہو۔"

"شبر تیا! اے حرامزادے! ابھی تک جھاڑو ہی دے رہا ہے۔ ایک تو دوپہر کو سو کر اُٹھتا ہے اور اُس پر ایک کام میں سو پہر لگا دیتا ہے۔ کمبخت! کام چور! کوڑھی!"

بڑی بیگم کی قاہرانہ آواز دالان میں گونجی۔ شبر تیا سہم کر رہ گیا۔ اُس کے سارے باغیانہ ارادے، حکم برداری کی عادت کے اثر سے کافور ہو گئے۔ وہ جلد جلد جھاڑو دینے لگا اور جھٹ پٹ یہ کام ختم کر، غسل خانے سے گھڑا اٹھا، کنوئیں پر سے پانی لانے نکل کھڑا ہوا۔

پنگھٹ اور تالاب نزدیک ہی نزدیک تھے۔ راہ میں اور پنگھٹ پر شبر تیا مچھلی کے شکاریوں اور تماشہ بینوں سے ملا۔ فصل کی کٹائی ختم ہونے والی تھی۔ کسانوں کے گھروں میں اناج کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ اپنی تھوڑی سی اور لُٹ جانے والی پونجی کے وقتی قبضہ کے احساس سے بھولے بھالے کسان پھولے نہیں سماتے تھے۔ لگن کا زمانہ بھی اب آ ہی چلا تھا۔ سب کے چہروں پر آنی جانی مسرت کے عبیر و گلال لگے ہوئے تھے۔ جہاں شادمانی اور فارغ البالی کا قحط ہو وہاں حقیر سی خوشی کا سامان بھی بہت بڑا سرمایہ بہجت و نشاط ہوتا ہے۔ ع

اگر نہ ہو یہ فریبِ پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا

کھیت کے مزدوروں کی بے مائگی تو کسانوں سے بھی بڑھی چڑھی ہوتی ہے۔ یہ لنگوٹی

پر پھاگ کھیلنے والے سب سے زیادہ سرمست تھے۔ بیساکھ کا موسم اور گرہ میں تھوڑی مزدوری! پھر انہیں تاڑی کی لبنیاں لنڈھانے سے کون روک سکتا ہے۔ کوئی گاتا چلا آتا ہے، کسی کا چہرہ بیربہوٹی بنا ہوا ہے۔ کوئی ترنگ میں مزے مزے کی باتیں کر رہا ہے۔ بدن پر لنگوٹی مگر من میں موج۔ غرض ساری فضا میں کیف و انبساط کی موجیں اُٹھ رہی تھیں۔ شبرتیا اُس سے بلا متاثر ہوئے نہ رہ سکا۔ اُس نے لہک کر ایک الاپ لگائی۔

المئی تے بھنیاں دوار پہ   سند لیبہ لیکے یار کے ۔ ۔ ۔ ۔ !

پیچھے سے سلمتا نے اُسے ایک چپت رسید کی۔ شبرتیا نے اُسے مڑ کر دیکھا اور آپ خوب کھلکھلا کر ہنسا

سلمتا بولا "دور! غلام کا بچہ آج بھی گھر سے ہی ڈھونا رہے گا؟"

شبرتیا کے دل میں ایک تیر سا لگا۔ شرمندگی مٹانے کیلئے سلمتا کے گلے میں باہیں ڈال کر اُس نے پھر ایک قہقہہ لگایا۔ کنوئیں پر گھڑا رکھ کر دونوں دوست تالاب کے کنارے چلے گئے۔ وہاں ان کے ہمجولیوں کی قوم مختلف ہیئت میں کھڑی ہوئی تھی۔

شبرتیا خود فراموشی و خود فریبی کے عالم میں وہ سب چھوکروں سے زیادہ خوش و خرم نظر آرہا تھا اور سب سے بڑھ چڑھ کر کھیلوں اور شرارتوں میں حصہ لے رہا تھا۔ لیکن یہ غم غلط کرنے کی گھڑی بہت ہی گریزپا ثابت ہوئی۔

"شبرتیا! اے شبرتیا! بی جی تیرے کھوج رہی ہیں رے! جلدی جانا رے سالا۔ ۔ ۔"

رام ٹہل سنگھ براہل کی گرجدار آواز نے سرمستی کے رنگین بلبلوں کو توڑ کر رکھ دیا۔

شبرتیا ایک برق زدہ کی طرح کنوئیں پر واپس آیا اور پانی بھر کر منہ لٹکائے حویلی کی طرف گویا

کشاں کشاں چلا۔ حویلی میں بڑی بیگم نے شبر تیا کی آج غیر معمولی طور پر خبر لی۔

زمیندار کے دومنزلے کے رُخ پر ایک کھنڈر تھا جس میں دو بیر کے درخت اور چند بانس کی جھاڑیاں تھیں۔ گاؤں کے لڑکے اکثر آ کر یہاں جمع ہوتے تھے، کھیلوں اور شرارتوں کے پروگرام بناتے اور کبھی کبھار یہیں کچھ کھیلنے بھی لگتے تھے۔ بیر کے موسم میں پاس کے نیچے مکانات بیر توڑنے والے لڑکوں کے ڈھیلوں کی زد میں ہوتے ہیں۔

مچھلی کے شکار کے ایک ہفتہ بعد، ایک روز شبر تیا دومنزلے کے سائبان کے جنگلے سے لگا کھڑا تھا۔ اُس روز بھی زمیندار کا بچہ اُس کی گود میں تھا۔ سامنے کھنڈر میں بہت سے لڑکے جمع تھے۔ ایک جماعت لٹو کھیل رہی تھی۔ ایک ٹولی بیر کے درخت کے سایہ میں تاش سے شغل کر رہی تھی اور ایک تیسرا گروہ کبڈی کے کھیل میں مشغول تھا۔ غریب شبر تیا سکتہ کے عالم میں حسرت سے سب کو دور سے تک رہا تھا۔ خاموش، اداس، مضمحل، تھوڑی دیر میں لڑکے سب کھیل سے اُکتا کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور آپس میں کسی تازہ مہم کی کھچڑی پکنے لگی۔ کچھ ردوکد کے بعد بہ اتفاق رائے یہ طے پایا کہ بابو منظہر کے آم کے باغ کی طرف رُخ کیا جائے۔ اُسی کے قریب بابو جاگو سنگھ کا باغ بھی تھا۔ جیٹھ کے مہینے میں آم پک کر گرنے لگ جاتے ہیں اور نیم خام پھلوں کی تو کثرت ہوتی ہے۔ چلتے چلاتے عبدو، ابقر، عبیدوا اور رحمو نے شبر تیا کو دومنزلے پر دیکھ پایا۔ سب لڑکے اُسے پکارنے لگے۔ شبر تیا نے ایک ٹھنڈی سانس کھینچی اور کہا:۔

"ایک دن ہم بھی آدمی بنیں گے، ایک دن ضرور آوینگے اور خوب خوب کھیلیں گے، خوب خوب خوب"

وہ اس تخیل سے لذت لے رہا تھا۔ لڑکے سب چلے گئے اور اب اُن کے قہقہوں کی صرف گونج باقی رہ گئی۔ شبرتیا دور کھنڈروں کی طرف دیکھنے لگا۔ اُس کے دل کی ساری حسرتیں اُس کی بے آس مگر آرزومند نگاہوں میں آکر مرتکز ہو گئی تھیں۔ اس کے تصور میں تصویریں بن اور مٹ رہی تھیں اور اُس کی بے تاب روح اتھاہ بے کیفی کے سرد غار میں ڈوبتی جاتی تھی۔ اس کے جذبات دم توڑ رہے تھے اور اُس کا دل بیٹھا جاتا تھا۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انتہائی پسپائی اور شکستگی کے بطن سے انقلاب جنم لیتا ہے۔ کسمپرسی اور مظلومی کی خاکستر سے بغاوت کے شعلے بھڑک اُٹھتے ہیں۔ دوسرے روز بے بس اور بے زبان شبرتیا سب کی آنکھوں کے سامنے زمیندار کے گھر سے ڈرتا ہوا نکل کھڑا ہوا۔ وہ جا کر اپنے ہمجولیوں سے مل گیا۔ اُس نے ہر کھیل میں شرکت اور بے باکانہ شرکت کی۔ اس نے خوب کبڈی کھیلی۔ خوب لٹو نچائے، خوب خوب آم کے باغوں کو غارت کیا۔ چھُٹے ہوئے گھوڑوں پر چڑھا، تالابوں میں مچھلیاں مارتا رہا اور نہ جانے کس کس طرح اُس نے اپنی حسرت نکالی۔ اُسے نہ کھانے کی فکر تھی نہ پینے کا غم۔ وہ اپنے ماں باپ کے گھر بھی نہیں آتا تھا اور دن رات ہوا کی طرح آزاد رہتا تھا۔ دن پہاڑی پر اور باغوں میں کاٹ دیتا تھا اور راتیں [illegible] کے کھیل کود میں۔ شبرتیا کی طبیعت میں ایک زبردست اُبال آیا ہوا تھا۔ وہ غیر شعوری طور پر اُس دباؤ کا ازالہ کر رہا تھا جو اُس کی خواہشوں پر عرصہ تک ڈالا گیا تھا۔ اُس پر ایک ہیجان کی کیفیت طاری تھی ایک بحران کا عالم۔

بڑی بیگم نے برابر والوں کی وساطت سے شبرتیا کو گرفتار کروانا چاہا مگر وہ ہتھے نہ چڑھا۔ کامل ایک ہفتے شبرتیا اسی بحرانی حالت میں جیٹھ کی دوپہروں کی دھوپ میں مارا پھرا۔ نہ کھانے

کا ٹھکانہ نہ سونے کا سامان، اس غیر معمولی زندگی سے شبر تیا کو شدید بخار آگیا۔ اُس کے باپ نے اُسے ایک شام آم کے باغ میں بخار سے جلتا ہوا پایا اور اُسے اٹھا کر گھر لے آیا۔

شبر تیا کے بخار نے سرسامی رنگ اختیار کر لیا۔

"بڑی بیگم کے پنجے سے آزاد . . . نہیں نہیں ہم نہیں اُٹھیں گے، ہم خوب سوئیں گے . . . ماما میراں، بڈھی کتیا —— وہ میرا کیا کر سکتی ہے؟ ہم آزاد ہیں!! ہم خوب کھیلیں گے خوب! خوب!! خوب!!! اسلمتا! حکیمو! واہ دوست! ہم آزاد . . . چل کبڈی تارا سلطان گنج مارا . . ." شبر تیا سرسام میں بڑبڑا رہا تھا۔

تیسرے روز شبر تیا مر گیا۔ اُس نے زندگی کا آخری کھیل بھی کھیل لیا۔ اس کی حسرتوں کی مکمل تسکین ہو چکی تھی۔

اندھی نگری

دولت رام نئے زمانہ کا ایک ہوشیار کاروباری آدمی تھا۔ ہندوستان کے پرانے تجارت پیشہ لوگوں کی طرح بے علم و کم سواد نہیں بلکہ خاصا پڑھا لکھا۔ آئی۔ اے تک انگریزی بھی پڑھی تھی۔ مگر فیل ہو کر اس نے اپنا کاروبار سنبھال لیا تھا۔ موتی رام کی یہ دور بینی تھی کہ زمانہ کی ہوا دیکھتے ہوئے اس نے اپنے لڑکے کو تعلیم کی بو باس سے بے بہرہ نہیں رکھا۔ مگر آئی۔ اے پاس کرنے سے کیا حاصل۔ خاندانی بیوپار میں لگنے ہی سے لکشمی دیوی کی دیا کی امید تھی۔

دولت رام نے اپنے خاندانی کاروبار کو کافی وسعت دی تھی۔ اب اجناس کی آڑہت کے علاوہ آٹا اور چاول مل، کا غذ اور روئی کے گودام، نیز کتابوں کی ایک بڑی دوکان کا وہ بلا شرکت غیرے مالک تھا۔ دو تین سال سے دولت رام نے اسکول کی کتابوں کی طباعت و اشاعت کا

کام بھی شروع کر دیا تھا۔ ہر چند کہ وہ اس بازار کے مقابلہ میں نسبتاً نووارد تھی پھر بھی اپنی تعلیم اور ہوشیاری
کامرانی کے سبب اُس نے کئی پُرانے کاروباریوں کا ناطقہ بند کر رکھا تھا۔ نئی ملکی حکومت کی جدید تعلیمی
تحریکوں کے سلسلے میں اُس نے چارٹ اور ریڈریں مفت تقسیم کر کے حب الوطنی کا نمایاں ثبوت دیا تھا۔ یہ
اور بات ہے کہ حکومت کی چھپائی کے کام سے اسکے منظرِ عام سے ہٹکر بھارت سیوا کی قیمت نفع کے ساتھ
وصول لی تھی۔ بیوپار کے ہیر پھیر بیوپاری ہی جانیں تاہم اس کلجگ میں دیش سیوا بڑی قدر کی چیز ہے۔
دولت رام کی ہر جگہ عزت و منزلت تھی۔ کئی آشرم اُس کے طفیل سے چل رہے تھے۔ کئی سبھاؤں اور
سمتیوں کا وہ صدر تھا۔ دولت رام کے "ودیا بھنڈار" سے ایک ماہوار رسالہ ہندی اور اردو دونوں
رسم الخط میں نکلا کرتا تھا۔ اس کے مطالعہ سے صاف پتہ چلتا تھا کہ دولت رام کو اپنے ملک کی جہالت سے
بڑا دکھ ہوتا ہے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ جنتا کو تعلیم کا متوالا بنوانے اور انہیں کتابیں مہیا کرنے کا ٹھیکہ بلکہ
مطلق اجارہ۔ لے لینا چاہتا ہے۔ نئی نئی تجویزیں اور پرائمری ریڈروں کیلئے جدید ترین طریقے برتنے
کی فکر دولت رام کے قیمتی اوقات پر چھائی رہتی تھی۔ کم از کم اس کے رسالے سے یہی ظاہر ہوتا تھا۔ اس
مقصد کے حصول کیلئے ہزاروں ہزار روپے ماہرینِ تعلیم کی ذات پر بے دریغ خرچ کئے جاتے تھے۔
اسی وجہ سے ودیا بھنڈار کی کتابیں اور ریڈریں نہایت ہی اعلیٰ پایہ کی چیزیں تھیں۔ دولت رام کو
اگر افسوس تھا تو یہ کہ اسکولوں میں اس کی اول درجہ کی کتابوں کے ساتھ کمیٹی کے لوگ تیسرے درجے
کی چیزوں کی سفارش بھی کر دیا کرتے تھے اور اس کے نتیجہ میں ملک کے نونہال مکمل طور پر عصری
تعلیمی فائدوں، بہترین انتخابات اور بے مثال علمی پیشکش سے فائدہ اٹھا نہیں سکتے تھے۔ جیسے
جیسے دولت رام کا سالانہ نفع بڑھتا اور اس کے مختلف کاروبار کی وسعت و اہمیت میں اضافہ ہوتا

وہ بیوپار میں مرکزیت کا قائل ہوتا جاتا تھا۔ اُس کا عقیدہ تھا کہ حکومت کو غیر ضروری تجارتی مقابلے کا خاتمہ کر دینا چاہئے۔ اس سے دیس کا نقصان ہوتا ہے اور کاروباری خرچ بہت بڑھ جاتا ہے جس کی زد خریداروں پر بھی پڑتی ہے۔ غرض اُس کی یہ تمنا تھی کہ اس کی تجارت کے راستہ کے روڑے بالکل ہٹا دیئے جاتے۔ اُسے غصہ اور تعجب ہوتا کہ حکومت کیوں ان باتوں کو نہیں سمجھتی مگر دولت رام اس بات کو بھی ناانصافی تصوّر کرتا تھا کہ حکومت تجارتوں کو مرکزی حیثیت دیکر اپنے اختیار میں کرے۔ اس کے نزدیک اس سے ملک کی قوتِ کارکردگی اور چیزوں کی خوبی و نفاست میں گراوٹ آجانے کا یقینی خطرہ تھا۔ وہ کہتا تھا کہ حکومت کے افسر تو محض بھاڑے کے ٹٹو ہوتے ہیں اور اسی وجہ سے جب قومی حکومت نے متحدہ زبان کی ایک کمیٹی بنا کر ابتدائی تعلیمی کتابوں کو اس کے ماتحت کر دیا اور مصنفوں کو براہِ راست اُس سے سروکار رہنے کا خدشہ پیدا ہو گیا تو دولت رام در پردہ اس اسکیم کی سخت مخالفت کرنے لگا۔ اس کے روپوں کی مدد سے بہت سے فرقہ پرستی کے شاخسانے نئی کمیٹی کی مخالفت میں کھڑے کر دیئے گئے۔ وُہ تو پُرانی کمیٹی ہی کو اس سے ہزار بار بہتر سمجھتا تھا۔ ہاں تھوڑا خرچ زیادہ ہوتا اور حاجب و دربان کی خوشامدیں اور کیا؟ چھوٹے پونجی کے بیوپاریوں کو تو اس نے قریب قریب ختم کر ہی دیا تھا۔ بس یہی لالہ سری رام "قومی پریس" والے اور "دیش وِدیا پرچار" والے سیٹھ ہرگوبند داس جوڑ کے تھے دولت رام ان سے خار کھاتا تھا۔ اس نے اشاعت کے کاروبار کو سیٹھ ہرگوبند سے ملا لینا چاہا۔ لیکن ہرگوبند راضی نہ ہوا اور لالہ سری رام سے دولت رام کا توازن برابر تھا۔

"میلارام کی ماں! میلارام کی ماں!" ——— دولت رام انگڑائی لیتا ہوا آج صبح دیر سے بیدار ہوا۔ رات گئے تک وہ کاروبار کے الجھیڑوں میں پھنسا رہا تھا۔ ابھی ابھی اس کی بیوی اس کے خراٹے سن کر کمرے سے دبے پاؤں واپس چلی گئی تھی۔ چلتی ہوئی سڑک پر ایک گھڑگھڑاتی ہوئی لاری کے شور سے وہ جاگ اٹھا۔ اس کی آواز سن کر اس کی بیوی آ گئی۔

"کیا جی جاگ گئے؟"

"ہاں! لوٹے میں پانی تو لا! جلپان تیار ہے نا؟ آج مجھے بہت سے کام ہیں۔"

دولت رام نے پھر ایک زبردست انگڑائی اور دنداں نما جماہی لیتے ہوئے اپنی ڈھیلی اور بے ربط دھوتی کو درست کرنے کی کوشش کی۔

منہ ہاتھ دھو کر دولت رام پوریاں اور مٹھائیاں کھانے بیٹھا۔ گھر کے باورچی نے سوجی کا گرم گرم حلوا لا کر پیش کیا۔ میلارام کی ماں کھڑی پنکھا جھلتی رہی۔

"میلارام کی ماں! سنتی ہو؟ سیٹھ کرشن چند کا مونڈن کب ہے؟"

"اکادشی کے دوسرے دن برہمن نے بتلا رکھا ہے۔"

اچھا جب بھی ہو کہنا یہ ہے کہ بہو کو خوب گہنے پاتے سے لال پیلی کر کے لیجانا۔ کان میں ہیرے کا بڑا نگ۔ وہی جو میں نے کلکتہ سے اب کے لایا ہے۔ لوہے کی تجوری میں بند ہے۔ منیب جی سے منگوا لیجئو۔ سمجھیں اور ہاں تم بھی ..." دولت رام نے ذرا ہنستے اور نوالے فرو کرتے ہوئے بات جاری رکھی "... بھری سبھا میں سب پر بازی لے جاؤ تو بات ہے۔ آدمی ایسے ہی دنوں کے لئے کماتا کجاتا ہے نا۔ برادری اور جان پہچان کے لوگوں میں ناک اونچی رہے۔ ہری رام اور

ہرگوبند نے سمجھا کیا ہے۔ میری بہو کی گود بھرے تو چھٹی ہی میں وہ دھوم مچاؤں گا کہ یاد کریں گے اور اجی! اس طور سے نام بھی تو پھیلتا ہے۔ سری رام کا دھیان آتے ہی دولت رام سنجیدہ ہو گیا۔ اسے کمیٹی میں ریڈروں کے پیش کرنے کی آخری تاریخ یاد آگئی۔ اس نے جلپان جلد ختم کیا سیاہ و بالیدہ کھلی ہوئی توند کی سطح پر زلزلے کے سے آثار نمایاں ہوئے اور پھر دو تین گرجدار ڈکاریں۔ پیتل کی چھوٹی سی تھالی سے اس نے الائچی، لونگ اور سپاری لی اور انہیں چباتا ہوا باہر گدی کو چل دیا۔ دولت رام کی گدی پرانی وضع کی نہ تھی۔ میز کرسیاں لگی تھیں اور میز پر ایک ٹیبل فین اور دوسری جانب ٹیلیفون، کمرے میں دوسری میز سے لگا ہوا اس کا سکریٹری گپتیشور ورما بیٹھا ہوا کام میں لگا تھا۔ پاس ہی دوسرے کمرے میں پرانی وضع کا عملہ دری اور گدیلوں پر بیٹھا ہوا لکھت پڑھت میں غرق تھا۔ منیب جی اسی کمرے میں لوہے کی بڑی سی تجوری سے لگے بہی کھاتہ دیکھ رہے تھے۔ ان کی گدی کے پاس کچھ دور تک سرخ اکہ رنگا دیوار پر چڑھایا گیا تھا اور اس پر پنی کے سنہرے، روپہلے پھول چپکے ہوئے تھے۔ دولت رام کے کمرے کے باہر سامنے سیڑھیوں پر ایک نیپالی سپاہی مسلح کھڑا پہرا دے رہا تھا۔

دولت رام نے کھونٹی پر سے جاپانی سلک کا کرتہ اتار کر پہنا۔ سونے کے بٹن سلک کے ہم رنگ تھے۔ پنکھے کا بٹن دبا کر وہ گھومنے والی گدے دار کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے دفتی پر دبا کر کاشنگرفی قلم اٹھایا اور تیرہ ریڈروں کی تیاری اور ان کے منظور کرانے کا خرچ اور متوقع نفع کا حساب جوڑنے لگا۔

"اچھا تو چار کلاسوں کے لئے صوبہ بھر میں چالیس ہزار ریڈریں چاہئیں۔ سال بھر میں اتنی

کھپت تو ہو ہی جائیگی۔ چار آنے فی ریڈر ہر دو حصّہ کے حساب سے دس ہزار روپے ہوئے۔ تین ہزار کاغذ اور چھپائی کا خرچ، اور پیروی کا خرچ ؟ تین ممبروں کو ہزار ہزار اور دو کو پانچ پانچ سو کل چار ہزار بھگول (جغرافیہ) اتہاس (تاریخ) اور حساب کی ریڈریں تو داخل ہو ہی چکی ہیں اور یہ چوتھی۔ تو ایک ہزار پیروی پر خرچ پڑا۔ اور منظوری کے بعد ریڈروں کو چلانا۔ ہونہہ! ایک ساتھ کئی ریڈریں منظور کر دینی بھی کوئی انصاف ہے بس صرف پریشانی اور خرچ۔ اب اسکولوں میں اِن کی اُن کی خوشامدیں کرنی۔ یہ کمیٹی والے بھلے مانس نہیں۔ اچھا تو اس سیریز پر پانچ سو اور۔ پھر نام کا مول فی کلاس سو روپے۔ چار سو یہ ہوئے اور اوپر کا سو۔ یہ ایک ہزار ہوا۔ کل خرچ پانچ ہزار ہوئے اور آمد دس ہزار۔ نفع پانچ ہزار۔ تین سال تک بھی اگر ریڈریں چل گئیں تو پندرہ ہوئے، پندرہ ہزار۔ گپتیشور گپتیشور! کمیٹی میں ریڈریں داخل کرنے کی کونسی آخری تاریخ ہے؟"

"جی! ۲۵ اگست" گپتیشور نے جھٹ سے ڈائری دیکھ کر بتایا۔

بس بیس دن۔ اچھا ہو جائے گا۔ دیکھو آج ہی اُن تین ممبروں سے ہزار ہزار اور دو سے پانچ پانچ پر معاملہ طے کر لو۔ بھنڈار کی سب باتیں منظور ہوں۔ آدھا ابھی دے دینا اور آدھا منظوری کے بعد، سمجھے؟ "صاحب" کی آج ہی شام کو پارٹی ہے۔ ہوٹل کو فون کر دو کہ سب انتظام ساڑھے چار بجے ہی سے ٹھیک رہے۔ واپسی پر میں کاملیشور بابو اور کریم صاحب سے نام کے مول کے لئے مل لوں گا اور ہاں ترینی بابو سے بھی میں ملتا ہی آؤں گا۔ میں تو انہیں بھول ہی گیا تھا۔ سنا ہے وہ ایک مہینے سے بیمار ہیں۔"

"بہت اچھا" گپتیشور نے توجہ سے ساری باتیں سُنکر جواب دیا۔

دولت رام اپنی دی ہوئی پارٹی سے بہت خوش و خرم لوٹا۔ "صاحب" نے اس کی بہت تعریفیں اپنی تقریر میں کی تھیں اور اس کا شکریہ بڑے پُر جوش انداز میں ادا کیا تھا۔ اس شکریہ اور تعریفوں کی جذباتی قیمت کے علاوہ تاجرانہ اہمیت بھی تھی اور سچ تو یہ ہے کہ دوسری صورت دولت رام کے سے گرگِ باراں دیدہ کیلئے زیادہ اہم تھی اور یوں تو اس زمانہ شناس بیوپاری کے مزاج میں عام انسانی جذبہ کا پہلو بھی افادیت کے رجحان کیساتھ اتنی مضبوطی سے وصل ہو چکا تھا کہ اس کی کوئی لذت و مسرت اسوقت تک مکمل نہ ہوتی جب تک دونوں عناصر موجود نہ ہوں۔ برادری اور جان پہچان میں بھی وہ اسلئے ناک اونچی رکھنی چاہتا تھا کہ اس کا اشتہار ہو اور اسکی ساکھ خوب پھیلے اور مستحکم بنے۔ سماجی شہرت اور کاروباری اشتہار میں اس کے نزدیک کوئی خاص اَل بل نہ تھا۔ خیرات، نیک برتاؤ اور حسنِ سلوک کی وہ کوئی مطلق اخلاقی قدر نہیں پہچان سکتا تھا۔ دولت رام کے نزدیک یہ بھی سود مند یا نہیں ہو سکتی تھیں۔ "صاحب" کی پارٹی اس کیلئے مسرت و انبساط کا سرمایہ تھی۔ وہ اپنے موٹر پر خوب پھیل کر بیٹھا۔ خون کی موجوں اور رخساروں کے ابھار سے اسکی چھوٹی چھوٹی ہوشیار آنکھیں زیادہ اندر ڈوب گئیں اور اسکی توند کچھ اور ابھر آئی۔ راہ میں وہ کا بیشور بابو کے یہاں اترا اور اُنہیں لیکر کریم صاحب کی کوٹھی پر پہنچا۔ کچھ دیر تک تو پارٹی کی باتیں ہوتی رہیں۔ دولت رام نے "صاحب" کی مہربانیوں کو خوب بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔ موقع بے موقع اپنے انگریزی دانی کا ثبوت بھی انگریزی الفاظ استعمال کر کے دیتا رہا۔ کریم صاحب کے پاس ولایت کی ڈگری جو تھی۔

"مسٹر کریم صاحب! ہمارے پارک صاحب گریٹ مین ہیں گریٹ مین! اور اس پر ہم غریبوں، پُوا و دین کا اتنا خیال اور ٹاک، اتنے پریم سے کرتے ہیں صاحب، کابیشور بابو کہ

ونڈر فل"۔ کچھ اور تجربہ کارانہ تمہیدی گفتگو کے بعد دولت رام اصل مقصد کی طرف آیا۔

"بھلا آپ لوگوں کو اتنی فرصت کہاں کہ ان ریڈروں پر اپنا قیمتی وقت برباد کیجئے آپ لوگوں کا سنے تو بڑی بڑی باتوں اور ضروری کام ہیں بیتتا ہے۔ میرے لئے تو آپ لوگوں کا نام ہی بڑی چیز ہے آپ جیسے افسروں اور قابل آدمیوں کا نام ہی چھپنے سے میرا دلدر دور ہوتا ہے۔"

"سیٹھ جی میں آپکی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟ حاضر ہوں حکم ہو!" مسٹر کریم نے اخلاقاً کہا

"ابھی نہیں حضور! آپکی سیوا تو میرا فرض ہے۔ میں اپنی غرض سے آپ کی خدمت کرنے آیا تھا۔ کامیشور بابو بھی پرانے مہربان ہیں۔ بس ایک چھوٹا سا کام تھا۔ یہی ریڈروں کے بارے ہیں.... جی ہاں مسٹر کریم! سیٹھ صاحب اس صوبہ میں سکھشا اور ایڈوکیشن کے بڑے پالن کرنے والے ہیں۔ مجھ سے تو جہاں تک بن پڑا میں نے ان کی ہر دم سہائتا کی ہے.... اب کے یہ آپ سے بھی مدد لینی چاہتے ہیں...."

گھنا ذی حقیقت پر ریشمی چادر اڑھا اور ضمیر و انصاف کا نرمی سے گلا گھونٹ کر کچھ ایلینیر ویلنتر ے کے بعد مسٹر کریم ریڈروں پر اپنا نام کامیشور بابو کی شرکت کے ساتھ دینے کیلئے اس شرط پر راضی ہو گئے کہ انہیں ذرا دیکھ بھی لیں گے۔

مسٹر کریم کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ پھر تو مفت کے روپیوں کی چاٹ لگنے کی دیر تھی اور بس کامیشور بابو راہ و ہم منزل کے پرانے واقف کار تھے۔ دو دو سو روپلے فی کس پر نام کا مول ہو گیا ام۔ اے۔ ام۔ ای۔ ڈی اور ٹوپ اِن اڈ (لنڈن) کو خرید کر دولت رام خوش خوش موٹر میں آ بیٹھا۔ تھوڑی دیر میں اس کا شاندار موٹر ایک مبتذل سے فرسودہ و بدحال مکان کے سامنے

آ کر رکا۔ موٹر کے ہارن کی مسلسل آواز سنکر ایک مریل سا لڑکا پھٹی ہوئی دھوتی پہنے باہر نکلا۔

"تربینی بابو ہیں؟" دولت رام نے کار کی پچھلی سیٹ سے سر نکال کے دریافت کیا۔

"جی ہیں۔ بیمار ہیں مگر ہم اُن کو جا کر فوراً خبر دیتے ہیں۔"

لڑکا موٹر کی عظمت سے متاثر ہو کر بھاگتا ہوا اندر گیا اور جو واپس آیا تو تربینی بابو بھی نقاہت کے ساتھ اس کے پیچھے آتے ہوئے دکھائی دیئے

"اخاہ تربینی بابو، آپ نے کیوں تکلیف کی۔ مجھے بلوا لیتے۔ آپ بیمار ہیں کھیم کشل تو کہیئے اب تو شریر آنند سے ہے نا؟ مجھے آپ کی بڑی فکر تھی۔"

دولت رام نے اس پوچھ گچھ کی قیمت اچھی طرح سمجھتے ہوئے گفتگو شروع کی۔

"ایشور کی کرپا ہے۔ آپ کی دیا ہے، پہلے سے اچھا ہوں۔"

تربینی بابو کے جواب دیتے دیتے دولت رام موٹر سے اتر آیا۔ اُن کیلئے یہ باعث فخر تھا کہ سیٹھ دولت رام اُن کے گھر آئے۔ وہ ذرا تیزی سے کرسی لانے اندر گئے اور اُسے جھاڑ پونچھکر بچھایا اور خود بھی ایک لوہے کی میلی سی پرانی کرسی پر دولت رام کے مقابل بیٹھے۔

تربینی بابو ایک مقامی نجی اسکول کے ماسٹر تھے۔ ہندی کی اچھی جانکاری رکھتے تھے کم مشاہرہ کے سبب اُن کی چادر پاؤں سے ہمیشہ چھوٹی ہی رہتی تھی اور اس پر مشاہرہ ملنے میں بدنظمی۔ کسی طرح لڑکوں کو گھر پر پڑھا کر اور کچھ لکھ لکھا کر سفید پوشی نباہے جا رہے تھے۔ ایک مہینہ قبل ان کو پلیوریسی ہو گئی تھی اور اب تک وہ کمزور تھے۔ دو مہینے اسکول سے چھٹی لینی پڑی تھی۔ آدھے مشاہرہ پر۔ بیماری میں خرچ دوگنا اور آمد نصف۔ اور وہ بھی کام پر واپس جانے کے بعد۔ قرض

اور ادھار پر مشکلوں سے گذر بسر ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر نے مکمل آرام۔ وافر مقوی غذا، دودھ، مکھن اور پھل بتایا تھا۔ پروٹین، فیٹ، کیلسیم اور وٹامن، جنتا کی محنت کی طرح سستے داموں تو ملتے نہیں۔ تربینی بابو کی صحت ابھی تک خطرے سے باہر نہیں تھی۔

"بڑی کرپا کی آپ نے سیٹھ جی، کدھر آنا ہوا؟ میں آپ کی کوئی خاطر بھی تو نہیں کر سکتا" تربینی بابو واقعی رنجیدہ ہوتے ہوئے بولے "پان الائچی لاؤں؟"

"نہیں جی کوئی بات نہیں۔ مجھے ریڈروں کے وشے میں آپ سے بات کرنی تھی۔ آپ بیمار تھے یہیں ہی چلا آیا۔" دولت رام نے تمہید کی کوئی ضرورت محسوس نہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

"دیا ہے آپکی۔ ہم غریبوں کو یاد رکھتے ہیں آپ۔" تربینی بابو جذبۂ تشکر کے ساتھ بولے

"آخری تاریخ ریڈروں کے داخل کرنے کی پچیس ہے۔ آپ آج ہی سے کام میں لگ جائیے۔ ادھر آپ لکھتے جائیں۔ ادھر ریڈریں چھپتی جائیں۔ ذرا اچھے طریقے سے لکھئے گا اور زبان آسان ہو۔ زیادہ محنت نہیں ہے۔ ارے وہی پرانی باتوں، قصّہ کہانیوں کو الٹ پھیر کر لکھنا اور کیا۔" سیٹھ نے چالاکی سے کہا

"سیٹھ جی بالکوں کی سکشا بڑی کٹھن چیز ہے۔ اگر نئی روشنی میں ریڈریں لکھی جائیں تو کافی محنت کرنی پڑے گی۔ ایک دفعہ سچ مچ نئے نیم (قاعدے) سے لکھوائیے تو بہت اچھا ہو مگر وقت کم ہے۔" تربینی بابو نے سنجیدہ انداز میں جواب دیا۔

"آپ کیا باتیں کرتے ہیں تربینی بابو، ارے۔ ہم نے آپ نے، سبھوں نے اسی پرانی ڈگر پر چل کر ہی پڑھا لکھا نا۔ اب یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ قابل لوگ اپنی بدھی جتاتے پھرتے

ہیں ۔"

دولت رام نے محسوس کیا کہ یہ دلیل تربینی بابو کے دل کو نہیں لگ رہی ہے تو اس نے دوسری بات پیش کی۔ . . . "بھائی ان ریڈروں کی تجارت میں کچھ نفع ہے کہ کوئی اتنا سر کھپائے افسروں اور ممبروں کی پوجا کرتے کرتے تو دیوالہ نکل جاتا ہے۔ یہ مفت خورے! اور ہماری سرکار؟ ہائیں ہائیں ہیں۔ اندھی نگری چوپٹ راج، کنسٹ تو ہیں ہی اور جیب گرم ہو کرسی پر بیٹھنے والوں کی۔ اگر انہیں کوئی پبلیشر دے ہی نہیں کچھ تو" تربینی بابو نے ایک بات پیش کی۔

"یہی تو ہے۔ بس اندھا مقابلہ ہے سری رام ہیں، ہرگوبند ہیں اور بہتیرے۔ کس کس کو روکئے گا۔ مجھے جو سرکار اسکول کی کتابوں کا اجارہ دے دے تو پھر دیکھئے میں کیا سے کیا کر دیتا ہوں خیر چھوڑیئے ان باتوں کو، تربینی بابو آپ کو اس سے کیا فائدہ۔ وقت کم ہے۔ آج ہی سے کام کو ہاتھ لگا دیجئے۔ چالیس روپے آپ کے محنتانہ کے ہوئے منظور ہے نہ؟ اب کے آپ بیمار ہیں۔ پانچ روپے آپ کے پھل پھلاری کھانے کے لئے زیادہ دوں گا۔ مولوی صاحب سے اردو ریڈر میں مدد لینے کے لئے بھی پانچ روپے اور سہی، لیجئے پورے پچاس پر بات طے ہو جائے۔"

دولت رام نے فراخ دلی سے کام لیتے ہوئے ٹرم پیش کیا۔ بس تھوڑی سی دقت کو دور کرنے کی یہ سبیل تھی۔ تربینی بابو شاید بیماری کے سبب صرف چالیس روپے میں انکار کر دیں، تو دوسرا آدمی ٹھیک کرنا پڑے گا۔ پچاس پر کیا انکار کریں گے۔ بیماری میں خرچ بھی تو زیادہ ہوتا ہے سیٹھ کو اطمینان تھا

تربینی بابو خاموش تھے۔ وہ اچھی طرح سمجھ رہے تھے کہ اس کے سوا چارہ کیا ہے ریڈریں لکھ کر وہ خود کمیٹی میں پیش کرنے سے رہے۔ پیروی کا خرچ کہاں سے آئے گا۔ ڈاکٹر نے البتہ انہیں محنت کرنے سے منع کیا تھا۔ ایک مہینہ اور مکمل آرام۔

دولت رام سوچ رہا تھا ——— شام کی پارٹی۔ صاحب کی تعریفیں۔ ریڈروں کی منظوری، پندرہ ہزار روپے، سماج میں ناک اونچی۔ سونے اور جواہر سے لدی ہوئی لال پیلی بہو ——— شہرت اور ——— رات کے بھوجن میں حلوا اور تسمئی۔

تربینی بابو کے دماغ میں بھی خیالات منڈلا رہے تھے۔ مکمل آرام۔ محنت۔ قرض بلوں کی ادائیگی۔ کیلشیم اور وٹامن۔ بیوی کی پھٹی پھٹی ساریاں۔ پچاس روپے۔ پلیورسی تھائسس ریڈریں ——— اور ماندھی نگری ....

آخر انہوں نے دھیمی آواز میں کہا: "لکھوں گا سیٹھ جی"۔

دو مائیں

رات بھر بچہ روتا رہا۔ گوری اسے لاکھ چپ کرانے کی کوشش کرتی مگر اُس کا رہ رہ کے رونا بند نہ ہوتا۔ کبھی تو روتے روتے اسکی گھگھی بندھ جاتی۔ اُس کا ننھا سا نازک چہرہ تمتما کر لال بھبھوکا بن جاتا اور کبھی تھک کر خود وہ نڈھال سا ہو جاتا، منہ ہلدی کی طرح پیلا، گردن ڈھلک جاتی اور سانس تلے اوپر۔ پھر وہ بھوک سے تلملا کر بلبلانے لگتا اور وہی اضطراب۔ گوری کا کلیجہ اس وقت بالکل پھٹ جاتا۔ جب وہ ننھی سی جان اپنی معصوم، دردناک و ملتجی آنکھوں سے ماں کی طرف تکتی اور اُس کے پھول سے نازک لب بلکنے لگتے۔ گوری ایک اتھاہ درد، محبت اور قربان ہو جانے کے احساس سے بے چین ہو جاتی۔ وہ اپنی روح اور دل میں ایک قاتل خراش محسوس کرتی اس کا رواں رواں کراہ اٹھتا اور اُس کی آنکھیں اُمنڈ آتیں۔

پڑوسنوں نے اُسے مشورہ دیا تھا کہ دودھ اُتارنے کے لئے مسور کی دال گھی ڈال کر کھائی جائے اور بتیسے اور مُنگریلے کا لڈو۔ گوری کا دل چاہتا تھا کہ وہ بھولو کی خاطر دنیا بھر کے منگریلے اور مسور کی دال کھا جائے مگر سب کچھ سوچ کر اس کا جی بیٹھ جاتا اور وہ ٹھنڈی سانسیں بھرنے لگتی اس کی چھاتیاں خشک ہی رہیں اور آنکھیں پُرنم۔

بھگوان نے شادی کے کئی سالوں کے بعد گوری کی گود بھری تھی۔ بھولو نے بڑے مان منت چڑھ چڑھاوے پر جنم لیا تھا۔ چھٹھ میں اُس نے برت رکھی۔ درگا مائی کے چرنوں میں سر جھکایا اور کتنے سنت سادھوؤں کی سیوا کی، تب جا کر یہ مُنّا سا بھولو آیا تھا۔ اگر اس کی کوکھ ہری نہ ہوتی تو بد نصیبی کا گوری پر کتنا بڑا الزام آتا۔ بھولو بڑے ارمانوں کا تھا۔ ماں باپ کی پہلی اولاد۔ ہرنس اور گوری بھولو کی صورت میں اپنا نیا جنم محسوس کرتے تھے۔ زندگی اُن کیلئے بھولو کے دم سے زیادہ طویل، وسیع، گہری اور بامعنی ہو گئی تھی۔ وہ اس کی مبہم سی مسکراہٹوں اور بے نام سی کلکاریوں میں زندگی کے دُکھ بھول گئے تھے۔ گوری تو بھولو کیلئے اپنا پران بھی تیاگنے کے لئے تیار تھی۔ وہ اُس پر ہر وقت جان چھڑکتی رہتی مگر محض خواہش اور جذبۂ محبت سے تو سینے میں دودھ اُتر نہیں آتا۔ گوری تو چاہتی تھی کہ اُس کی چھاتیوں سے گنگا جمنا کے دھارے بہہ نکلیں۔ مگر چشمۂ زمزم کی جگہ اُس کے سینے ایک ویران ریگستان کی طرح تھے۔

بھولو قریباً دس مہینوں کا تھا۔ پار سال کی بھری برسات کے بعد یہ پیدا ہوا تھا۔ پار سال جب برسات کی بہار، دھرتی کا سہاگ اور کھیتوں کا شباب قائم تھا۔ آسمان پر حاملہ عورت کی طرح اُمڈے ہوئے بھرپور کالے کالے بادل اُٹھتے تھے۔ آہر لوکھر محبت سے بھرے ہوئے دل کی صورت چھلکتے

پڑتے تھے اور دھان کے کھیت نوجوان آنچلوں کی مانند لہراتے تھے۔ گاؤں کے کسان آنند تھے اور اُن کی مطمئن نگاہوں میں زندگی کی شیریں و خاموش لَے کے جلوے نمایاں۔ ماضی کے دُکھوں کو جلد بھول جانے والے اور مستقبل کی ممکنہ الم ناکیوں سے بے خبر سادہ لوح کسان حال کے سکھ چین کی توقع میں مگن تھے۔ بھدلو ایسی ہی شبھ گھڑی میں اس جگ میں آیا۔ ہربنس گوپ اندر دیوتا کی طرح نہال تھا اور گوری اپنے کو پاربتی دیوی سے زیادہ خوش قسمت سمجھ رہی تھی۔ خود دھرتی کا سارا جوش اور نکھار، اس کی پیداوار کی ساری شکتی اور اس کی فصلوں کی بہتات کا سارا غرور گوری کے رُوپ میں مشاہدہ کیا جا سکتا تھا۔ اُس کی بھری ہوئی گود کی وسعت میں آکاش اور پاتال، زمین و زماں سب گم ہوئے جاتے تھے اور اُس کی اُبلتی ہوئی ہنسی میں جیون کے مچلتے ہوئے مدھر دھارے مل کے راگ سُنے جاتے تھے۔ گوری نے ساری مانی ہوئی منتیں اتاریں اور گھر والوں نے سب رسمیں پوری کیں۔ ہربنس گوپ کے یہاں سال بھر بڑی دھوم دھام رہی۔

سال شفقِ شام کی مانند گذری ہوئی صدیوں کی تاریکی میں غائب ہو گیا۔ اساڑھ آیا مگر چنچل کنواریوں کی طرح بدلیاں نہیں جھومیں۔ ساون گذر گیا۔ لیکن لچکتے کولھوں والی سہاگنوں کی صورت ابر اٹھلا اٹھلا کر نہیں برسا۔ بھادوں بھی چلا گیا پر ساری دھرتی بیوہ کی طرح ویران، اُداس، بدحال پڑی رہی۔ شروع اساڑھ میں کچھ چھڑکاؤ ہوا تھا۔ کسانوں نے گھر کا غلّہ کھیتوں میں جا کر ڈال دیا۔ بھگوان جو ٹھہرے۔ بھاگ کو ابھاگ کر دینا اُن کا معمولی کرتب ہے۔ لیکن اس بدنصیبی میں خود انسان کا بھی بہت بڑا ہاتھ ہے۔ انسان بھگوان کی مورت ہے اور خود اپنا بھگوان۔ کچھ ہم بھی اپنا نصیب بناتے اور بگاڑتے ہیں اور ہم سب بلکہ یہ سارے دیس دیس کے انسان بلکہ یہ انسانیت

کاٹھاٹیں مارتا ہوا ساگر ——— اس ساگر میں خود بھگوان کا روپ جھلکتا ہے مگر شیطان بھی چوری چوری اس آئینہ میں اپنا بھیانک عکس ڈالتا ہے اور ساگر کی اَنگنت لہریں اس نحوست سے گدلا کر ایک دوسرے سے ٹکرانے لگتی ہیں۔

گاؤں کے سب کھیت ویران پڑے ہوئے ہانپ رہے تھے، ایک پیاسے بیل کی طرح کسان زمین کی خاطر آسمان سے لو لگائے تھے۔ ہل بیکار پڑے ہوئے کڑھ رہے تھے اور بیل اور دوسرے ڈھور ڈنگر چارہ اور گھاس کی نایابی کے سبب بیمار کتے کی مانند دبلا کر ہڈی ہڈی ہو گئے تھے، پسینے میں ڈوبے ہوئے دن، کھولتی ہوئی دوپہریں، اُمستی ہوئی راتیں۔ ٹوٹی ہوئی امیدوں کی لاشیں اپنے کاندھوں پر اٹھائے ہوئے تراش گذر جاتی تھیں۔ ہر دن آوارہ بادل کے ٹکڑوں کی بے معنی دوڑ دھوپ سے انگاروں پر لوٹتا تھا۔ پورب کی ہوائیں چلتی تھیں مگر گھٹاؤں کا کوئی پیام اُن کے لبوں پر رقص نہیں کرتا تھا۔ تین مہینے بیت گئے۔ تین تپتے ہوئے افسردہ و آزردہ مہینے۔ کسانوں نے دھان سے ناامید ہو کر مکئی بوئی تھی۔ لیکن یہ فصل بھی کچھ یونہی سی ہوئی۔ چھوٹے چھوٹے کسانوں اور نادار دہقانوں پر تو قیامت ہی گذر رہی تھی۔

ہرنس گوپ ایک معمولی سا کسان تھا۔ بیساکھ میں لگان ادا کر کے اُس کے پاس موری کا دھان اور جاڑے تک کھانے کیلئے مکئی اور کھساری یہ تین چیزیں رہ گئی تھیں۔ اساڑھ میں دھان کھیتوں میں چھینٹ دیا گیا مگر موری ہری نہ ہوئی۔ جب اُس طرف سے آس ٹوٹی تو اس نے زمیندار سے خوشامد کر کے کچھ جھینٹ کی زمین کڑے لگان پر لی اور اُس میں ہل جوت کر مکئی کے سونے کے دانے بوئے۔ یہ سونا بھی مٹی میں مل گیا۔ یہی نہیں جتنا بھی چھینٹا گیا تھا، اتنا بھی زمین

نے واپس نہ دیا ہوگا۔ اب ہربنس گوپ کے پاس صرف کھساری تھی اور اسی پر سال بھر گذران اور پھر بھگوان جانے پر سال برکھا ہو نہ ہو خبر آنے والے دنوں کے گھُپ اندھیرے میں کون جھانکے، لیکن یہاں تو آج کے دن بھی تاریک ہی تھی۔ سورج کی آنکھ شیوجی کی تیسری بھسم کر دینے والی آنکھ کی طرح شعلہ فشاں تھی۔ کھیتوں میں دھول اڑ رہی تھی۔ شمشان کی راکھ کی مانند۔ کھیتوں کی چتا کے ساتھ کسانوں کے ارمان بھسم ہو چکے تھے۔ گاؤں میں سوائے مہاجن اور شیطان کے اور کوئی خوش نہ تھا۔ ہر چہرے پر سکرات کی سی اداسی تھی۔ یہ دھرتی کے سپوت، کسان، یہ کھیتوں کی آبرو، مہابیر۔ جن کے بل مٹی سے سونا اگلواتے ہیں۔ بس موسم کی ایک چین جبیں سے ہلاک ہوئے جاتے تھے۔ ان کی شکتی، ان کے بل، ان کے دو بازو کو دیکھ کر یقین نہ آتا تھا کہ جو لوگ سات سال کے فراغت سے کھانے کا سامان ایک فصل میں اُپجا لیں وہ ایک برسات، محض ایک برسات کے نہ ہونے سے یوں بے آسرا ہو جائیں۔ پر تھا ایسا ہی۔

ہربنس گوپ ایک چھوٹی پونجی کا کسان۔ تھوڑے سے کھیت اس کے خود کاشتہ تھے۔ اُن سے اُس کے کنبے کا کام کہاں چلتا تھا۔ وہ زمینداروں سے لگان پر بھی کھیت لیا کرتا تھا۔ لگان، مالگذاری اور مہاجن کا قرض۔ سال بہ سال یہ تین مطالبات اس کے سر پر سوار رہتے تھے اور اب کے ستم بالائے ستم یہ قاتل خشک سالی! ایک بوڑھا باپ، دو چھوٹے بھائی۔ ایک نوجوان کنواری بہن، بیوی اور بچہ۔ یہ تھا ہربنس کا خاندان۔ ان کے علاوہ بھی اس کے گھر میں اور چند افراد تھے۔ ان کا تعلق بھی اس کنبہ سے بہت گہرا تھا۔ اس رشتہ کا چھور دور تک کنبے کی رگ رگ میں دوڑ گیا تھا۔ دہی دکھ سکھ کا تعلق، وہی کڑی محنت میں امداد باہمی۔ خاندان کے یہ جیون

ساتھی ایک گائے اور دو بیل تھے۔

کنبے کے سب لوگ کٹھنائی کا مقابلہ کرنے کیلئے چار و ناچار تیار ہو گئے تھے۔ جانور بھی حالات کو بھانپ لیتے ہیں۔ وہ بھی سڑے آدھا پیٹ کھا کر جی رہے تھے۔ گائے بچہ دینے والی تھی۔ شاید وہ آنے والے دنوں کی سوچ میں ہی نڈھال ہوئی جا رہی تھی۔ ہربنس کسی اتھاہ سوچ میں ڈوبا رہتا تھا۔ اپنے پڑتی کھیتوں کو دیکھ کر اس کے دل میں ہوک اٹھتی اور اس کی مایوس نظروں کے آگے سیہ بختی کے سائے ناچنے لگتے "کا ہوگا؟" بارہ مہینوں کی لانبی مدت اور گھر میں صرف چند من کھساری "کا ہوگا؟" یہ سوال ہر آن ہربنس کے سامنے رہتا۔ اتنے دم کھانے والے.... اور پر سال ملگجاری "لگان" "سود کیسے بھرا جائیگا" "سال بھر کا کھانا۔ کرجا ادھار بھی تو ملے کا آس نہیں۔ بھولو کی مائے لرکوری ہے۔ آدھا پیٹ کھا کر کیسے رہتیئے... بھولو بھوکا رہے ہے" بھولو کی بھوک کے تصور سے ہی گویا ہربنس کی آدھی جان نکل سی جاتی۔ "اوس چاٹ کر پیاس کا بجھے۔ لرکوری جب مات کو اپاسی رہے تو لرکا کو دودھ کہاں سے ملے"۔ اس پر دکھ کا ایک پرت اگرتا اور بیخودی میں اس کے لب سے تین چار بار "بھولو! بھولو!" نکل جاتا۔

ایک صبح کو رات بھر ڈکرتے ڈکرتے ہربنس کی گائے نے بچہ دیا جیسے مرے دھان میں پانی پڑ جائے۔ گوپ کے کھلائے ہوئے چہرے پر شادابی سی آگئی۔ وہ اپنی نیچی چھپر والی تنگ اور اندھیری سی کوٹھری سے انگنائی میں مسکراتا ہوا نکل آیا۔ اس کے پیچھے پیچھے گوری بھی تھی۔ بھولو کو گود اٹھائے ہوئے گوری کا چہرہ پکے ہوئے بیر کی طرح گدازا اور سرخ ہو رہا تھا۔ محض ایک سامنے کا آسرا، ایک نیا پیدا ہونے والا سہارا فاقہ زدہ، سوکھے ہوئے چہرے کو حیات کی

بالیدگی سے پُر کر دینے کو کافی تھا۔ دونوں اس خیال سے خوش و شاداں تھے کہ ان کے بھولو کو دودھ مل سکے گا اور اس کے معصوم کومل لبوں پر گم شدہ تبسم لوٹ آئیگا۔ نہ جانے دونوں نے بھولو کے اور اپنے متعلق کتنے حسین خواب دیکھ ڈالے ہوں گے، جن کے پاس کچھ نہ ہو۔ ان کے لئے تھوڑا بھی رُوح و دل کی منجمد گنگوتری کے دھاروں کو جگا دیتا ہے۔ ہربنس نے گئوشال کی کھپریل میں پہنچتے ہی گائے کی پیٹھ تھپ تھپائی اور مارے خوشی کے اس نے پکارا۔

"گوپال! گوپال! ہے رے گوپال! دوڑ کے آ! ہم موتی کو صاف کر رہے ہیں۔ نئیں بچہ کو دیکھ..... اِتو ربا رے! با چھا ہے گو رے۔ باپو کو جلدی کہہ۔ ای تیرے بھلوا کا با چھا ہو۔"

اور گائے نے اس خوبصورت تیور سے ہربنس کی طرف دیکھا جیسے وُہ کہہ رہی ہو، یہ ہے میرا بچھڑا۔ اس کے دَم سے مَیں بھی اس کنبے کی سیوا کر سکوں گی اور جب یہ جوان ہو گا تو تمہارے کھیتوں میں ہل چلائے گا، اُس کی زبانِ بے زبانی، اُس کے مطمئن انداز میں ایک شیریں سا پندار تھا۔ ایک بلند جذبۂ پیشکش۔ موتی سر اٹھا کر بولی ——— "گائیں! گھائیں!"

گوری کے دل میں بھی اسی قسم کی ایک آواز اُٹھی۔ گائے بچھڑے کو چاٹ رہی تھی۔ گوری نے بھولو کو اپنے سینے سے بھینچکر اُسے خوب چُوما اور دوڑی ہوئی اپنی نند کو اٹھانے گھر کے اندر چلی گئی۔ اس کے دل میں کلیاں سی چٹک رہی تھیں۔

"ارے گیندا! اٹھ نہ! جوانی کی نیند کی ماتی ہے نہ۔"

گوری نے گیندا کو گدگدایا اور خود ہی ہنسنے لگی .....

"اُٹھ! اُٹھ! اب کی جیٹھ میں تیرا گونا کر دیو۔ موتی کو بچھڑا ہو لئی ہے رے۔" گیندا ایک

جوان بچھڑی کی مانند دولتیاں مارتی ہوئی آخر اُٹھ بیٹھی۔ اُس نے بھرپور انگڑائی لیتے ہوئے مسرت اور متوقع استعجاب سے پوچھا۔

"موتیا کو باچھا ہوئیے بھوجی؟ میرے بھولوا کا باچھا، میرے بھلوا کا باچھا...."

گیندا ہرنی کی طرح اچھلتی ہوئی گئوہال کی طرف بھاگی۔ اُس کے دل میں مسرت کا چشمہ اُبل رہا تھا۔ چھوٹے سے پیارے بچھڑے اور اُس کی ماں موتی کو یکجا دیکھ کر گیندا کی روح میں عورت جاگ اُٹھی اور وہ عورت فوراً ماں بن جانے کی خواہش اور سرور سے جھوم سی گئی۔ گوری کی گود سے اُس نے بھولو کو جھپٹ کر چھین لیا اور اُسے بھینچ بھینچ کر پیار پر پیار کرنے لگی —— "بھولوا رے تیرا باچھا!" گیندا بیر بہوٹی کی طرح لال ہو رہی تھی۔

سوکھے اور تازہ گوبر سے اٹی ہوئی کھپریل میں دو چار پڑوسی بھی آ گئے تھے۔ موسم اور زمانہ کے تھپیڑے کھائے ہوئے دہقانی۔ یہ لوگ ہربنس کی خوشی میں شریک ہونے آئے تھے اور طرح طرح کے مشورے دے رہے تھے۔ گائے بچھڑے اور دودھ کے متعلق پاس پڑوس کی ایک لانبی سی عورت نے ہاتھ میں سیندور لایا اور موتی رانی کی پیشانی میں لگا دیا۔ اس یگانگت میں کیسا رس تھا۔ کاش ہمیشہ ایسا ہی ہوتا! یہ آری کے کٹ جانے ٹنڈ وا سے پانی بہہ جانے اور ذرا ذرا سی بات پر لاٹھیاں بھانجنے، سر پھٹول کرنے اور مقدمہ لڑنے والے کسان جب مل بیٹھتے ہیں تو ان کے پریم میں کیسا خلوص کیسی پاکیزگی ہوتی ہے۔ ان کی محبت پہاڑی جھرنے کی مانند شفاف اور نرمل ہے اور ان کی نفرت چٹانوں کی طرح سخت اور اٹل۔ بدبودار گئوہال میں یہ گاؤں کے بیٹے اور بیٹیاں سڑتے ہوئے گوبر اور اُمڈتے ہوئے بھوسے پر اس شان سے براجمان تھے جیسے کاؤنسل کی

مجلس بیٹھی ہو۔ مسئلہ حفظانِ مویشی پر نہایت سنجیدہ اور واقف کارانہ انداز میں رائے زنی اور بحثیں ہو رہی تھیں۔ ان کے وقتی میل ملاپ کے اظہار سے دھرتی کی آشائیں آنکھیں کھول رہی تھیں۔ اس پارلمان میں عورتیں جوان، بوڑھے سبھی شریک تھے۔ غرض ہمسایوں کیا گاؤں بھر کے لئے ایک گائے کا بچہ دینا نہایت اہم اور ہمہ گیر واقعہ تھا۔ اس واقعہ سے کھونٹوں سے بندھے اور ناد میں سانی کھاتے ہوئے بیل بھی متاثر تھے۔

ہربنس کا کنبہ چند ماہ سے کھساری کا گھاٹا یا ستو اور وہ بھی آدھا سودھا کھا کر بسر کر رہا تھا۔ موتی کے بچہ دینے کے بعد اور تنگی ہو گئی تھی۔ دودھار گائے کی دیکھ بھال ضروری ہے کم از کم ایک ہفتہ تو بچے والی موتی کو ورتا دینا تھا۔ نہیں تو اس کے بسکھ جانے کا خطرہ تھا۔ ہربنس کل کی امید پر آج سختی سہہ رہا تھا۔ ایک ہفتہ کے بعد بھینس کا دور ختم ہو جانے پر بگلے کے پروں جیسا سفید دودھ بھولو کے لئے میسر آئے گا۔ یہی آس تھی جو ہمت بندھا کر صعوبت برداشت کرنے کی طاقت بخش رہی تھی۔

رات بھر بھولو روتا رہا۔ گوری، فاقہ مست گوری کو نہ مسور کی دال میسر تھی اور نہ منگریلا جیسے آسمان کا دودھ خشک ہو گیا تھا۔ ویسے ہی زمین کی باشی گوری کی چھاتیاں بھی بے رس تھیں۔ ایک روز بھولو کو تھوڑا سا ستو چٹا یا گیا تو کئی روز تک اُسے دست آتے رہے۔ اب تو صرف موتی کے دودھ ہی کا آسرا تھا۔ رات بھر گوری اپنے بچے کو بہلاتی رہی لیکن بھوکا بھولو مچلتا، تلملاتا اور روتا ہی رہا۔ ہربنس کی نیند بھی اُچاٹ ہو گئی۔ اُس نے ارادہ کر لیا کہ کل صبح سے گائے کا دودھ بھولو کو دیا جائیگا بھینس کے ایک دو روز باقی تھے مگر ایسے کڑے سمئے میں کہیں سے دودھ

قرض بھی تو نہیں ملتا تھا اور بھولو، چند ماہ کا ننھا بچہ بھوک سے ایڑیاں رگڑ تا رہتا تھا۔

صبح ہو گئی۔ بھولو رو تا رو تا نڈھال ہو کر سو رہا۔ بیہوشی سی نیند، تھکاوٹ کا ردِ عمل ہربنس نے سویرے اُٹھ کر گائے کو سانی دی۔ اُس کی پیٹھ تھپتھپائی۔ اُسے چمکارا اور ٹھری لے دودھ دوہنے بیٹھ گیا۔ گوری کی آنکھیں رات بھر کہاں لگی تھیں مگر اس کے باوجود وہ تڑکے اُٹھی اور اُس نے دودھ کی ٹھری کو گوبتھے سلگا کر سوندھا رکھا۔ ہربنس گھٹنوں کے درمیان ٹھری رکھے ہوئے بڑی یکسوئی سے سر سر دودھ دوہ رہا تھا۔ گوری دہلیز پر کھڑی سَر سُر سَر سُر کی خوشگوار آواز سُن رہی تھی۔ وہ جلدی سے دودھ اونٹ کر اپنے بچے کو پلانا چاہتی تھی۔

"ہربنس گوپ!" اچانک گلی کی طرف سے ایک آواز آئی۔ گوری نے چونک کر اُس جانب دیکھا۔

"براہل جی! . . . . بڑا سویرے" گوری بولی

"درگہ جی سانجھ کو ڈیوڑھی پر آئے ہیں۔ جھنتھ جی کا حکم ہوا ہے کہ دس سیر دودھ اسامی سب کے یہاں سے ابھی لاؤ" پیادہ کاندھے پر تیل پلائی ہوئی بینتل کے مٹھ والی لاٹھی لئے ہوئے اکڑ کر بولا:۔

ہربنس نے بھی پلٹ کر دیکھا اور پیادہ کی باتیں سُنکر سکتے میں آگیا۔ گوری کا سر چکرا گیا اور اُس کا سارا بدن سنسنانے لگا۔

"براہل جی! ابھی دودھ تو پھینس ہے" ہربنس بولا۔

"بات بناتا ہے سالا۔ دودھ کلہے کو دوہ رہے ہو سالے تب" پیادہ ڈپٹا۔

"براہل جی! بچہ کے لئے" گوپ نے عذر پیش کیا۔

"سالے بچہ کے لئے، دُوہ جلدی سے سب دودھ! چرا کے اگر کچھ رکھے ہو تو . . .

مہنتھ جی کا حکم ہے۔ اب ہم ورور مارے پھریں؟" ماں، بہن، بیٹی کی گالیاں دیتے ہوئے پیادہ ہربنس گوپ پر جھڑ پتا رہا۔

بنواری سنگھ رام داس مہنتھ کا پیادہ تھا۔ بارہ گاؤں کا زمیندار، وشنو جی کے مندر کا مہنتھ علاقہ کا سرپنچ۔ رام داس کا ہر طرف طوطی بولتا تھا۔ مذہبی پیشوا اور زمیندار، گئو سیوا کا علمبردار۔ اُس نے کئی مندر بنوائے تھے اور گئو پالن کی خاطر ایک شاندار گئو شالہ تعمیر کر دیا تھا۔

بھلا کس کی مجال تھی کہ مہنتھ جی کے حکم سے سرتابی کرے مگر بچہ کے بھوکے خیال سے ہربنس اور گوری نے پیادہ کی بڑی منت سماجت کی لیکن لاحاصل بلکہ اُلٹا اثر ہوا۔

"سالے! تم کو روج ڈیوڑھی کے خرچ کے لئے سب دودھ دینا پڑیگا۔ ایک من دودھ سے وشنو جی کا چرن دھویا جاتا ہے اور پجاری سب کا خرچا الگ سمجھیو سالے؟"

گوری اور ہربنس کی روح فنا ہو گئی۔ ہربنس دودھ دوہتا رہا اور گوری بچے کے رونے کی آواز سن کر اندر چلی گئی۔ جب وہ واپس آئی تو بنواری سنگھ ٹھہری میں دودھ کے ساتھ ہربنس کو مہنتھ جی کی ڈیوڑھی پر لئے جا رہا تھا۔ گوری نے رو رو کر بہت فریاد کی لیکن پیادہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ رونا دھونا تو رعیتوں کا کام ہی ہے۔ ہر قدم پر اگر دل ہی پسیجا رہے تو پیادہ گری کیسے ہو، رام داس مہنتھ کا حکم کس طرح چلے، وشنو جی کے چرنوں کی سیوا کیونکر ہو۔ بنواری سنگھ کے لئے اب یہ باتیں پرانی ہو چکی تھیں۔

بچھڑا گائے کے گارے ہوئے تھن پر بیتاب ہو ہو کر مُنہ مار رہا تھا۔ آج دودھ کا آخری قطرہ بھی زبردستی دوہ لیا گیا تھا۔ آخر بیقرار ہو کر بچھڑا نچوڑے ہوئے لیموں کے سے تھن سے علیحدہ ہو کر چلّایا ——— " ماںںںھ! ماںںںھ!" گائے نے مایوس پھٹی ہوئی آنکھوں سے اپنے بچے کو دیکھا۔ اُن ماںتا کی ماری آنکھوں میں اتھاہ، درد اور محبت اُبل رہی تھی۔ گوری کا سینہ بھی شق ہو رہا تھا۔ بھولو بلک رہا تھا۔ بھوکا بھولو اور گوری ایک سوکھے ہوئے مردہ چشمے کی طرح تھی۔ اپنے بھولو کو دیکھ کر اُس کی آنکھیں گرم گرم آنسوؤں سے تر ہو گئیں۔ دُکھ اور ناکام ماںتا کے آنسو۔

دو بے بس مائیں اپنے بھوکے بچوں کو نامرادانہ تک رہی تھیں ٭

جونیئر

وُہ جونیئر وکیل تھا اور جونیئر کے معنی ہیں نچلی سیڑھی پر رہنے کے۔ وُہ دونوں ہاتھوں سے ترقی کی سیڑھی پکڑے لیٹا ہوا تھا۔ نظریں اوپر اُٹھی ہوئی، ہاتھ کانپتے ہوئے اور پاؤں ڈگمگاتے ہوئے۔ سیڑھی کے بالائی ڈنڈوں پر چڑھے ہوئے سینیئروں کی خاکِ پا کو چار و ناچار وُہ سرمۂ چشم بنا رہا تھا اور بہت سے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دِل سیڑھی کے ارد گرد کھڑے اس کی ٹانگیں کھینچنے کے درپے تھے۔ مگر وُہ سیڑھی سے چمٹا ہی رہا۔ کیا کرتا۔ سب سیڑھیوں کا یہی حال تھا لیکن باوجود سخت کوشش اور ناصیہ فرسائی کے وُہ کسی سینیئر سے اپنے آپ کو چپکا نہیں سکا۔ ممکن تھا کہ وہ اس طرح سینیئر کی ٹانگوں سے وابستہ ہو کر اوپر کھنچا چلا جاتا۔ فی الحال تو اُسے تن و تنہا ہاتھ پاؤں مارنا تھا۔ ایسا نہ ہو وُہ دھب سے نیچے گر کر بھیڑ میں کچلا جائے۔ اس کے ارد گرد، پہلو

بہ پہلو اور بہت سے جونیئر تھے جو اسی کی طرح لٹکے ہوئے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے اور چند سینئیروں کی ٹانگوں سے لگے ہوئے آہستہ اوپر بھی چڑھے جا رہے تھے۔

وہ ایک بوڑھے پیروی کار کا بیٹا اور ایک کھوسٹ جان بلب پنشن یافتہ پیشکار کا پوتا تھا۔ کچہری کے دشت کی سیاحی میں اسکی دو پشتیں گذر چکی تھیں اور پیشۂ آباء کی روایات کو زیادہ چمکاتے ہوئے وہ وکیل بن گیا تھا۔ بوڑھے پیروی کار نے کچہری، اجلاس اور وکالت خانہ کی آغوش میں اَن گنت خواب دیکھے تھے۔ اس کی تمناؤں نے فائلوں، مسلوں اور زرخیز مقدموں کی دنیا میں پرورش پائی تھی۔ لہٰذا اُس نے اپنی جوانی کے پہلے ثمر کو اعلیٰ تعلیم دلوا کر وکیل بنانے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا۔ پیروی کار نہایت ہی جز رس اور کفایت شعار انسان تھا۔ اُس نے اپنی کمائی کی کوڑی کوڑی جمع کی اور محض اس اعلیٰ مقصد کے لئے کہ وہ اپنے نونہال کو کالجوں کی تعلیم کے بعد اجلاسوں پر کبھی پھول برساتا اور کبھی شعلہ فشانی کرتا ہوا دیکھے اور پھر روپوں کی گرم بازاری! پیشکار صاحب کی دولت کے برتے پر وہ خود پڑھائی سے سبکدوش ہی رہا تھا۔ لیکن ان کی دولت بٹ بٹا کر اسے بس اتنی ملی کہ وہ زمینداروں کے مقدموں کی پیروی کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اس لئے کہ گھر کا آٹا گیلا نہ ہو۔ جیسے جیسے وہ راہ و رسم منزل سے باخبر ہوتا گیا۔ اس کے بٹوے کا منہ بند ہونے لگا۔ مگر اپنے مقصد کے حصول کے ذریعہ پر اُس نے کافی خرچ کیا۔ بیٹے کی تعلیم کا بوجھ وہ خوشی سے برداشت کرتا تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کو ہوسٹل میں رکھ کر آسائش کیساتھ تعلیم دلوائی۔ ہاں فضول خرچی کے خلاف وہ چھٹیوں میں اکثر وعظ بھی کر دیا کرتا تھا اور خرچ کے حساب پر کڑی نگرانی رکھتا تھا۔

آخر کار بیٹا وکیل بن ہی گیا۔ بڑی مشکل سے اس کی شادی بی۔ اے کرنے تک رُکی رہی۔ ورنہ نسبتیں تو پکے ہوئے بیروں کی طرح ٹپکی پڑتی تھیں۔ بی، اے پاس ہونے کے بعد ہی لڑکوں کے بازار بھاؤ میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ کئی لڑکیوں کے باپ تو قانون کی تعلیم کا خرچ بھی برداشت کرنے کو برغبت تیار تھے۔ لیکن پیروی کار تکمیل تمنّا کی راہ میں کسی کی دستگیری گوارا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ اپنے سپوت کو اپنے زور بازو سے وکیل بنانے کا آرزومند تھا۔ سارے جسم کی سوئیاں اُس نے خود نکالی تھیں تو آنکھوں کی سوئیاں کسی دوسرے کو وہ کیوں نکلنے دیتا۔ جب اُس کے بیٹے نے وکالت کا امتحان پاس کر لیا تو ایک پنشن یافتہ ڈپٹی صاحب کے گھر اُس کی شادی کی گئی۔ پیروی کار کو اونچے گھرانوں سے تعلق پیدا کر کے اپنے نام و نمود میں اضافہ کرنے کا خیال بھی تھا۔ لڑکے کو سسرال سے توقع سے کم روپے ملے مگر اثاثہ کافی ملا۔ نئی قطع کا سنگار دان جس میں جدید تراش کے حلبی آئینے جڑے ہوئے تھے۔ شاندار مسہری، میز، کرسیاں اور ڈرائنگ روم کا اچھا سا سیٹ۔ برتن باسن بھی خاصی تعداد میں اور سب سلیقے کے۔ ریڈیو کا خیال تھا مگر اس سے بہتر سنگر مشین سمجھی گئی۔ بغرض بڑی اچھی شادی ہوئی۔ باپ، بیٹا، عزیز رشتہ دار سب خوش تھے۔ پیروی کار نے سمدھیانے کے روپیوں کو جمع کرا دیا مگر جلد ہی قانون کی گراں قیمت کتابوں اور نظیروں کی خرید کے لئے ان کی ضرورت پڑی۔ بڑے حوصلے سے وکالت شروع کی گئی تھی۔

ہر چند کہ کسی سینئر کے ماتحت رہ کر کام کرنے کا فخر نوخیز وکیل کو حاصل نہ ہو سکا پنشن یافتہ ڈپٹی صاحب نے بھی داماد کی خاطر اپنے گذشتہ اثر و رسوخ کو بر سر کار لانے کی کوشش

کی مگر کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ ہر سینیئر صاف انکار تو کرتا نہیں تھا۔ مگر وابستہ داماں جونیروں کی بھیڑ بھاڑ جتلا کر عذر کر دیا تھا۔ تاہم نوخیز وکیل نے بڑی امیدوں کے ساتھ تن وتنہا اپنے پیشے کی ابتدا کر دی۔ ہاں خرانٹ وکیلوں کے درِ دولت پر سلام کرنے وہ اکثر حاضر ہو جایا کرتا تھا ایک کارواں تائید کی خدمتیں بھی حاصل کر لی گئیں اور اس کے بعد باپ بیٹا دونوں ہوائی محلوں کی تعمیر میں مشغول ہو گئے۔

نوخیز وکیل اپنے آفس میں گھومنے والی کرسی پر بیٹھتا۔ سامنے سکریٹریٹ ٹیبل پر خوبصورت چمکتی ہوئی شیشے کی وسعتیں، سلور کا صاف سا کیلنڈر، نفیس و رنگین پیپر ویٹ، سادے کاغذوں سے بھری ہوئی فلیٹ فائلیں، دفتین پر بے داغ جاذب، سلیقے سے رکھے ہوئے دو فاؤنٹن پن اور آبنوسی بک کیس میں موٹی موٹی قانونی کتابوں کے ہم پہلو رسکن، کارلائل، میکالے اور برک کے شاہکار ہوتے۔ کرسی پر پہلو بدلتے بدلتے وکیل اپنے پاؤں میز پر رکھ کر پھیل جاتا۔ میز گھڑی ٹِک ٹِک ٹِک ٹِک کرتی رہتی۔ شاندار الماریوں میں سنہرے حروف سے مزین رعب ڈالنے والی کتابیں فوجی باقاعدگی کے ساتھ ترتیب وار لائنوں میں آراستہ نظر آئیں جیسے کوئی فوجی دستہ چمکتے ہوئے لباس اور اسلحوں کے ساتھ "اٹنشن" کی حالت میں ہو۔ اس کے دماغ میں خیالات مارچ کرتے ہوئے آتے۔ بلکہ یوں کہئے کہ وہ خود خیالات کی پلٹنوں کو منظم کرتا، انہیں ساری دنیا کی فتح کے لئے روانہ کر دیتا اور فاتح جرنیل کی طرح فتوحات کے نشہ سے سرشار ہو جاتا۔ اس کا کمرہ عموماً خالی ہی رہتا تھا۔ خیالات میں کوئی شے حائل نہیں ہوتی یہ تصورات کبھی اس درجہ حقیقی بن جاتے کہ نوجوان وکیل خیال ہی خیال میں

تقریر و بحث کرتے ہوئے واقعی بلند آواز میں سرگرم ہو جاتا ——

"می لارڈ! بات یوں ہے کہ حقیقت کو چھپایا نہیں جا سکتا۔ صداقت چمکتے ہوئے سورج کی طرح روشن ہے۔ ظلم کی سیاہی لفاظی سے نہیں دھوئی جا سکتی۔ مرڈر مسٹ اسپیک! شیکسپیئر کا یہی خیال تھا کون شیکسپیئر؟ وہ جو فطرتِ انسانی کا راز داں تھا کہ خونِ ناحق چھپائے چھپ نہیں سکتا۔ ایک شاعر نے کہا ہے۔ اور می لورڈ! شاعر نباضِ حیات ہوتا ہے۔ ع

جو چپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا"

"جی حضور کیا حکم ہے؟" نابید نے کمرے میں آکر گھبرا کے پوچھا۔

"می لورڈ! میں آج ثابت کروں گا کہ میرے مؤکل کے بیٹے کا ناحق خون کیا گیا۔ سچائی خود ایک زبردست شہادت ہے!" وکیل نے میز پر مکا مارا۔

"حضور کا مزاج کیسا ہے؟" نابید نے چیخ کر کہا۔

نوجوان وکیل چونک اٹھا اور صورتِ حال کو سمجھ کر شرمندہ ہوا "کچھ نہیں! یونہی میں ایک کتاب کی عبارت کو زور زور سے پڑھ رہا تھا۔"

ایسے واقعات نابید کے علاوہ کئی بار خدمتگاروں کے ساتھ بھی پیش آئے۔ غرض گھر پر اسی طرح گذرا کی۔ دس بجے دن کو کچہری جانا ہوتا۔ اس کا اہتمام ۹ بجے سے ہی شروع ہو جاتا۔ چونیر وکیل گھر ہی سے سیاہ عبا پہن کر روانہ ہوتا۔ اسے پہنتے وقت وہ ایسا محسوس کرتا کہ یہ کوئی جادو کا چغہ ہے جسے پہنتے ہی وہ ترقی کی فضا میں پر لگا کر اڑنے لگے گا مگر وکالت خانہ پہنچتے ہی اس کے پرسمٹ جاتے تصورات کا بلبلہ پچک جاتا اور وہ گھم سم بھرے ہوئے کمرے

میں محض ایک جونیئر وکیل نظر آتا۔ ہر میز پر بھانت بھانت کے وکیلوں کے پرے کے پرے ہوتے۔ کچہری کا شور و ہنگامہ اور کس مپرسی بھی رعب ڈالنے والی چیزیں تھیں۔ وہ اس سمندر میں ایک قطرۂ ناچیز تھا۔ حجاب کے پسینے میں اس کی انفرادیت ڈوب جاتی۔ وہ کبھی گوشے میں ایک کرسی پر اپنی جگہ بنا لیتا۔ رفتہ رفتہ لوگوں کی جائزہ لینے والی نظریں اس سے ہٹ جاتیں اور وہ اطمینان کی سانس لیتا۔ تھوڑی دیر کے بعد لوگوں کو اس کی ہستی کا احساس تک باقی نہیں رہتا۔ اس سے اسے ایک گونہ تکلیف پہنچتی۔ وہ خیالات میں غرق ہو جاتا۔ اس مایوسی کی ٹھوکر سے اس کی شخصیت پھر ابھرنے لگتی۔ وہ سوچتا۔ وہ دن بھی آنے والا ہے۔ جب سارے وکلا کمرے میں میرے داخل ہوتے ہی بچھے پڑیں گے۔ ہر جگہ میرا طوطی بولے گا۔ ہر اجلاس پر میری دھوم مچ جائیگی۔ وہ اسی طرح سوچتا جاتا تا آنکہ شام ہو جاتی اور وہ اپنے تائید کے ہمراہ گھر لوٹ جاتا۔ رات کو وہ اپنے آفس میں بیٹھا قانون کی کتابیں الٹ پلٹ کر دیکھتا اور زریں مستقبل کے خواب۔

پیرزی کار اپنے بیٹے کا ذکر اب اس کا نام لے کر نہیں کرتا بلکہ ہر موقع پر "وکیل صاحب" کہہ کر اسے یاد کرتا۔ وہ اکثر وکیل صاحب کا تذکرہ کرتا رہتا۔ عزیزوں سے دوستوں سے ان سے اُن سے سب سے۔ اس طرح اس کے پندار کو تسکین ہوتی۔ وہ خواہ مخواہ بے بات کی بات میں بھی اپنے بیٹے کے ذکر کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور نکال لیتا۔ مقدموں کی بات ہو تو خیر ہے جو گفتگو کے موقع پر بھی "وکیل صاحب" تشریف لے آتے تھے۔ ریلوے ٹائم ٹیبل کے بارے میں بھی اگر بول چال ہو تو "وکیل صاحب" درمیان کلام میں یوں نکل آتے کہ: ٹائم ٹیبل۔ ہاں ٹائم ٹیبل۔ وکیل صاحب جب مڈل میں پڑھتے تھے تو انہیں ٹائم ٹیبل کا زیادہ حصہ زبانی یاد ہوتا تھا۔ شروع

ہی سے یہ ذہین اور ہوشیار رہیں"۔ یا یوں ——— "بھائی سفر میں آرام کہاں! ہاں سکنڈ فرسٹ کلاس میں تھوڑا بہت آرام مل جاتا ہے۔ اسی وجہ سے وکیل صاحب جب سفر کرتے ہیں سکنڈ کلاس میں ہی کرتے ہیں"۔ پیروی کار نے معقول طریقوں سے بھی اپنے بیٹے کا پروپیگنڈا کرایا۔ کچہری کے دلالوں سے اس کی پرانی ملاقات تھی۔ وہ وکالت کے پیشے کے سارے ہتھکنڈے جانتا تھا۔ اس نے خوب تگ ودو کی اور آئندہ ترقی کی آس لگائے صبر سے انتظار بھی کرتا رہا مگر وکیلوں کی تعداد ہی اتنی زیادہ ہو چکی تھی۔ کہ حق ناحق کے مقدمے کہاں سے اتنے آئیں کہ سب کی وکالت چمکے۔ انتظار کی مدت بہت طویل ہوتی جارہی تھی۔ تاہم باپ بیٹے دونوں بڑی بڑی امیدوں کے چراغ جلا رہے تھے۔

اب کچھ موکل جونیئر وکیل کو ملنے لگے۔ وہ دن اس کے لئے عید کا دن تھا جب پہلی بار دلال کی کوششوں سے اُسے ایک چھوٹا موٹا کام ملا۔ تاریخ بڑھانے کی درخواست پیش کرنے کو اُسے اجلاس پر حاضر ہونا تھا۔ جونیئر جوشِ مسرت میں گھبراہٹ اور حجاب کے اثرات سے بھی محفوظ رہا۔ اس پر ولولہ اور امنگ کا جذبہ طاری تھا۔ آج وہ اپنے کو صحیح معنوں میں وکیل محسوس کر رہا تھا۔ وہ پہلی ہی جست میں گویا مینار ترقی پر چڑھ گیا تھا۔ دنیا اور اُس کے بسنے والے اُسے حقیر نظر آرہے تھے۔ حاکم کرسی پر بیٹھا ہوا اُسے ایک ادنیٰ خادم معلوم ہو رہا تھا جس کا بس اتنا کام ہے کہ اُس کے حکم کی تعمیل کرے۔ اجلاس سے باہر آکر اُسے فیس کے دو روپے ملے وہ پھولا نہیں سما رہا تھا۔ دو روپوں کی حقیقت کیا تھی۔ وہ اس نادر تجربے کی سرمستیوں میں غرق تھا۔ نہایت ہی لاپروائی سے اُس نے دونوں روپے جیب میں ڈال لئے۔

"حضور! میری خدمت کا معاوضہ؟" دلال نے کہا۔

وکیل نے جھٹ سے ایک روپیہ نکال کر دلال کے بڑھتے ہوئے ہاتھ پر رکھدیا۔ اور مسکراتا ہوا وکالت خانہ کی طرف چلا گیا۔ وہاں وہ ایک فاتح کی طرح داخل ہوا اور سارے وکیلوں کو نظر انداز کرتا ہوا ایک محفوظ گوشے میں جاکر بیٹھ رہا۔ بیٹھے بیٹھے اُس نے اپنی بہت سے دیکھے ہوئے خواب پھر دیکھے اور کچھ نئے خواب بھی۔ اُس نے اپنی سرشار شباب بیوی کو دیکھا۔ اسکے پازیب کی جھنکار سنی۔ اس کی مسکراہٹوں کو شفق رنگین کی طرح پھولتے ہوئے دیکھا۔ اُسنے محسوس کیا کہ اس کی بیوی اُس پر فخر کر رہی ہے اور اُس کے جوشِ ستائش کی شدت کا اظہار ایک والہانہ سپردگی کی کیفیت سے ہو رہا ہے۔ نوجوان وکیل بہت دیر تک جاگتے ہوئے سپنوں کے رنگ برنگ جالے بنتا رہا۔ تا آنکہ شام کی آواز نے اُس کے سپنوں کے پرندوں کو خیال و تصور کے رنگین جزیروں کی طرف اڑجانے پر مجبور کر دیا اور وہ جوشِ انبساط میں ڈوبا ہوا گھر لوٹا۔

بوڑھا پیروی کار بھی باغ باغ ہو رہا تھا۔ اس کا بیٹا ترقی کی پہلی سیڑھی پر چڑھ گیا تھا۔ اُس کے خواب حقیقت بننے والے ہی تھے۔ اس خوشی میں اُس نے بیٹے کی تحریک پر بہو کو اُس کے میکے سے اپنے گھر بلوالیا۔ نوجوان وکیل کے دل میں بہار آگئی۔ اُسے زندگی کا ہر لمحہ بامعنی معلوم ہوتا تھا۔ اب اس کا پیشہ اس کے لیئے نئے ممکنات اور نئی مسرتوں کا حامل تھا۔ اپنی چھوٹی سی زندگی خود بنانی، اپنی دنیا کو آپ سجانا، کسی پیاری ہستی کیلئے جہدِ حیات میں مشغول ہوجانا پُرقوت بازو اور ارمان سے بھرا ہوا دل رکھنے والے ایک نوجوان کے لیئے حاصلِ حیات ہے۔ جونیئر وکیل مستقبل پر نظر جمائے آہستہ خرام حال میں متوقع کامرانی کا انتظار

کر رہا تھا۔ ہجومِ انبساط میں وہ تھوڑی سی بیزاری بھی محسوس کرتا تھا۔ اپنی نازپروردہ بیوی کے لیے وہ بہت کچھ کرنا چاہتا تھا۔ مگر کام اُسے اِکّا دُکّا ہی ملتا تھا اور جو فیس بھی اُسے ملتی وہ پیروی کار کے اُس مشورے کی نذر ہوجاتی ”بیٹیا! ہائی کورٹ میں نام درج کرانے کی فیس کے لیے روپے جمع کرو۔“

اس کی بیوی کے نجی خرچ کے لئے اس کے میکے سے روپے آجاتے تھے۔ وہ ابھی غیر رومانی مسئلوں کے سلسلے میں اپنے شوہر سے گھلی ملی نہ تھی۔ مگر نوجوان وکیل جب سنگاردان پر ”عمرِ خیام“ ”آئی سلما کریم“ ”ہزلن سنو“ ”کیلی فورنین پاپی“ وغیرہ آراستہ دیکھتا تو اس کے دل پر ایک ہلکی سی موہوم چوٹ لگتی۔ وہ چاہتا تھا کہ یہ سب چیزیں اس کی دی ہوئی ہوتیں۔ اُسے وہم ہونے لگتا کہ اس کی بیوی کی حسین نگاہوں میں اُس کے شکستِ پندار کے لئے کچھ ضربیں چھپی ہوئی ہیں۔ اس کے بہت سے عشرت بہ آغوش لمحات میں اسی نوع کے احساسات نے تلخی کی آمیزش کی تھی۔

اس کا نام ہائی کورٹ میں بھی درج ہوگیا۔ لیکن اب تک کام کا وہی عالم تھا۔ زیادہ تر ایسے لوگ جو نئے وکیل کی طرف رجوع کرتے جو کچہری کے چھوٹے موٹے کاموں پر کچھ بھی رقم خرچ کرنی نہیں چاہتے تھے۔ کوئی تھوڑا سا بھی جانا پہچانا مؤکل یوں تمہید شروع کرتا ... ”آپ کے سسر اور میرے چچا سے دانت کاٹی دوستی۔ ہم نوالہ اور ہم پیالہ۔ کیا وہ زمانہ تھا! اب ایسے لوگ کہاں جو دوستی کا خیال رکھتے ہوں! مگر جناب ڈپٹی صاحب بڑے وضع دار آدمی ہیں ......“

"آپکے نانا صاحب اور میرے دادا اپنے میرے پھوپھیرے بھائی تھے" کوئی شجرہ نسب سے ابتدا کرتا۔ اور سب کی انتہا یہ ہوتی کہ "آپ مجھ سے فیس کیا لیجئے گا" اور وہ بھی مانی الضمیر۔ جونیئر وکیل کچھ تو شہرت حاصل کرنے کے لئے اور کچھ مروت سے مفت میں کام کر دیتا اور یارانِ ہوشیار اس انداز سے رخصت ہوتے کہ انہوں نے ہی وکیل سے کام لے کر اُس کی عزت افزائی کی ہے زمانہ اسی طرح گذرتا رہا کہ مہینے میں دس پندرہ روپوں سے زیادہ جونیئر وکیل کو نہیں ملے اور وہ بھی اِس بُرے حال سے کہ کوئی مقدمہ باز کسی دلال کی سفارش سے اس پر عنایت کر دیتا وکالت خانے میں وہ روزانہ اپنی دوکان لگاتا مگر کوئی خریدار قسمتوں سے ہی اسطرف بھٹک کر آ نکلتا۔ جیسے کوئی طیارہ دھم سے زمین پر آ رہے، اسی طرح نوجوان وکیل کی آرزوئیں پر شکستہ ہو کر تلخ حقیقتوں کے دلدل میں آ گری تھیں۔ بوڑھا پیروی کار اِس ناکامیابی کا ذمہ دار اپنے بیٹے کو سمجھنے لگا اور رفتہ رفتہ اس کے خیال میں بیٹے کی نااہلیت مسلّم ہو گئی۔ بوڑھے پیروی کار کے لئے یہ بہت بڑا صدمہ تھا۔ بعض دفعہ ردِ عمل بھی عجیب طرح ہوتا ہے۔ وہ مقصدِ حیات میں ناکامیاب ہو کر اُس ہستی سے ہی برگشتہ ہو گیا جس سے وہ مقصد وابستہ تھا۔ پیروی کار کی منطق بہت سادہ تھی۔ زندگی میں وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو اس کی اہلیت رکھتے ہیں اور ناکامیابی اسکا حصہ ہے جو نا اہل ہیں۔ کامیابی کے فورمولا پر اس کا بیٹا پورا نہ اترا اور اس کے ارمان وتمنا کے خواب کاتک کے بن برسے ہوئے بادل کے ٹکڑوں کی طرح تتر بتر ہو گئے۔ پیروی کار بیٹے سے برگشتہ ہوتا گیا اور اسی تناسب سے اُس کے بٹوے کی باچھیں تنگ ہوتی گئیں۔ رفتہ رفتہ پیروی کار ازحد سخت گیر اور کوتاہ دست ہو گیا۔ ویسے بھی وہ کم مایہ آدمی تھا اور اب اُس نے اپنی کھوپڑی

بہت پونجی سختی کے ساتھ بچانی چاہی۔ پھر سب پر طرّہ اس کا چڑچڑا پن۔ نوجوان مگر ناکامیاب وکیل حوصلہ شکن بیزاری کے عالم میں زندگی بسر کر رہا تھا۔

جونیئر وکیل نے اپنی جدوجہد میں اضافہ کر دیا۔ تاہم نتیجہ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی وہ محض ایک جونیئر وکیل تھا اور جونیئر کے معنی ہیں نچلی سیڑھی پر ہونے کے۔ وہ دونوں ہاتھوں سے ترقی کی سیڑھی پکڑے لٹکا ہوا تھا۔ نظریں اوپر اٹھی ہوئی، ہاتھ کانپتے اور پاؤں ڈگمگاتے ہوئے۔ بے یار و مددگار، پیشہ ورانہ رقابتوں کا شکار، مگر وہ سیڑھی سے چپٹا ہی رہا کیا کرتا سب سیڑھیوں کا یہی حال تھا!

وہ ابھی ناکامیابی کی اُس منزل پر نہیں پہنچا تھا جہاں بے حسی میں نجات ملتی ہے۔ اس کا زخم ہنوز ناسور نہیں ہوا تھا۔ اس کا احساس سب سے زیادہ وہ اپنی بیوی کے سامنے بیدار ہوتا اسے بیوی سے جھجک محسوس ہوتی تھی۔ ہر چند کہ اس کی راتیں اپنی شریک حیات کی معیت ہی میں گذرتیں لیکن وہ ایسا کھویا کھویا سا رہتا جیسے وہ قریب ہوتے ہوئے بھی بہت دور ہے۔ اس کے لئے بیوی اُس کی ناکامیابی کا آئینہ تھی، اس کی ناکامیابی سے بے خبر۔ اُس کے پاس جب بھی وہ ہوتا وہ محسوس کرتا کہ کوئی کہہ رہا ہے "تم نے ناحق شادی کی۔ تم بھی کیا مرد ہو، نکھٹو، بیکار" اور غریب بیوی مایوس، مضمحل، دل شکستہ تھی۔ اب اس کا سنگار دان ویران تھا۔ اُس کا آئینہ اداس اس کی مسہری بے کیف۔

ایک دن نوجوان وکیل اپنے ویران آفس کی تنہائی سے گھبرا اُٹھا کچہری جانے سے پہلے زنانخانے میں جا نکلا اور چہرے پر نقلی شگفتگی کا غازہ مل کر بیوی کے پاس گیا۔ بیوی پھٹی

ہوئی چادر کو مشین پر سی رہی تھی۔

"کیسے اِس وقت اِدھر آ نکلے؟" بیوی نے فوراً کام بند کرتے ہوئے مسرت سے دریافت کیا۔ اس کے لہجے میں ایک دردمندانہ طنز بھی تھا۔ "میں دیکھنے آیا تھا تم کیا کر رہی ہو، بس یونہی" وہ نہیں جانتا تھا کہ جواب دے رہا ہے۔

"آپ تو ہر وقت مشغول رہتے ہیں، جب گھر آتے بھی ہیں تو کھوئے ہوئے سے ہر وقت مقدموں کی ہی فکر، دلیلیں سوچتے رہتے ہونگے۔ ایسی بھی کیا کام کی دھن!" بیوی نے شوہر کو غیر معمولی طور پر خوش دیکھ کر محبت سے گلہ کیا۔ وہ کیا جانتی تھی کہ یہ خوشی محض ایک عارضی پناہ ہے

"ہاں ٹھیک، مقدموں کی فکر، مقدمے، کچہری، ہاں مگر تمہیں تو خوش رہنا چاہیے، تم کیوں سست رہتی ہو، میں نے تمہیں خوش نہیں رکھا ۔۔۔ میں ۔۔۔ میں ۔۔" وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر چپ ہو گیا اور اُس کی نقلی مسرت شام کی آخری دھوپ کی طرح جو دیوار و در سے اچانک غائب ہو جاتی ہے، روپوش ہو گئی۔ اس کا ہلکا سا سایہ اس کے چہرے پر اب تک بے کسی سے منڈلا رہا تھا۔

"آج کل نمائش آئی ہوئی ہے۔ شام کو چلئے نہ وہاں دو گھڑی کے لئے دل بہل جائیگا۔ آپ بھی کام کرتے کرتے تھک گئے ہیں۔" بیوی نے شوہر کی افسردگی کو دور کرنے کے لئے کہا۔

"اچھا تم چلی جانا اکثر بیٹھی ۔ تم کہیں جاتی واتی بھی تو نہیں۔" شوہر نے بیوی کی دلدہی کی۔

"کوئی لے جانا والا بھی تو ہو!" بیوی نے شکایت کو تیکھا بناتے ہوئے جواب دیا۔

"بہت خوب! میں آج تمہیں لے چلوں گا۔"

جونیر وکیل نے دھڑلے میں جواب دے دیا تھا۔ اس جواب کے مطالبات اس پر اس طرح واضح ہوئے جیسے موت یاد آجائے۔

دس بجے وکیل کچہری روانہ ہوا۔ آج اس کی ناکامیابی کی ساری اُلم سامانیاں اس پر اس طرح برس رہی تھیں۔ جیسے کوئی سنگسار کیا جا رہا ہو۔ سڑک پر کے روڑے اس کے جذبات میں گڑ رہے تھے۔ وہ ایسا محسوس کر رہا تھا کہ ٹم ٹم گاڑیاں، موٹریں، اسکے سینے پر چل رہی ہیں راہ گیر اُسے منڈلاتے ہوئے بھوتوں کی طرح معلوم ہو رہے تھے۔ چہرں سے اُسے نفرت سی محسوس ہو رہی تھی۔ ہر شے اس کا منہ چڑا رہی تھی۔ وہ اپنے کندھوں پر ہوا کا بوجھ تک محسوس کر رہا تھا کبھی اس کا دماغ خیالات سے بری ہو جاتا بالکل معطل۔ اور کبھی خیالات اِس طرح ہجوم کر کے آتے جیسے کسی تنگ گلی سے بہت سے بلوائی گزر رہے ہوں "نمائش" یہ لفظ اس کے لئے پیامِ مرگ تھا۔ اسکی جیب میں ایک پھوٹی کوڑی تک نہیں تھی۔ گھر پر ایک دھیلا نہیں اور کچہری سے کوئی امید نہیں۔ جونیئر وکیل چلا جا رہا تھا، مایوس، بیزار، اداس، بازار میں اُس نے ایک بندر نچانے والے کو دیکھا۔ اس نے سوچا "کاش میں وکیل کی جگہ ایک قلندر رہی ہوتا۔ بندر تک ہونا بھی ناکامیاب وکیل ہونے سے بہتر ہے" اُس نے ایسا محسوس کیا کہ نمائش گاہ بندروں کے ناچ کا بہت بڑا اکھاڑا ہے۔ اور وہ اس میں ناچنے والا ایک بڑا سا بندر "ڈگ ڈگ ڈگ ڈگ" بندر والے نے ڈگڈگی بجائی۔ سڑک پر کتے بھونکے، لڑکوں نے شور مچایا، جونیئر وکیل کے دل میں ایک عجیب سی خواہش پیدا ہوئی۔ اسکا دل ناچنے کو چاہ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر مجنونانہ ہنسی کے آثار پیدا ہوئے۔ وہ ایک زور کا قہقہہ لگانے لگا تھا محض اس لئے بچا کہ اس کی توجہ دوسری طرف پھر گئی ——— "یہ ہمالیہ کی جڑی بوٹیوں

سے بنائی ہوئی دوا ہے۔ بارہ برس گنگوتری اور بارہ برس نندا دیوی کی برفانی گپھاؤں میں ایک سادھو مہاتما نے جوگ سادھا تب رشی کیش میں اُسے آکاش بانی ہوئی۔ یہ دوائی انہیں سادھو مہاتما کے چرنوں کی سیوا سے ملی ہے۔ بھائی لوگ غور سے سنیں! مرگی، بواسیر، کنٹھ مالا، سوزاک، گرمی، کوڑھ، پرانا بخار، کالا آزار، ہیضہ، چیچک، پلیگ، باؤ گولا، زخم ناسور، سانپ کا کاٹا، بچھو کا ڈنک، پرسوت کی بیماری، کمر کا درد، گٹھیا، کون سا روگ ایسا ہے جس کا یہ علاج نہیں۔ بھائی لوگ! فائدہ نہیں ہونے سے پیسہ واپس۔ اور بغیر ورزش کے کچھ لابھ نہیں . . . ." وکیل کچہری کے احاطہ میں داخل ہو رہا تھا۔ پیپل کے درخت کے نیچے ایک سڑک حکیم مسلسل ڈاکٹر گوئبلز کی طرح پروپیگنڈا کر رہا تھا۔ اسکے چاروں طرف ایک خلقت حلقہ باندھے کھڑی تھی۔ وکیل بھی غیر ارادی طور پر وہاں کچھ دیر کیلئے کھڑا ہو گیا۔ جب سڑک حکیم کی تقریر ختم ہوئی تو حلقہ سے نکل کر ایک شخص نے یہ کہتے ہوئے کہ ایک ہفتہ ہوا کہ اس نے دوائی لی تھی جس سے بہت فائدہ ہوا، مزید دوا خرید لی۔ پھر تو دھڑا دھڑ پیسے برسنے لگے۔ جونیئر وکیل کے منہ میں پانی آ گیا۔ کاش وہ بھی سڑک حکیم ہوتا۔ یہ سوچ کر وہ اتھاہ مایوسی کے تاریک کنوئیں میں ڈوب گیا۔ اس کا سر چکرانے لگا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا اور اس اندھیرے میں "نمائش" کا لفظ اُسے سانپ کی طرح گھور رہا تھا۔

"اجی وکیل صاحب! کیا کر رہے ہیں آپ یہاں؟" ایک دلال کی آواز سے وکیل چونکا۔ اُسے حجاب کا پسینہ آ گیا۔

"کچہری ہی آ رہا ہوں۔ ذرا یونہی کھڑا ہو گیا۔ ان فریبیوں کو دیکھو۔ گنواروں کو کیسا ٹھگتے ہیں..."

وکیل مسلسل اپنے دل کا بخار سڑک حکیموں کے خلاف نکالتا رہا۔ ناکامیاب کامیاب سے عموماً جلتے ہیں۔

وکیل نے روز دلال کی بہت خوشامدیں کیں۔ اتنی کہ گرگِ باراں دیدہ موٹے چمڑے والے دلال کا دل بھی پسیج گیا۔

سہ پہر بھی ڈھل چکی تھی۔ کچہری کا شور و ہنگامہ کم ہو رہا تھا۔ پیپل کے درختوں کے نیچے کی آبادی گھٹ رہی تھی۔ "اب حاضر ہو!" کی آوازیں بھی معدوم تھیں اور سڑکوں کی دھول کل تک کے لئے آرام لینے نیچے بیٹھ رہی تھی۔ جونیئر وکیل وکالت خانہ کے برآمدہ پر ٹہلتے ٹہلتے جب تھک گیا تو کچہری کے احاطہ میں یوں ٹہلنے لگا جیسے کوئی غریب بھوکا اور دردر کا ٹھکرایا ہوا کتا اپنی دُم سکیڑے اور سر جھکائے ہوئے چلتا ہے۔ سامنے سے دلال ایک نوجوان کو لئے آتا دکھائی دیا۔ جونیئر وکیل اس طرف لپکا جیسے کوڑے کے ڈھیر کی طرف گرسنہ کتا لپکتا ہے۔

"کیا ہے بھائی نجابت! کوئی کام لائے ہوئے" وکیل نے گھبرا کر دریافت کیا۔ "ہاں وکیل صاحب یہ حضرت اپنی سند کھو بیٹھے ہیں۔ بی۔ اے کی شاید۔ اب نوکری میں درخواست دے رہے ہیں۔ یونیورسٹی سے سند لینے کے لئے "آفی ڈیوٹ" کرانا ہے۔ بس آپ جانئے اور یہ" دلال یہ کہکر چلا گیا۔

چلئے وکیل صاحب سکھدیو بابو ڈپٹی مجسٹریٹ کے اجلاس پر "آفی ڈیوٹ" کرا دیجئے یہ رہی آپ کی فیس" موکل نے چونی وکیل کی طرف بڑھائی۔ وکیل مبہوت رہ گیا۔ اور وہ مجسم احساس درد تھا۔

"اجی وکیل صاحب جلدی! اجلاس اٹھ نہ جائے۔ . . . . . بیس مختار صاحب سے اب تک کرا لیتا آفی ڈیوٹ۔ میاں نجابت مجھے یہاں لے آئے۔ چونی پر بہتیرے راضی ہیں۔ آپ کو کیوں تردد ہے؟ آیئے چلئے!" موکل کو بس اپنے کام کی عجلت تھی۔ وکیل کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ کہ

وہ اتنا نیچے اتر رہا تھا کہ اُس کی شخصیت لرز اُٹھی۔ مگر حقائق کے مطالبہ کے سامنے اُسے جھکنا پڑا اس کے دماغ میں بہت سے خیالات آئے۔ اُس کے دل میں بہت سے احساسات نے نشتر لگائے۔ آخر ش سنجیدہ صورت منطق نے اُس کی دستگیری کی "کم از کم نمائش جانے اور وہاں سے واپس آنے کے لئے رکشا کے کرائے تو ہو جائیں گے۔" یہ سوچ کر چونیر وکیل موکل کو لیکر اجلاس پہ آفی ڈیوٹ کرانے چلا گیا اور چوّنی اس کی جیب میں اکلوتے بچّے کی طرح چھپتی بنی ہوئی آرام کر رہی تھی ؎

تاخیر

وہ نسلاً ہندوستانی مسلمان، سیرتاً عہدِ حاضر کے نوجوان اور عادتاً اینگلو انڈین تھے بلکہ درتہ سیرت اور عادت کے امتزاج سے ایک استوار شخصیت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ ترکیبِ شخصیت کے نامکمل ہونے کے سبب ڈاکٹر کریمی سے زیادہ تر بے جوڑ حرکتیں سرزد ہوتی رہتی تھیں۔ ابھی وہ اچھے خاصے بھلے مانس ہیں، اور ابھی دست بر سینہ نظر بر لب بامے، قسم کے رومانی اور پھر گھڑی بھر میں تکلیف وہ نوعیت کے دیسی صاحب۔

خود ڈاکٹر کریمی کے لئے ان کی سیرت بلائے جان تھی۔ میڈیکل کالج کے شفاخانے میں وہ "ہاؤس مین" تھے۔ ڈاکٹری کی ڈگری لے کر وہ اسپتال کے وارڈوں سے ایک سال کے لئے تجربے

حاصل کرنے کی غرض سے وابستہ ہو گئے تھے۔ ڈاکٹری ملازمتوں کا عنقا ہونا اور ڈسپنسری کھول بیٹھنے کے لئے روپوں کی نایابی بھی عموماً ایسے تجربوں کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ بہر حال ڈاکٹر کریمی تجربے حاصل کر رہے تھے۔ ان کے افسر تو ان سے ایک گونہ خوش تھے۔ پر کبھی کبھی یہ حضرت ذرا بے موقعہ حالتوں اور دلچسپ کیفیتوں میں پکڑے لئے گئے تھے۔ یہ تو عہدِ حاضر کی زرّین رواداری کا صدقہ تھا۔ کہ اس کے سہارے کریمی بچ نکلا کئے۔ اسی اصول کے طفیل اور بھی بیم موج و گرداب سے کھیلنے والوں کی کشتی سبکساری ساحل حاصل کرتی رہتی تھی۔ کریمی کی سلامتی کوئی انوکھی سلامتی تو تھی نہیں کہ وہ پھر شبِ تاریک سے فائدہ نہ اٹھاتے۔ وہ ہندوستانی نرسوں کے دراز گیسوؤں سے کھیلتے تھے اور انگلو انڈین نرسوں کی "زلفِ مختصر" کے لئے ترستے رہتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ چشمِ ازرق کے بسمل تھے۔ کریمی مریضوں اور ماتحتوں کیلئے بالکل صاحب تھے بلکہ عرش نشینی میں اُن سے کئی آسمان اونچے۔ اپنے کردار کی نااستواری کے سبب کبھی وہ گرم رہتے اور کبھی نرم۔ یہ نرمی اور گرمی یوں تو ان کے لئے عام طور پر اچھی چنداں نقصان رساں نہ تھی۔ لیکن جب یہ افتادِ طبع عملی زمان کے میدان میں جلوہ گر ہوتی تو ڈاکٹر کریمی ایک مضحکہ انگیز چیز بن کر رہ جاتے۔ سفید فام نرسوں کی لطیف چالوں کے وہ بہت جلد شکار ہو جاتے تھے اور ان کی رہزنِ تمکین و ہوش اداؤں کی یلغار کے سامنے بالکل بودے نظر آتے۔ یہی کیفیت کریمی کے لئے بلائے جاں بنی ہوئی تھی۔

ایک دفعہ کریمی اشتاف مارتھا کے متعلق مغالطے میں مبتلا ہو گئے۔ مارتھا کی عمر چالیس سے بالا ہی ہوگی۔ مگر چاق و چوبند رہنا جوانی کی شباہت کا ایک حد تک ضامن ہو جاتا ہے۔ مارتھا نوجوان شکاری سے باز آچکی تھی۔ ڈاکٹر کریمی سے اس کی ملاطفت محض طبیعت کی نیکی کی بنا پر تھی۔

ہوسکتا ہے کہ جذبۂ مادری کے دفور کا ایک ہلکا سا پرتو بھی اسکے ساتھ شامل ہو۔ بس اسی ملاطفت سے کریمی نے ذہنی طور پر بات کا بتنگڑ بنالیا۔ وہ سمجھے کہ عین خوش نصیبی سے ایک سفید پری نے انہیں گلفام بنالیا ہے۔ آخرش ایک رومان خیز شام کو انہوں نے اظہارِ تمنا کرہی دیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ڈاکٹر کریمی! میری ایک لڑکی 'کانونٹ' میں پڑھتی ہے۔ میں تمہیں اس کا نام بتاتی ہوں وہ تمہاری بے قرار آرزوؤں کے لئے زیادہ موزوں ہوگی ۔ ۔ ۔ "

یہ اسٹاف مارتھا کا حماقت شکن جواب۔ مگر کریمی یہ سمجھے کہ ایک نشانے میں دو شکار ہوگئے اس واقعہ کے بعد زمانہ تک حضرت نرسوں کے درمیان 'الو' بنتے رہے۔ مارتھا نے راز فاش کردیا تھا۔

نرس مارلین ان دنوں برقِ تجلّی بنی ہوئی تھی۔ اس کی کافر نگاہوں کی ظاہراً حسین معصومیت، اسکا اچانک چنچل پن، اسکی نقرئی آواز کا رس۔ اسکا معتدل صبیح رنگ، اسکے جسم کا ارمان خیز گداز۔ یہ سب چیزیں مل کر ایک محشرِ خراماں برپا کرتی تھیں۔ کونسا دل تھا جو مارلین کے نام ہی سے دھڑک نہ اٹھتا ہو۔ اور ڈاکٹر کریمی تو اسے اپنی تمناؤں کی دنیا کی ملکہ سمجھتے تھے۔ مارلین کی یہ فطرت تھی کہ وہ زیادہ سے زیادہ پروانوں کو اپنی محبت کی آگ میں جلانا چاہتی تھی۔ شاید وہ شمع کی طرح جلنا بالکل جانتی تھی۔ اسی وجہ سے وہ عشقِ جنوں پرور کے تماشے نہایت سکون سے دیکھنے کی عادی تھی۔

مہینوں "انتظار" کھینچنے کے بعد کریمی سے مارلین ذرا ملتفت ہوئی۔ کریمی نے تحفہ تحائف کی بارش کردی اور اپنے لئے بھی انہوں نے کئی نئے سوٹ بنواڈالے۔ کامرانیٔ محبت کی منزل ابھی تک اسپتال کے وارڈوں ہی میں تھی۔ جائز و دزدیدہ فرصت کی گھڑیوں میں کریمی مارلین کے وارڈ کی طرف جانکلتے تھے۔ "آئیڈوفارم"، "ٹنکچر آیوڈین" اور دوسری دواؤں کی بو کے ساتھ "الشیز آف رنز" اور

"ایوننگ اِن پیریس" کی بو بھی مل جاتی تھی۔ ہر لعنیوں کی کراہوں کے ساتھ قہقہے بھی وصل ہو کر قماش حیات کی نیرنگی میں ایک عجیب تنوع پیدا کر دیتے تھے۔ مگر تاحال عشق فداکار کو خلوت حسن میسر نہیں آئی تھی۔

آخرش ایک روز ڈاکٹر کریمی کی التجائیں کامیاب ہو گئیں۔

"کریمی ڈیر! کل میری ایوننگ اوف ہے۔ یہ شام سیر و گلگشت میں بسر ہو سکتی ہے فلٹن پر پولو فیلڈ پھر کلفٹن اور اس کے بعد سینما ——— نہیں اِن دنوں موسم بہت خراب ہے۔ پولو فیلڈ نہیں صرف 'ہیر بلڈ اِنز' اور فلم۔ ہے نا ——— کیا تم دل شکستہ ہو گئے؟"

مورسین نے نہایت ہی شیریں انداز میں ان کلمات کی بارش کی۔ کریمی کے لئے یہی بہت تھا کہ مارسین کے پہلو میں کچھ گھنٹے گذر جائیں۔ شوق فراواں کے باوجود وہ پولو فیلڈ کی نفی کو بادل ناخواستہ برداشت کر گئے۔ مارسین نے محض کریمی کے شوق کو بھڑکا کر نا کامیاب بنانے کے لئے پولو فیلڈ کا تذکرہ کیا تھا۔ جذبات سے کھیلنا کافر ماجراحسینوں کا مرغوب شغل ہوتا ہے۔

میں اپنے کو دنیا کا سب سے زیادہ خوش قسمت شخص سمجھتا ہوں۔ میرے لئے تمہاری ہر نوازش ایک عطائے بے بہا ہے۔" کریمی نے یہ جملے عصر حاضر کے نوجوان کی طرح ادا کئے۔

بس اُسی گھڑی سے ڈاکٹر کریمی لطیف و شیریں خواب دیکھنے لگے۔ جیسے کوئی ہونہار طالبعلم امتحان کے یقینی نتیجے کو سننے کے لئے ایک خوشگوار بیقراری محسوس کر رہا ہو۔ مورسین کے مے زیر لب لعلیں کی طرح ساری کائنات انہیں سرشار و رنگیں نظر آ رہی تھی۔ وہ اپنی آئندہ کامرانی کی حقیقتوں کی تفصیل سے اپنے تخیل و تصور کو اس طرح روک رہے تھے جیسے کوئی بلی چوہے کو پکڑ پکڑ کر چھوڑ

دبتی ہو یا کوئی بچہ اپنی مرغوب مٹھائی مچل مچل اور اترا اترا کر کھاتا ہو۔ اس احساس کے ساتھ ایک ایسا پرستارانہ جذبہ بھی شامل ہے جو پجاری کے دل میں کسی عظیم و مقدس بت کے چرنوں میں جھکتے وقت مضطرب سی ہچکچاہٹ پیدا کر دیتا ہے۔

شام کو اپنے بہترین سوٹ کو لانڈری میں استری کرنے کیلئے دینا، اپنے نفیس تر فلٹ ہیٹ کو بار بار برش کرنا اور جوتے پر پالش لگوانا بھی۔ کریمی کے لئے حد درجہ رومان آفریں اور تخیل پرور کام تھے۔ آج اُن پر یہ راز منکشف ہو رہا تھا کہ پتلون کی سیدھی اور نمایاں سلوٹ، سلیو لنک اور کالر بٹن کی چمک اور جوتوں کی جھلک کی سی عام و پیش پا افتادہ حقیقتیں اپنے اندر کتنا بڑا سرمایہ کیف و انبساط رکھتی ہیں حقیقت اور تخیل ہم آغوش ہیں۔

رات بھر کریمی خیالاتِ جمیل کے اُڑن کھٹولے پر اُڑتے رہے خوابناک بیداری اور چونکی ہوئی نیند کے عالم میں رات بسر ہو گئی۔ صبح اس طرح مسکراتی ہوئی نمودار ہوئی جیسے خود مارسین تبسم ریز، اسپتال کے وارڈوں میں طلوع ہوتی تھی۔ ڈاکٹر کریمی مسرور تھے۔ وہ ایک انگریزی فلم کا گانا گاتے ہوئے بستر سے اُٹھے نہاتے وقت تو وہ جذبات کے بار سے دبے جا رہے تھے۔ کل سے پانی چلو میں لیکر اُنہوں نے لاابالی پن کیساتھ یونہی چھڑکنا شروع کیا، ٹب کے مُنہ پر ہاتھ رکھکر فوارہ بنا دیا اور مختلف زاویوں میں پانی کی پچکار پھینکی ـــ انہیں اپنا گورا جسم بہت حسین معلوم ہو رہا تھا بھرے بھرے بازو کی مچھلیاں، گٹھی ہوئی پنڈلیاں .... جسم کا مطالعہ اُن کیلئے ناقابلِ برداشت ہو گیا۔ رگوں میں خون کا ایک ہلکورا اٹھا اور اب اظہارِ جذبات کیلئے "او لو می!" کے بول کافی نہ تھے۔ کریمی فوراً ٹب کے نیچے چلے گئے۔ پانی کی دھاریں ان کے جسم کو مَس کرتی ہوئی نیچے گرنے لگیں اور وہ گا رہے تھے

میں اُس کے پاسمین پیکر کو کیسے گدگداؤں گا
میں اُس کے لعلِ لب سے کس طرح بوسے چراؤں گا

ڈاکٹر کریمی آج کچھ سویرے ہی وارڈ چل دیئے۔ اپنی ڈیوٹی پر جانے سے پہلے مارپین کے وارڈ میں جا کر اُنہوں نے شام کے پیمان کو اور زیادہ مستحکم کر لیا۔ پھر وُہ ایک شاداں اور کھلنڈرے خرگوش کی طرح اپنے کام میں آکر لگ گئے۔ وُہ فوارے کی طرح اُبلے پڑتے تھے۔ اسپتال کا اسپتال انہیں جنت نگار نظر آرہا تھا۔ زندگی کے نئے نئے پہلوان کے پیش نظر ہوئے جاتے تھے۔ انجکشن کا سیرنج، انہیں کبھی تو ہولی کی پچکاری سا محسوس ہوتا اور کبھی طیارہ شکن توپ کی سی اہمیت اختیار کر لیتا۔ گاہ وُہ ایسا محسوس کرتے کہ موت و حیات کی کنجی صرف اُن کے ہی ہاتھ ہے۔ وسیع وارڈ ڈاکٹر کریمی کی جولانگاہ تھی، جہاں نمونیہ، ٹائیفائیڈ، کالا آزار اور طرح طرح کی بیماریوں کے مریض بھرے پڑے تھے۔ زندگی اور موت کی کشمکش کے درمیان مگر کریمی پر یہ احساس شدت سے طاری تھا کہ نوعِ انسان کو بیماریاں محض اس لیئے دی جاتی ہیں تا کہ کریمی امراض کو شکست دے کر لذتِ فتح حاصل کریں۔ آج وُہ مریضوں اور وارڈ کے قلیوں سے بڑی نوازش سے پیش آرہے تھے۔

ڈاکٹر کریمی عموماً دو بجے دن کو اسپتال سے کوارٹر واپس چلے جاتے تھے۔ آج وُہ یہ سوچ رہے تھے کہ کوارٹر واپس جا کر کس کس طرح اپنے کو مورپین کے لائق بنا ئینگے۔ ابھی بارہ بجے تھے۔ وارڈ کا کام اب ختم ہی ہو چلا تھا۔ دو بجے فرصت، کھانا، شیو، غسل، ڈریس

یک بہ یک ان کی مختلف ڈیزائن کی ٹائیاں اور رومال چشمِ تصور کے سامنے رقص کرنے لگے . . . . سنٹ اور پھر ——— اس کے بعد ڈاکٹر کریمی سے سوچا نہ گیا جرف انکا دل دھک سے حلق تک آکر رُک گیا اور پھر تیزی سے دھڑکنے لگا۔

"جو ربڈ نمبر ۱۳ کی حالت خراب ہے۔"

ٹھیک اسی وقت ایک قلی نے آکر کریمی کو اطلاع دی۔" او کچھ نہیں! ابھی اچھا ہو جاتا ہے . . . . " یہ کہتے ہوئے کریمی بڈ نمبر ۱۳ کی طرف لپکے۔ اس پر نمونیہ کا مریض ایک تیس سالہ شخص تھا۔ اونچا بخار تو خیر اُسے دیر سے تھا۔ ابھی اچانک اُسکی سانس اکھڑنے لگی تھی۔ کریمی نے فوراً اکسیجن سلنڈر منگوایا اور اُس کی نلکی کا بالائی قیف مریض کی ناک سے لگوا دیا، کافور کا انجکشن دیا اور تقویتِ قلب کے لئے اور بھی دوسری دواؤں کے اہتمام میں مشغول ہو گئے کریمی پر تیقن کی گہری کیفیت طاری تھی۔ کیا ہوا! ایک جسم کی عمارت میں تھوڑی سی آگ لگ گئی۔ آگ بجھانے والا انجن موجود ہی تھا۔ بخار کی آگ اور نمونیہ کے دشمنیں پر فتح پانا بس ایک اُنگلی کے اشارے کا کام تھا اور پھر دو بجے فرصت۔ موت کی شکست پر طنزیہ ہنسی ہنستے ہوئے زندگی کی ایک بہار آفریں شام پر کامرانی محبت کی مہرِ دوام ثبت کرنا! ——— مریض کی سانس ہنوز غیر منظم تھی مگر ڈاکٹر کریمی کے خیالات مسلسل و مربوط تھے۔

کوئی ڈیڑھ بجے بڈ نمبر ۱۳ کی حالت قدرے سنبھلی۔ کریمی کو بالکل اطمینان ہو گیا۔ وہ ڈیوٹی کے کمرے میں جا کر نوجوان نرسوں سے چھیڑ کرنے لگے۔ گویا یہ شام کی تمہید تھی۔ تبسماً

اچھے مریض بُرے حال مریضوں پر ترس کھاتے ہوئے وارڈ میں گھومے پھرتے تھے اور کبھی تین چار فطری "چہ چہ چہ" کے بعد آکسیجن سلنڈر، برف کی ٹوپی اور کافور کے انجکشن سے بالکل بے پروا ہو کر کسی جگہ مل کر بیٹھ جاتے، تاش کھیلتے، گپیں کرتے، نرسوں اور ڈاکٹر بابوؤں کے اندھیرے اجالے کی باتوں پر رائے زنی کرتے اور پھر ایک بحرانی کیفیت کے ساتھ ہنستے ہنستے ملک الموت کے کان بہرے کر دیتے۔ وہ سارے فرشتوں اور شیطانوں کے کان بہرے کر سکتے تھے۔ مگر وارڈ کے اندر شور ڈاکٹر کریمی کو ناپسند تھا۔ ایسے موقعوں پر اُنہوں نے کتنے بیماروں کی گالیوں اور دھکوں سے خبر لی تھی۔ آج وارڈ کے قہقہوں میں خود اُن کے دل کی آواز ملی ہوئی تھی۔ سار کوما، ٹائیفائڈ، نمونیہ اور سرسام کے ماحول میں ایک پُر شور قہقہہ بلند ہوا۔ موت کو زندگی کا چیلنج یا شکست کی خلش کو دبانے کی ایک بیقرار کوشش! اُسی وقت وارڈ سے ایک نرس مسکراتی ہوئی آئی۔

"ڈاکٹر! بیڈ نمبر ۱۳ کی حالت پھر بگڑ گئی"۔

کریمی نے گھڑی دیکھتے ہوئے بیقراری کیساتھ اس جملے کو سنا۔ دو بج چکے تھے

اب کریمی کو خلجان شروع ہوا۔ اُنہوں نے اندازہ لگایا کہ مشکلوں سے وہ آدھ گھنٹہ اور دے سکتے تھے۔ بھاگتے ہوئے وہ مریض کے پاس گئے۔ ایک انجکشن اور لگایا۔ کارڈیزول کی گولی کھلائی اور آکسیجن کی نلکی کو ذرا درست کر دیا۔ تھوڑی دیر وہ بیمار کے سرہانے انتظار کرتے رہے۔ مگر اُس کی حالت یکساں ٹھہری ہوئی رہی۔ کریمی بے صبر ہو کر ڈیوٹی روم میں چلے گئے اور حالت کا انتظار کرنے لگے۔ وہ اپنے فاؤنٹن پن سے یونہی اعصاب کے کھنچاؤ کو کم کرنے کے لیے غیر شعوری طور پر کھیلنے لگے . . . "پیریڈیائیز" سینما۔ مارسین سے اختلاط ــــــ کافور کا

انجکشن "کارڈیزول" سیاہ سوٹ، چک ٹائی "ہیمالین لوکے" "عمرِ خیام" آکسیجن سلنڈر، لپ اسٹک یہ سب چیزیں گڈمڈ ہو کر اُن کے دماغ کو نیرنگِ خیال بنا رہی تھیں۔ کریمی تصور کے ڈھلوان پر دور، دور تک پھسلتے چلے گئے۔ اسپتال سے بہت دور۔ انہوں نے محسوس کیا کہ مارتین کا یاقوتی لپ اسٹک محض "پیازی" رہ گیا۔ حدتِ جذبات کے سامنے کتنے کِس پروف نقش بر آب ہو کر خواب و خیال ہو گئے۔ واردات کی شدت سے کریمی خود چونک پڑے اور پھر اُنہیں نمونیہ کا جاں بلب مریض یاد آیا۔ وُہ گھبرا کر کُرسی سے اُٹھ بیٹھے اور سیدھے بڈ نمبر ۱۳ کے پاس تیزی سے گئے۔ مریض ابھی تک زندگی کے کنارے کھڑا ہوا تھا۔ علامتیں ایسی تھیں کہ اُس کے جانبر ہونے کی کوئی امید نہ تھی مگر روح اپنا نیا سفر شروع کرنے سے ڈر رہی تھی۔ کریمی پریشان ہو کر وارڈ سے ڈیوٹی روم، اور ڈیوٹی روم سے وارڈ کے پھیرے دینے لگے۔ ڈھائی بج گئے۔ مگر موت و حیات کے کھیل کا فیصلہ نہ ہوا۔ جونیئر ڈاکٹر سریش بھی لوٹ کر ہنوز نہ آئے تھے۔ . . . کریمی اُس کی راہ دیکھنے لگے۔ گھڑی کی سوئی کے ساتھ ان کی بیقراری بڑھنے لگی، ابھی انہیں کتنے کام کرنے تھے۔ دوبارہ شیو، غسل، کپڑوں کی درستگی وغیرہ وغیرہ اور بیمار مر بھی نہیں چکتا تھا۔

"ہیلو ڈاکٹر کریمی! کیا خبر ہے؟"

یہ ڈاکٹر سریش کی آواز تھی۔ کریمی کی جان میں جان آئی: "بڈ نمبر ۱۳ کی حالت خراب ہے" اُس نے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔

"کیا ہوا؟ کرائسس تو تھا۔ کیا کولیپس کر رہا ہے؟" "ہاں کولیپس!"

دونوں ڈاکٹر مل کر وارڈ میں گئے۔ بڈ نمبر ۱۳ کی زندگی کا چراغ ابھی تک جل رہا تھا۔ شاید آکسیجن

کے سہارے۔ یک بہ یک کریمی کے دل میں ایک خواہش پیدا ہوئی۔ کیوں نہ آکسیجن سلنڈر کو ہٹا دیا جائے۔ مگر وہ ایسا کرنے نہ پائے۔ اس خیال پر ضمیر نے تھوڑی سی ملامت کی بھی مگر تاخیر کے احساس نے خلجان میں اور اضافہ کر دیا۔

"سریش! میں جاتا ہوں اب۔ ایک بہت ضروری کام ہے۔ تم دیکھ لینا اسے۔"

"اگر مر گیا تو ڈتھ سرٹیفکٹ، تو آپ ہی کو دینا ہو گا۔ آپ کے دستخطِ تصدیقِ موت کے لئے ضروری ہیں۔ آپ سینیئر ہیں"۔

کریمی چپ ہو گئے اور خاموشی سے آ کر ڈیوٹی کے کمرے میں بیٹھ رہے۔ سریش بھی کچھ کام وام کر کے کمرے میں واپس آئے۔

"بیڈ نمبر ۱۳، مر چکا؟" کریمی نے اثباتی جواب کی توقع میں یہ سوال بیقراری سے کیا۔ تین بج رہے تھے۔

"نہیں ابھی نہیں"۔ سریش نے جواب دیا

"اُف اوہ بہت وقت لے رہا ہے"۔ کریمی یہ کہتے ہوئے کرسی سے اٹھ بیٹھے

"سریش بابو! میں کوارٹر جاتا ہوں۔ چار بجے تک میں کوارٹر میں رہوں گا۔ اس وقت تک وہ مر ہی جائیگا۔ موت کی تصدیق کے لئے مجھے بلوا لیجئے گا"۔۔۔۔۔ کریمی ٹوپ سر پر رکھ کر روانہ ہونے والے ہی تھے کہ اسپتال کا دربان ہانپتا ہوا آیا اور کہنے لگا۔

"حجور! ڈاکٹر مکرجی آپ کو فون پر بلاتے ہیں"۔

کریمی بدحواس ہو گئے۔ ڈاکٹر مکرجی اِس وارڈ کے انچارج تھے۔ کریمی دوڑے ہوئے فون

پڑ گئے۔ پتہ یہ چلا کہ وزیرِ بلدیات کے معتمدِ پارلیمانی کے چچا کو اختلاجِ قلب کے دورے پڑ رہے ہیں۔ وُہ فوراً اسپتال لائے جانے والے ہیں، پے انگ وارڈ کی بالائی منزل میں جگہ بنائی جائے، رائے بہادر ڈاکٹر مکرجی مریض کو ساتھ لیکر خود تشریف لا رہے ہیں۔ ڈاکٹر کریمی کے اوسان خطا ہو گئے۔ وُہ چاہ رہے تھے کہ سارے چچاؤں، سارے پارلیمانی معتمدوں اور سارے وزیروں کو بڈ نمبر ۱۳ کیساتھ بیک وقت موت کی سند دے دیں مگر انہیں خود ڈاکٹر مکرجی سے اچھے کارکردگی کی سند لینی تھی۔ وُہ غصّے کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔ انھیں ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ پگھلا ہوا سیسہ اُن کے حلق سے نیچے اتر رہا ہے،

پے انگ وارڈ، مع ڈاکٹر کریمی کے، وزیرِ بلدیات کے معتمدِ پارلیمانی کے چچا کا انتظار کھینچ رہا تھا پانچ بجے ایک شاندار دی ایٹ کار، پے انگ وارڈ کے سامنے آ کر رکی۔ اس درمیان میں کریمی پر ایک قیامت گذر گئی۔ قیامتِ صغریٰ نہیں بلکہ کبریٰ سے بھی زیادہ بڑی، زیادہ شدید، زیادہ اہم۔ کریمی کا سارا پروگرام خراب ہو رہا تھا۔ آرائش و تزئین کے سارے منصوبے خاک میں ملے جا رہے تھے اور ایفائے وعدہ کا وقت بھی قریب آ رہا تھا چھ بجے، ٹھیک چھ بجے ماربین، اُن کے ارمانوں کی دولت، اُن کے قریب ہو گی۔ اس کا قیمتی جسم اُن کے جسم سے مس کرے گا اور وُہ اس لمحۂ زریں کی پذیرائی کے لئے اپنے آپ کو اب تک آراستہ بھی نہ کر سکے۔ اُن کی حیات رائگاں جا رہی تھی دُنیا اور ساری کائنات کا عظیم ترین کام محض معتمدِ پارلیمانی کے چچا کے لئے ادھورا رہا جاتا تھا۔ دُنیا اور دنیا والے کس قدر بے اصولے اور نا انصاف ہیں۔ یہی وقت اختلاجِ قلب کے دوروں کا تھا

...... مگر اب تو وہ حالتِ منتظرہ دور ہو چکی تھی۔ اضطراب کی گھڑیاں کٹ ہی چکی تھیں۔ ڈاکٹر مکرجی معتمدِ پارلیمانی کے ساتھ آ گئے تھے —— آہ! مگر کیا ڈاکٹر کریمی کو اتنا وقت ملے گا کہ

وہ دعوتِ مژگاں کے لئے جگرِ لخت لخت کو جمع کر لیں۔

ڈاکٹر مکرجی نے رپے انگ وارڈ آ کر بھی چچا کا معائنہ کیا اور بہت سی ہدایات دیکر رخصت ہو گئے۔ کریمی موٹر تک رائے بہادر کو پہنچانے گئے۔ سیڑھی سے اترتے ہوئے انہوں نے چند فوجی گوروں کو نرس کوارٹر کے سامنے سائیکلوں پر منڈلاتے ہوئے دیکھا اور بالائے بام چند رنگین بتیریوں کو نظارہ فروش پایا۔ ان کا دل رقابت کے تیر سے چھلنی ہو گیا۔ پھر انہیں موریسین کے خیال سے تسکین ہوئی۔ کیا پروا۔ سب سے گراں قدر موتی تو ٹھیک چھ بجے اُن کے گلے کا ہار ہونے والا تھا۔

موٹر کے پاس عام وارڈ کا قلی یہ پیام لایا کہ بڈ نمبر ۳۱ مر گیا۔ موت کی سند دینے کیلئے ڈاکٹر کریمی کو جانا تھا۔

"کریمی! اسرلیش کو پے انگ وارڈ بھیجدو۔ ہدایات سمجھا دینا —— اچھی طرح!" —— یہ کہہ کر ڈاکٹر مکرجی اپنی موٹر پر ہوا گئے۔

کریمی سیدھے جنرل وارڈ گئے اور جلدی جلدی اپنا کام ختم کر کے کوارٹر واپس آئے۔ چھ بجنے کو پندرہ منٹ باقی تھے۔ بیچلر کوارٹر کی سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے انہوں نے چار پانچ نرسوں کو فلٹن پر گزرتے دیکھا۔ انہیں شبہ ہوا کہ ان میں ماریسین بھی ہے۔ بھلا ماریسین ہزاروں میں ایک! اور عاشق کی آنکھیں اُسے پہچان نہ لیں۔ کریمی کو یقین ہو گیا اور ہاں چھ تو بج ہی رہے تھے۔ اور! ٹھیک تو "پیریڈائز" میں ملنے کی جگہ مقرر ہوئی تھی۔ مگر یہ اتنی نرسوں کا ساتھ ہونا کیا معنی۔ وہ پھر شبہ میں گرفتار ہو گئے —— اسی شبہ، یقین اور بے قراری کے عالم میں انہوں نے سوٹ تبدیل کیا اور آراستہ ہو کر فلٹن پر "پیریڈائز" کا رُخ کیا۔

"مین! تیز چلاؤ! پیریڈائز!"

فٹن والے کو خاص صاحبانہ انداز میں حکم دیتے ہوئے ڈاکٹر کریمی ٹیڑھے ہو کر سیٹ پر دراز ہو گئے۔ ان کا دل دھڑک رہا تھا۔ آرائش کے غیر مکمل ہونے کا تاسف عظمتِ عظمیٰ کا انتظار اور مستقبل قریب کی کامرانی کا غرور کریمی کو مضطرب کر رہا تھا۔ اُن کا چہرہ تمتما یا ہوا تھا اور خیالات پریشان۔

آخر وہ "پیریڈائز" پہنچ گئے۔ کود کر فٹن سے اترے اور سیدھے اندر گھسے چلے گئے۔ وہ متوقع تھے کہ ماریسن مسکراتے ہوئے اُن کا خیر مقدم کرے گی مگر ماریسن وہاں نہ تھی۔ انہیں یقین ہی نہیں آتا تھا۔ بیرا کو انہوں نے ڈانٹا۔ منیجر سے دریافت کیا اور جب اُنھیں قطعی یقین ہو گیا کہ ماریسن نہیں آئی تو وہ سمجھے کچھ غلط فہمی ہوئی ہے۔ شاید وہ "کلنر" چلی گئی ہو۔ فٹن پر بیٹھ کر انہوں نے اسٹیشن چلنے کا حکم دیا۔ پیریڈائز سے اسٹیشن تک کی منزل بڑی پہاڑ تھی۔ خدا خدا کر کے اسٹیشن آیا۔ کریمی چھلانگ لگا کر گاڑی سے اُترے اور پلیٹ فارم ٹکٹ خرید کر انہوں نے "کلنر" کا رخ کیا۔ وہ کمرے میں داخل ہو گئے ——— وہاں ماریسن، تین اور نرسیں اور چار فوجی گورے خوش فعلیاں کر رہے تھے۔

ڈاکٹر کریمی کو دیکھ کر سب نرسیں ہنس پڑیں۔ کریمی سمجھے ——— "میری نا تجربہ کاری پر ہنس رہی ہیں۔"

بیل گاڑی

ڈسٹرکٹ بورڈ کی لانبی سڑک پر بیل گاڑیوں کی قطار آہستہ آہستہ چلی جا رہی تھی۔ بیلوں کے گلے کی گھنٹیوں کی مسلسل آوازیں کھیتوں کی وسعت میں مدھم ہو کر اور شام کی غنودگی میں گھل کر خواب آور نغمہ پیدا کر رہی تھیں۔ مویشیوں کے آخری گلے گھروں کو جا رہے تھے۔ چرواہے انجام کار کی مسرت میں تانیں اڑا رہے تھے۔ ایک آدھ بھٹکا ہوا کوا یا مینوں کے غول سرمئی فضا میں تیزی سے پر مارتے ہوئے اپنے اپنے آشیانوں کی طرف جا رہے تھے۔ پروں کی تیز سنسناہٹ سے چونک کر گاڑیبان آسمان کی طرف تکنے لگتے تھے۔ پھاگن کے مہینہ کا آغاز تھا۔ شام کی ہوا میں نرم سی سردی تھی۔ بستیوں کے چولھوں سے اٹھتے ہوئے دھوئیں کے پیچ پیچ گالے اب میدانوں میں آوارہ بھٹک رہے تھے۔ دھان کی فصل کٹ چکی تھی اور کھیتوں میں ابھی تک کھونٹیاں باقی

تھیں۔ کسانوں کے چہروں پر مسرت و انبساط کی موجیں مچل رہی تھیں۔ ربیع کے کھیت لہرا رہے تھے۔ اُن کی ہریالی گہرے کاہی رنگ میں تبدیل ہو چکی تھی اور کہیں کہیں پکتے ہوئے خوشوں کے پیلے پیلے دھبے نمایاں ہو کر گلدار چھینٹ کا نقشہ پیش کر رہے تھے۔

موتیا گاڑیبان نے سوچا کہ وُہ اپنی بیوی کو ایسی ہی گلدار ساری اب کے ہولی میں خرید کر دیگا موتیا منظر کے سکون سے متاثر ہو کر اپنے من سے باتیں کر رہا تھا۔ اُس کے دل میں مسرت اور اطمینان کی ہلکی ہلکی لہریں اُٹھ رہی تھیں چین کی موجوں میں بیتے ہوئے دنوں کے دکھ بھی بہے جا رہے تھے آخرکار اُسے کام مل گیا تھا۔ صبح اُسے ڈھلائی کی اُجرت مل جائے گی۔ ایک روپیہ! اُس نے اپنی مٹھی میں چمکتے ہوئے سکے کو محسوس کیا۔ ایک روپیہ! ایک دو ڈھولائی اور بھی مل ہی جائیگی۔ مگر یہ ٹرک! سارا غلّہ تو موٹر پر ڈھل جاتا ہے۔ موتیا کے دل میں ذرا سی مایوسی پیدا ہوئی۔ اسکے دل نے کہا مگر اب کے علاقہ میں فصل بہت اچھی ہوئی ہے۔ ایک دو ڈھولائی مل ہی جائے گی۔ اچھی فضا میں، اچھے ہی خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ پھر جبکہ ایک ڈھولائی کی اجرت اُسے نقدا نقد صبح کو جہان آباد کے گودے پر ملنے والی تھی۔ اُس نے گول چمکتے ہوئے روپے کی کھنک بھی سُنی۔ ہولی ——— گلدار ساری ——— موتیا نے اپنی سنوری اور لجائی ہوئی بیوی کا تصور کیا۔ گندمی رنگ کے نوجوان چہرے پر خوشی اور شرم کی ملی جلی کیفیت سے خون کی پچکاری سی چھوٹی ہوئی رسیلے لبوں پر گلال سا لگا ہوا۔ گلدار ساری کا آنچل، گداز اُبھرے ہوئے سینوں پر پھسلتا ہوا، ہولی اور اُس کی ساری رنگینیاں موتیا کے خیال کی آنکھوں کے سامنے ناچتی ہوئی گذر گئیں۔ ترنگ میں آ کر اُس نے ایک تان اڑائی۔

پچھواسے جو سُنا باہر بھیل ہو رہا تھا

چیت ملے !

دوسرے گاڑیبان بھی، جو فضا کے سکر پرسکون کے جادو سے ماتے ہوئے تھے، جاگ سے گئے۔ بیل گاڑی کے آہستہ رو کارواں میں زندگی اور حرکت پیدا ہو گئی۔ ایسا معلوم ہوا کہ سب پر ایک ہی کیفیت طاری تھی۔ سب موسم اور فضا سے لطف اندوز تھے اور روزگار کے چل نکلنے کی مسرت کو خوشی کیساتھ محسوس کر رہے تھے۔ اُنھوں نے بیلوں کے پٹھوں پر ہاتھ رکھ کر ٹھکارا۔ "اے اے ہے بڑھے"! "ٹ ٹ ٹ ٹ ہے ٹ ٹ بڑھے"! بیل تیز چلنے لگے۔ کارواں کی رفتار بڑھ گئی۔ برہے، دوہے، پھاگ اور بارہ ماسے الاپے جانے لگے۔ راہگیروں سے تھوڑا سا ٹھٹول ہوا۔ لانبی گھونگھٹ والی عورتیں بیل گاڑی کی قطار سے ذرا کترا کر نکل گئیں۔ مسافر تیز قدم اٹھاتے بڑھے جا رہے تھے تاکہ رات سے پہلے اپنی اپنی منزل پر پہنچ جائیں۔ کھیتوں کے درمیان کھلیانوں میں دھان کے پونج اور پوال کے ڈھیر اپنے سنہرے پن سے نظروں کو خوش اور دلوں کو مطمئن کر رہے تھے۔ بیلوں نے کنکھیوں سے پوال کی طرف اور گاڑیبانوں نے گردنیں پھیر پھیر کر غلّے کے انبار کی جانب دیکھا۔ دور اور نزدیک کی بستیوں کے کنارے لڑکے کھیل اور کتے بھونک رہے تھے اور پنگھٹوں پر عورتیں پانی بھر رہی تھیں۔ بیل گاڑی کا کارواں کھیتوں کے درمیان کچی سڑک پر ایک آگے بڑھتی ہوئی لکیر بناتا ہوا چلا جا رہا تھا۔

دھیرے دھیرے رات نے سارے منظر کو اپنے کالے بانہوں میں لپیٹ لیا۔ آسمان پر تاروں کے چراغ جل گئے اور دور گاؤں میں کسانوں نے اپنے دیئے روشن کر لئے۔ گاڑیبانوں نے کارواں میں

چار پانچ لالٹینیں جلالیں اور انہیں گاڑیوں کے نیچے لٹکا دیا۔ کئی گاڑیبان ابھی تک گیت گا رہے تھے۔ راہ کے اونچے درختوں پر اپنے بسیروں کے اندر ایک دو پرندے پھڑپھڑا اٹھتے اور دھیمی آواز سے چیخ پڑتے تھے۔ موتیا اب تک مسلسل گاتا جا رہا تھا۔ اس کے دل میں زندگی کے ولولے اُٹھ رہے تھے۔ وہ سرور میں مگن تھا۔ رفتہ رفتہ سبھی گاڑیبان غلہ کے بوروں سے ٹیک لگا کر یا اُن پر چڑھ کر سو رہے۔ ان کے گیت یکے بعد دیگرے بند ہو گئے کھیتوں میں گیدڑ بولنے لگے بیل گاڑیوں کی چرخ چوں رات کے سناٹے میں نمایاں طور پر سنائی دے رہی تھی۔ کارواں بڑھتا جا رہا تھا اور موتیا عالمِ تصور و تخیل کی سیر کر رہا تھا

اُس نے سوچا کہ اب کے دفعہ دھان کی فصل اتنی ضرور ہوتی ہے کہ وہ مالگذاری ادا کر کے سال بھر بخیت بیٹھ کر کھا سکے گا اور جو غلہ کی ڈھولائی کا روزگار چل نکلا تو پھر کپڑے لتے بھی ہو جائیں گے۔ تین سال سے ہولی اور دسہرے پر پھٹے اور پیوند ہی پر گذارا کیا ہے۔ شادی کو بھی تین سال ہوئے، مگر اس نے اپنی نوجوان بیوی کے لئے کبھی کوئی سوغات نہیں لائی۔ ایک بچہ ہے وہ ہمیشہ ننگا ہی رہا۔ تقدیر کا لکھا کون مٹائے مگر اب کے بھگوان نے دیا کی ہے۔ سب دلدر دور ہو جائیں گے موتیا کو ساری دُنیا بڑی خوبصورت معلوم ہو رہی تھی۔ کیسی اچھی ہوا تھی، کیسا اچھا آسمان، اور تارے جیسے کہانیوں کے راجہ کی شال میں موتی ٹکے ہوں۔ بیل گاڑی کی چرخ چوں، چوں چوں کھٹ میں اُسے ایک سریلا نغمہ سُنائی دے رہا تھا۔ یہ گیدڑ بھی بڑے اچھے ہوتے ہیں۔ رات کی سناٹی فضا کو کیسا گلزار کئے دیتے ہیں۔ اس کے دل سے مسرت چھلک رہی تھی۔ اُس نے پھر گانا شروع کیا۔

دور دیہات سے لاہین سوگات

وُہ دیر تک مختلف راگ الاپتا رہا۔ اب اُس کا دل باتیں کرنے کو چاہ رہا تھا ــــــ "بے بدتو اتنا جلدی سو گیا رے! ابھی تو رات بھنگو ونہ کیا ہے"۔ اُس نے اپنے ایک جوڑی دار گاڑیبان کو آواز دی۔ جواب میں سوئے ہوئے گاڑیبانوں کے خراٹے تھے۔ اُس کی خواہش تھی کہ وہ اپنے من کی موج میں سب کو گھیر لے، اپنی مسرت میں سب کو غرق کر دے۔ ہر ہر ستارہ سے باتیں کرے ہوا کی لہروں کو پیام دے۔ عرصۂ دراز تک تپے ہوئے دل کو سکھ کی اُمید سی بندھی تھی۔ یہ اُمید مسرت موتیا کو کتنی عزیز تھی۔ اُس کا دل خوشی سے بھرا ہوا تھا۔ عین خوشی کے عروج کے وقت ایک مبہم سا خوف اُس پر طاری ہوا جیسے کسی ماں پر اپنے بہت ہی صحت مند بچے کو دیکھکر طاری ہوتا ہے اُس نے اس مبہم مگر اندوہ خیز خیال سے پیچھا چھڑانا چاہا لیکن دبے پاؤں پیچھے سے آنے والے بھوتوں کی طرح یہ خیال اُس پر حاوی ہونے لگا اور رفتہ رفتہ بہت ہی داغنح ہو گیا ــــــ

مالگذاری تو اس سال کی ادا ہو جائیگی اور کھانے کو بھی بچ رہے گا۔ مگر تین سال کا لبقایا، زمیندار کا سخت تقاضا اور ساہوکار کا قرض ۔ ۔ ۔ ۔ موتیا کے جسم میں جھرجھری سی پیدا ہوئی۔ اُس کا نشۂ مسرت ٹوٹتا ہوا معلوم ہوا اور اُسے خمار کی سی تکلیف محسوس ہوئی۔ آدھا سے زیادہ غلہ تو کھلیان ہی سے چھین لیا جائیگا۔ پھر وہی سال بھر آدھا پیٹ کھانا ــــــ اور قرض کا تقاضا ــــــ سود بھی تو ادا نہیں ہو سکے گا۔ ایک سرد تاریکی میں وُہ ڈوبتا جا رہا تھا۔ بیلوں کے گلے کی گھنٹیوں کی صدا بہت دور سے آنے والی آواز معلوم ہو رہی تھی۔ آسمان پر ستارے ابھی تک اپنی سبھا سجائے ہوئے تھے۔ موتیا کے دل کے ولولے نا اُمیدی کی روح فرسا تاریکی سے نکل کر مچلنا

چاہیے تھے ابھی تک وہ یاس کے بھنور میں ڈوبے نہیں تھے خوشی کتنی کمیاب اور انمول چیز ہے۔
وہ مسرت کے خزانے سے یوں آسانی سے دست بردار نہیں ہو سکتا تھا۔ شام ہی سے اُسے یہ دولت
مل گئی تھی۔ ستاروں کی جھمک اُسے دعوتِ انبساط دے رہی تھی۔ مہوا اور نیم کے پھولوں کی خوشبو کی لپٹ
نے اُس کی طبیعت میں گدگدی پیدا کی۔ وہ بُرے اور تکلیف دہ خیالات کو کچل دینا چاہتا تھا
اُس نے انہیں دفن کر دینے کی پوری کوشش کی۔ دماغ نے بھی ایک بات بنائی یہ بیل گاڑی
کا روزگار اب کے خوب چلے گا۔ بس پھر کیا تھا اُس نے بُرے خیالات کو گویا پیچھے ایک جھٹکے کیساتھ
دھکیل دیا مگر تاریکیوں کی گہرائی سے اُسے چند موٹر ٹرک اُبھرتے ہوئے دکھائی دیئے۔ پھر وہ خلا
میں غائب ہو گئے۔ اُس نے نفرت کے ساتھ اُس جانب سے آنکھیں پھیر لیں اور نا امیدی کے
آخری وار سے بچنے کے لئے اُس نے پھر گانا شروع کیا اور اُس کے دل نے سوچا ــــ "اونہہ
ٹرک، اب کے غلہ بہت ہوا ہے۔ بغیر بیل گاڑی کے کام کہاں چلے گا" ــــ
گنگناتے گاتے وہ اونگھنے لگا اور تھوڑی ہی دیر کے بعد بوروں سے اٹک کر سو گیا ــــ
سب سوئے تھے۔ بن ہنکائے بیل اپنی ڈگر پر چلے جا رہے تھے اور بیل گاڑیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔
ــــ ہولی ہے۔ عبیر اور گلال ملے جا رہے ہیں پچکاریوں سے رنگوں کی بارش ہو رہی ہے۔
یاروں کے دُھر کھیل . . . رادھا پکوان اور پُوتے چھانک رہی ہے۔ بچہ لال لال کپڑے
پہنے کھیل رہا ہے ــــ یک بیک ایک موٹر ٹرک نمودار ہوا۔ راکھشش کی طرح رینگتا ہوا ــــ
ــــ اس پر زمیندار کے برابر اور ساہوکار بیٹھے ہوئے ہیں۔ مونیا نے رنگ کی ایک پچکاری سے
ٹرک پر نشانہ لگایا۔ اُس کے چھپاکے چوٹ کے ساتھ موٹر ٹرک فضا میں اڑ گیا اور ٹوٹ

ٹوٹ کر بکھر پڑا۔ برا حال ہو گا۔ اور ساد جی کا ڈرائیور قلا بازیاں کھاتے ہوئے زمین پر آ رہے اور مٹی کے برتن کی طرح چکنا چور ہو گئے ——— رادھا کے لئے بہت سی ساریاں بازار سے لائی گئی ہیں۔ رنگ برنگ کی بوٹے دار موتیا بھی نئی گلابی دھوتی اور پیلی پیلی مرزئی پہنے بھنگ پی رہا ہے۔ رادھا بن سنور رہی ہے۔ وہ اٹھلاتی ہوئی آئی۔ اس کی رسیلی جوانی اور اس پر اس کی متوالی آنکھوں میں لاج کی رنگین سطح کے اندر پریم کے چنچل بلاوے ——— اُٹھ رے موتیا! کب تک سوتا رہیگا" اس کے جوڑی دار گاڑی بان نے آواز دی۔

"ہے رے موتیا۔ واوا کے گلیچہ پر سویا ہوا ہے؟ دیکھو تو جیرا۔ تیرا کون اٹھاوے گا رے۔ نکھٹو! اِی جوانی ہے!"

ایک بوڑھے گاڑیبان نے دھونس جمائی ——— ایک تیسرے نے موتیا کا شانہ ہلا کر اُسے اٹھایا۔ وہ چونک کر جمائیاں لیتا اور آنکھیں ملتا ہوا اُٹھ بیٹھا۔ بیل گاڑیوں کا کارواں چھیدی ساؤ کے گودے کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا تھا احاطے کے اندر اور بھی بیل گاڑیاں مختلف انداز میں لگی ہوئی تھیں۔ کسی کا جوا اوپر کو اٹھا ہوا، کوئی ٹیک سے لگی ہوئی، چند ہنوز بیلوں کے کاندھوں پر، کوئی خالی اور بہت سی بوروں سے لدی ہوئی۔ یہ نیا آنے والا کارواں بھی سب کے ساتھ آکر مل گیا اور بورے ڈھوئے جانے لگے۔

صبح ہو چکی تھی اور زندگی کے آثار سارے بازار میں پیدا ہو گئے تھے۔ بوروں کی ڈھلائی سے فارغ ہو کر گاڑی بانوں نے ساتھ لایا ہوا ستو یا بھونا کھایا، پیٹ بھر ڈکر کر پانی پیا اپنے گاؤں

کے بننے کے کارندے سے ڈھلائی کی اجرت لی اور مختلف کاموں میں مشغول ہو گئے۔ کوئی پڑ کر سو گیا۔ کسی نے بازار کا رخ کیا اور کوئی تاڑی خانہ کی طرف چلا گیا۔ موتیا کو بھی اجرت ملی، چاندی کا چمکتا ہوا ایک روپیہ۔ اُس نے اُسے دھوتی کی ایک کھونٹ میں کئی گرہ دیکر باندھا اور آڑھت کے احاطے سے باہر نکل گیا۔ بیلوں کو پیار کیا اور گاڑی کے سایہ میں جا کر لیٹ رہا۔ اُس نے خیال کیا کہ ہر ایک روز کے بعد اُسے اسی طرح روپیہ ملیں گے۔ اُس نے احساسِ مسرّت کی دولت کو دل میں دبا لیا اور آنکھیں بند کر لیں مگر خیالات کی زیادتی کی وجہ سے وہ سو نہ سکا۔ ایک دو کروٹیں بدلکر اُٹھ بیٹھا۔ پھاگن کی سنہری دھوپ ہر طرف مچل رہی تھی۔ پچھیا کی نرم موجیں طبیعت میں امنگ اور بالیدگی پیدا کر رہی تھیں۔ آڑھت شہر کے ایک کنارے تھی۔ سامنے شاداب کھیتوں کے باردر پودے ہوا کے جھونکے پر خوشی کی پینگیں لے لے کر جھول رہے تھے۔ دور درختوں کی بلندیوں سے فاختوں کی کوک سنائی دے رہی تھی۔ موتیا کا دل بھی کوکنا چاہتا تھا۔ مسرت اور درد کی ملی جُلی کوک۔ قلبِ انبساط و مسرت میں بھی ایک ہلکا سا درد، ایک نرم سا سوز ہوتا ہے۔ موتیا دیر تک بیٹھا ہوا یونہی چاروں طرف دیکھتا رہا پھر انگڑائی لیکر اُٹھا، اُس نے انگڑائی لینے میں مبالغے سے کام لیا جیسے وہ کسی خواہش کو دبا رہا ہو۔ آدھے ارادے کے ساتھ وہ بازار کی طرف چل نکلا۔ سڑک کے ایک کنارے پر اُس نے تاڑی خانہ کو لالچ کی نظروں سے دیکھا۔ کئی مزدور اور ایک دو گاڑیبان دونے پر دونا چڑھا کر پھاگن کی نورس پری کا مزہ لوٹ رہے تھے۔ اُس نے ضبط سے کام لیا اور آگے بڑھتا چلا گیا۔ ایک دو بار پھر کر بھی دیکھا لیکن بڑھتا گیا۔ بھرے بازار میں وہ گھومتا رہا یونہی مگر اُس کے دل میں ایک دبی ہوئی خواہش تھی کہ وہ سب کچھ خریدے کپڑے، مٹھائیاں، چوڑیاں، ترکاریاں، سر میں ڈالنے کا تیل، کنگھی، سیندور اور تاروں کی طرح چمکتی ہوئی

ننھی ننھی سی ٹکلیاں ——— ان سے سج کر رادھا کیسی سندر لگے گی ——— ! وہ اپنے خیالات میں مگن دیر تک بازار کی سیر کرتا رہا۔ اپنے ترنگ میں وہ راہگیروں سے ٹکرا بھی جاتا کبھی ان کی جھڑکیاں بھی سن لیتا لیکن خود اُس کی طبیعت میں اُن گھڑکیوں سے بھی چڑچڑا پن پیدا نہ ہوتا۔ اس کا دل خوش تھا۔ مسرت میں بہت پھیلاؤ ہے۔ اُس میں سب کے لئے جگہ ہے۔ خوش و خرم اِنسان وسیع القلب ہو جاتا ہے۔ مونیا کو ہر چیز اچھی معلوم ہو رہی تھی۔ سب لوگ بھلے تھے۔ اسکی گرہ میں ایک روپیہ تھا اور اس کا پیٹ بھرا ہوا تھا۔ ایک روپیہ یعنی سولہ آنے سولہ آنے! سرِ دست اِن سولہ آنوں میں کسی کا حصہ نہ تھا۔ یہ سارے کے سارے آنے اُس کے تھے' اپنے ——— سیر کرتے کرتے کافی وقت گزر گیا۔ اس کا جی بھر گیا۔ اور وہ بازار سے باہر آنے لگا۔ آتے وقت اُسے کچھ کمی سی محسوس ہوئی۔ اُس نے اپنی خوشیوں میں تھوڑا سا اتار پایا۔ اُسے تکلیف ہونے لگی۔ دبی ہوئی خواہشیں ابھرنے لگیں۔ وہ بھرے بازار سے خالی ہاتھ جا رہا تھا۔ یہ احساس مونیا کے دل میں چبھنے لگا اور انحطاط مسرت کی خلش برداشت کرنا نہیں چاہتا تھا۔ واپس لوٹا۔ اُس نے اِس اقدام میں تسکین سی پائی۔ اس کے دل میں پھر خوشیوں کی پچکاریاں سی چھوٹنے لگیں۔ بڑی امنگ سے وہ سارے بازار میں پھر پھر کر سوغاتیں خریدنے لگا۔ پہلے تو اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ کیا خریدے اور کیا نہ خریدے۔ آخر کار اُس نے فیصلہ کر ہی لیا۔ بڑی چاؤ سے گرہ کھول کر اُس نے روپیہ نکالا۔ روپیہ نکالنے میں ایک بے آزار غرور کا سرور تھا۔ اُس نے گندھی کی دوکان پر چھن سے روپیہ پھینکا۔

"دو آنے کا چمبیلی کا تیل دو بھائی صاحب!" ایک چھوٹی سی لانبی شیشی میں گندھی نے چمبیلی کا تیل دیا اُسے۔ اُس نے دوسری دوکان سے تھوڑا سا سیندور اور ٹکلیاں خریدیں۔ ایک ایک آنے

کی۔ چلتے چلاتے حلوائی کی دکان سے اپنے لڑکے کے لئے موتیا نے ایک آنے کی جلیبیاں بھی مول لیں اور ایک باوفا شوہر اور باپ کی طرح وہ آڑھت کی طرف آیا۔ بہت تاخیر ہو چکی تھی، سب گاڑیبان گاؤں کو واپس جا چکے تھے۔ اُس نے پوچھ گچھ سے یہ پتہ چلایا کہ اس کے ساتھی بھی ایک ڈیڑھ کوس آگے نکل چکے ہونگے۔ گاڑی جوت کر اُس نے بھی گاؤں کی راہ لی۔

دوپہر ڈھل چکی تھی۔ موتیا بیلوں کو ہانکے جا رہا تھا۔ شاید وہ اپنے ساتھیوں کو پکڑ پائے ایک دو میل کی تیز رفتاری کے بعد بیل تھک گئے اور اپنی فلسفیانہ رفتار سے چلنے لگے۔ زندگی کی تگ و دو میں کیا رکھا ہے بھوسے یوں بھی ملیں اور دوں بھی' اور ہمیشہ آدھا ہی پیٹ۔ آہستہ آہستہ گردن ہلا ہلا کر بیل نہایت ہی متانت و سکون کے ساتھ چلے جا رہے تھے۔ موتیا نے بھی انہیں دم دلاسا دے کر آگے بڑھانے کی کوششیں چھوڑ دیں۔ کاروان سے جا ملنا مشکل تھا۔

دھوپ میں تمازت آگئی تھی اور چکناہٹ بہنے لگی تھی۔ کبھی کبھی سنکتی ہوئی ہوا گرد کی چادریں اُٹھا اُٹھا کر انہیں گردش دیتی تھی۔ ذرات خاک رقص کرنے لگتے تھے۔ موتیا نے سر پر اپنا انگوچھا لپیٹ لیا اور اس کے خیالات بھی ناچنے لگے۔ اُس نے بارہ آنے بچا لئے تھے۔ انہیں وہ جمع کر دے گا اور دھیرے دھیرے اس کے پاس کئی روپے ہو جائیں گے۔ ہولی میں رادھا کے لئے ضرور وہ دو ساریاں خریدے گا۔ اور بھی بہت سے اچھے اچھے خیالات اس کے دماغ میں آئے۔ اکثر تو اس کا دل خیالی خوشی کے ہچکولے سے اُچھل پڑتا تھا۔ اسے اپنی سوغاتوں کا خیال آیا اور اُس کے ساتھ ساتھ رادھا کی مسرت کا اور رامو۔ وہ تو خوشی سے پاگل سا ہو جائیگا۔ سارے گھر میں اُودھم مچا مچا کر مٹھائی کھائیگا اور پھر رامو کتنا اچھا ہے۔ بڑا ہو کر وہ بھی ایک شاندار گاڑیبان بنے گا۔ اور اپنی رادھا کے لئے تحفے لائیگا

موتیا کے دل میں ایک کھلبلی سی مچی ۔ اُسے خواہش ہونے لگی کہ بیل گاڑی موٹر بن جائے ۔ اور وہ فر فر اڑتا ہوا اپنی سوغاتیں رادھا کے قدموں پر جا کر رکھ دے ۔ ابھی فوراً آنکھ جھپکاتے ـــــ کاش ایسا ہوتا! اُس نے بیلوں کو ٹکارا۔ اُن کے پُٹھے سہلائے اور اُن کی دُم امیٹھی ۔ وہ اپنی بیل گاڑی ہی کو موٹر کی رفتار سے چلانا چاہتا تھا ـــــ انتظار! انتظار! اُس لمحے کا انتظار! جب چمبیلی کا تیل، سیندور اور ٹکلیاں رادھا کو پیش کی جائیں گی۔ رامو دوڑا آئیگا ـــــ اور سارے ٹولے میں ہمسائیوں کے یہاں باتیں ہونگیں کہ رامو کے باپ نے شہر سے بہت ساری چیزیں لائی ہیں ـــــ وہ کیسی مسرت و پندار کی گھڑی ہوگی ـــــ بے چینی کے ساتھ اُس نے پھر بیلوں کو للکارا ـــــ اُس کے دل کی لہر بیلوں سے آگے اُڑی جا رہی تھی۔ بیل پسینے پسینے ہو گئے اور وہ خود بھی جذبات کی گرمی انتظار کی بے چینی اور دھوپ کی حدت سے پسینے میں تر ابور ہو گیا۔ گیارہ کوس کا سفر تھا۔ کبھی موتیا تصورات کے رنگین جال میں الجھا رہتا اور کبھی بے چینی سے بیلوں کو ہنکاتا۔ سہ پہر بھی ختم ہوئی۔ سورج سونا بانٹتا ہوا افق مغرب کی طرف چلا۔ موتیا خیالات و تصورات کے ریشمی جامے بُنتا ہوا گاڑی بڑھائے چلا جا رہا تھا ـــــ رادھا سیندور لگائے، ٹکلی سٹائے کھڑی ہے۔ رامو جلیبیاں کھا رہا ہے ـــــ رادھا مسکرائی، لجائی اور مدبھری آنکھوں سے کوئی نازک سا پیام دے کر کوٹھری میں داخل ہوگئی ـــــ

"پوں! پوں! پوں! گھر! گھر! گر! گر! گر! غوں! غوں! گر! گر! پوں! پوں! پوں! ـــ" ارے سالا! اندھا! ہٹاؤ نہ رے سالا ـــــ پوں! پوں!"

موٹر ٹرک کے ہارن کی مسلسل آوازیں گالیوں سے ملی ہوئی فضا میں گونج رہی تھیں۔

———موتیا اپنے معصوم خیالات میں اب تک گم تھا———

———کھڑدھڑ، زوں دھک دھک، دھک، کھڑاک کھڑکھڑ کھڑ۔ زوں زوں دھک! چن چن چن چناک———اندھا سالا، پکڑو حرامزادے کو۔ . . ! گر سالا! اُلٹ سالا اُلٹ . . . . "

موٹر بیل گاڑی سے آکر ہلکے طور سے ٹکرائی، بھڑک گئے گاڑی ٹیڑھی ہو کر اونچی سڑک سے گرتے گرتے بچی مگر اولار ہو گئی۔ جو اوپر اُٹھ کر موٹر کے سامنے کے شیشے سے ٹکرایا شیشہ چکنا چور بیل سڑک کے نیچے اور موتیا قلابازیاں کھاتا ہوا نیچے کھنتے میں جا گرا۔ ڈرائیور اور کلینر غصے سے لال پیلے، موٹر روک کر موتیا پر ٹوٹ پڑے قصور دونوں فریق کا تھا مگر کمزور ہی پر نزلہ گرتا ہے دونوں نے موتیا کو طمانچہ پر طمانچے مارے، گندی گندی گالیاں دیں اور لات مکا بھی کیا۔ "چھین لو اندھے کے جنے کا دھوتی گمچھا سب" موتیا کو ایک لات لگاتے ہوئے ڈرائیور نے کلینر سے کہا گمچھا پھٹ گیا، دھوتی ڈھیلی ہو کر الجھ گئی اور گرہ سے بندھے ہوئے بارہ آنے پیسے جھولنے لگے "بہرا بیٹی . . . . " کلینر نے بیٹی کی گالی دیتے ہوئے کہا "سالے کے پاس پیسہ ہے۔ اس کی لنگا جھاڑی لیکر سب چھین لو۔ موٹر کا شیشہ ٹوٹ گیا اس کا دام کون دیگا" موتیا مسلسل پٹ رہا تھا۔ آخر کار اُس کے پیسے بھی چھین لئے گئے۔ بارہ آنے پیسے بس یہی اُسکی کائنات تھی۔ وہ بے حس کھڑا تک رہا تھا۔ جیسے اُس کے حواس سُن ہو گئے ہوں۔ ڈرائیور اور کلینر اُسے پیٹ پاٹ اور لوٹ کر چلے گئے۔ ٹرک روانہ ہو گیا اور سڑک کی اڑتی ہوئی دھول موتیا کے سر پر پڑکر اُس کا مضحکہ اڑا رہی تھی———

ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنیں گرے ہوئے سینڈور پر پڑ رہی تھیں چمبیلی کے تیل کی شیشی ٹوٹ چکی تھی اور جلیبیاں دھول سے اٹی ہوئی بکھری پڑی تھیں سینڈور کی سرخی تھی یا مونیا کا دل خون ہو کر بہ گیا تھا۔ اس کے دل میں انتہا نفرت اور انتقام کے جذبات کھول رہے تھے وہ دنیا بھر کی موٹروں کو چور چور کر کے پھینک دینا چاہتا تھا۔ یک بہ یک اسکے دل میں ایک خیال آیا ——— اور جو اس کے پاس ایک بہت بڑی ٹرک ہوتی، بہت بڑی، پربتوں اتنی بڑی ——— تو ——— وہ ساؤجی کی سب موٹر ٹرکوں کے شیشے توڑ ڈالتا اور انہیں کچل کر رکھ دیتا۔

سورج ڈوب گیا اور اس کے خیالات شام کے دھندلکے میں بھٹکنے لگے۔ ادھر کے کھیتوں میں گیدڑ بولنے لگے کیسی بری تھی ان کی آواز مگر یہ ٹرک والے سب سے برے تھے۔

مونیا کو اب اپنی تمناؤں کی بربادی کا احساس ہوا۔ ہولی، ساریاں، رادھا، رامو، ہمسائیاں، سوغات؟ مونیا سر پکڑ کر رونے لگا۔

سینی ٹوریم کا فقیر

فکر و خیال کے لئے سب سے زیادہ موزوں وہ لمحات ہوتے ہیں جنہیں بیکار کہا جاتا ہے ان غیر آباد گھڑیوں کی بے کیفی کو دور کرنے کے لئے تخیل و تصور کی پریاں اپنے نازک اور رنگ برنگ پروں کے ساتھ آتی ہیں اور نو بہ نو نغمے گانے لگتی ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ بھیانک خیالات کا دیو بھی اپنے ناخن و چنگاریاں کے ساتھ ہیبتناک دانتوں کو دکھاتا ہوا بڑھتا ہے اور سارے اعضاء و جوارح میں ایک لرزہ پیدا کر دیتا ہے۔

برسات کی ایک اداس شام کو میں بیگانہ کار سینیٹوریم میں بستر علالت پر لیٹا ہوا تھا، ایک بے رونق سی شام تھی جس میں نور سے زیادہ تاریکی کا عنصر تھا، محروم شفق خاموش بے کیف درد خیز چمن بے رنگ سا معلوم ہو رہا تھا، باغوں میں گہری غمگین خیالات کو ابھارنے والی سیاہی نظر آ رہی

آ رہی تھی ۔ پاگل ہاتھیوں کی طرح سیاہ بادل کے بڑے بڑے بے ڈول ٹکڑے آسمان پر اِدھر اُدھر دوڑ رہے تھے اور قسم قسم کی مہیب اشکال اپنے امتزاج سے بنا رہے تھے ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس اندھی آنکھوں جیسی بے نور و رنگ شام کے بعد آنے والی اندھیاری رات اور بستم خیز ہو گی ۔ ہوا شاید چل رہی تھی لیکن موت کی طرح غیر محسوس طور پر دبے پاؤں ہاں فضا کی بلندیوں پر لکہ ہائے ابر کی حرکت سے ہوا کی حرکت کا ایک ہلکا سا احساس ہوتا تھا میرے بشتیر خیالات و تصورات بھی موسم کے ہم آہنگ تھے جیسے طرح آسمان کی عریاں وسعتوں میں بادل کے مختلف الالوان ٹکڑے تیرتے پھرتے ہیں اور پھر ناگاہ ایک تختۂ وسیع کی صورت میں منضبط ہو جاتے ہیں ۔ بالکل اسی طرح میرے دماغ میں پریشان خیالات کبھی کبھی ایک منظم صورت اختیار کر لیتے تھے ۔ کبھی میں زندگی کے گذرے ہوئے لمحات کا تصور کرتا کبھی مستقبل کے خیال میں غرق ہو جاتا ، اور کبھی حال کی کشاکش پر غور کرنے لگتا ماضی کی رنگینیاں رقص کناں آتیں اور دل میں ایک گداز پیدا کر دیتیں ، آنے والی نامرادیاں بھیانک شکلیں اختیار کر کے مختلف ہیئتوں میں لرزہ خیز ناچ ناچتیں اور کبھی موجودہ مہجوریاں اور بیماریاں ایک مایوس کن اور رقت انگیز حلقۂ خیال میں مجھے گرفتار کر کے دلدوز ہنسی ہنستی ہوئی میرے سر پر چڑیلوں کی طرح سوار ہو جاتیں ۔

اِسی عالم درد و کرب ، حزن و ملال میں دور کہیں سے گیت کی آواز آئی ۔ نغمے کا زیر و بم تھرتھراتا ہوا میری رُوح میں پیوست ہوا جا رہا تھا میرے خیالات و تصورات کا سلسلہ ٹوٹ گیا ایسی ویران شام میں موسیقی کی دلنوازی بہت بڑھی ہوئی تھی معلوم ہو رہا تھا کہ اس دنیا سے پرے بہت پرے کسی رومانی جزیرے میں جو کسی ایسے کُرے میں آباد ہے جہاں کی فضا شفقِ شام

تنویرِ صبح اور نورِ مہتاب کی آمیزش سے بنائی گئی ہے اور جہاں کے سمندر میں مد و جزر کی جگہ صرف نغمہ و موسیقی کا اتار چڑھاؤ ہے، کوئی لطیف ترین مخلوق جس کی لطافت و شیرینی ہمارے بلند ترین قیاس سے بھی فزوں ہے اپنی تمام رنگینیوں کے ساتھ ترنم ریز ہے۔ ماضی و حال و مستقبل سب اِس گیت میں گم ہو کر رہ گئے۔ میری ہستی بھی تھوڑی دیر کیلئے اِس سحرِ نغمہ میں فنا ہو گئی۔ میری کوئی حس اگر باقی رہ گئی تو وہ سماعت تھی اور اگر کوئی خیال باقی تھا تو وہ نغمے کا خیال تھا۔

موسیقی محض موسیقی نے رفتہ رفتہ اپنی مثالی بلندیوں سے اتر کر صوتی تعینات کی قید اختیار کر لی اور اب میں معانی کے علاوہ الفاظ کے اظہار سے بھی متاثر ہو رہا تھا۔ وجدانِ ذوق کے ساتھ ساتھ اب عام حواس بھی کام کر رہے تھے۔ ہمارے وارڈ سے دور نرسوں کی اقامت گاہ میں گراموفون بج رہا تھا۔ گراموفون تو اور دن بھی بجتے تھے۔ لیکن نہ معلوم آج کون ساحر تھا۔ جو ایک نیا جادو جگا رہا تھا ——— آواز آئی ———

روتے روتے انکھیاں بھیو لال رے سانوریا

کیسا درد خیز، سوگوار، دلگیر نغمہ تھا ——— ! آہ کسی کی بڑی بڑی گریاں آنکھیں، میری آنکھوں کے سامنے آ گئیں، فلم کی تصویر کی طرح وہ سارے مناظر گھوم گئے جبکہ میرے انتہائی دورِ علالت میں میری پیاری بیوی دن کا دن اور رات کی رات میرے بستر سے لگی بیٹھی رہتی تھی۔ نہ جانے کتنی مضطر اور گریاں راتیں اُس نے آنکھوں میں کاٹ دیں۔ وہ رو رو کر میرے ساتھ سینیٹوریم آئی یہاں رہنے کا کوئی سامان بھی نہ تھا، پھر بھی وہ والہانہ انداز میں میرا ساتھ دیتی رہی آخر کار

جب یہاں رہنے کا کوئی ٹھکانہ نہ مل سکا تو دل پر پتھر رکھنے کی ناکام کوشش کرتی ہوئی وہ مجبوراً چلی گئی۔ اُس سہ پہر کو جب وہ مجھ سے رخصت ہو رہی تھی ہم لوگ جدا ہونے کے متعلق کچھ نہ بولے محض معمولی گفتگو میں مشغول ہو کر اپنے جذبات کو بہلا رہے تھے۔ آخر وہ جدائی کی گھڑی آہی گئی۔ وہ رو پڑی ، زمزم و کوثر اس کی محبت شعار آنکھوں سے جاری تھے جیسے اُس کا آئینہ تھا اور بس وہ درختوں کے جھنڈ سے ہو کر جھاڑیوں میں اوجھل ہو گئی، وہ پھر پھر کر اُس ہرنی کی طرح دیکھتی جاتی تھی جو اپنے جوڑے کو زخم خوردہ پیچھے چھوڑ آئی ہو۔ وہ چلی گئی۔ لیکن اپنے دل کی دھڑکن اور آنکھوں کی نمی میرے دل اور آنکھوں میں منتقل کر گئی اور جبکہ وہ مجھ سے کالے کوسوں دور ہے نہ معلوم اس کا کیا حال ہو گا ——— !

"روتے روتے انکھیاں بھیو لال رے سانوریا"

اس گیت میں جو معنوی و روحانی اضطراب اور بیکسی پنہاں ہے وہ مجھے بھی بیتاب بنا رہی تھی میرے خیالات کا ریکارڈ نہ معلوم کتنی دیر چلتا رہا۔ جب دماغ کی مشین ذرا رکی تو میں نے محسوس کیا کہ اس گیت کی صرف گونج باقی رہ گئی ہے اور فضا میں ایک دوسرا نغمہ ارتعاش پیدا کر رہا ہے بلتجیانہ آواز بھاری سی، مکرر ۔

غریبوں پہ راکھو دیا بھلا ہو گا بھلا ہو گا . . . "

اس گیت نے میرے جذبات اور ذہن کو خاص طور سے اکسایا۔ سارے تصورات اور افکار محو ہو گئے ، ساری بے چینی اور اضطراب مٹ گئے۔ میرے نہاں خانۂ دماغ کے کسی نامعلوم گوشے سے ایک دھندلی سی تصویر ابھرنے لگی ، میلے کچیلے کپڑے۔ جھکا ہوا قد، ہاتھ میں لاٹھی لئے ،

کپکپاتا ہوا، سر برہنہ، بغل میں پھٹا پرانا ربو سا چھاتا، ایک بوڑھا فقیر میری چشم تخیل کے سامنے آگیا۔ معلوم ہو رہا تھا کہ میرے دماغ کی ساری فضا میں سینا ٹوریم کا فقیر یہی گیت بکھیر رہا ہے۔

"غریبوں پہ را کھو دیا۔۔۔۔ بھلا ہوگا۔۔۔"

بھادوں کا مہینہ تھا۔ ابر کے سرشار گالے پُروائی کے ساتھ افق سے اُبھر اُبھر کر چھائے جا رہے تھے۔ تمام فضا بھیگی ہوئی تھی۔ درختوں کے پتوں پر سے رکا ہوا پانی ٹپک رہا تھا۔ تنے بھیگ کر سیاہی مائل ہو رہے تھے۔ سبزہ شرابور ہو رہا تھا۔ تیز کپکپا دینے والی ہوا سائیں سائیں کرتی ہوئی دیوانہ وار چل رہی تھی۔ رہ رہ کر پانی برس جاتا تھا۔ کبھی آہستہ کبھی موسلا دھار۔ سینا ٹوریم کی چاروں طرف سنسان تھا۔ آوارہ گرد کتے بھی کہیں چھپے چھپائے بیٹھے تھے۔ وارڈ میں مریض کالے کالے کمبل تانے پڑے ہوئے تھے۔ بات چیت بھی بند تھی۔ ہر طرف خاموشی تھی جو کسی بیمار کی کھانسی یا اس کے کروٹ بدلنے سے لوہے کی کچکچی مسہری کی انفعالی چَرچَر سے ٹوٹ جاتی تھی۔ پُروا ہوا کی وحشیانہ ہاؤ ہُو نے ہر آواز کو محو کر دیا تھا۔ ایک بھیگی ہوئی اداس تاریکی دن کے چہرے پر چھائی ہوئی تھی۔ میں وارڈ کی پچھلی جانب سائبان میں اپنے بستر پر لیٹا لیٹا چپ چاپ نیم افسردہ و نیم مضمحل انداز میں پڑا تھا کہ سینا ٹوریم کا فقیر ناتوان لیکن کھردری آواز سے صدا لگاتا ہوا باغ کی طرف سے میرے سامنے والے در پر آ نکلا۔ "کچھ دیدو بابا، کچھ دیدو بابا" تھرتھرائی ہوئی، کمزور آواز تھی جیسے موسم نے اور زیادہ افسردہ اور مضمحل کر دیا تھا۔ پُر اس ملتجیانہ خفیف و

زارِ صدا کی اثر خیزی دو چند سہ چند بڑھی ہوئی تھی۔ یہ معمّر فقیر اکثر وارڈوں میں آیا کرتا تھا سینا
ٹوریم کے قریب ہی ایک بستی تھی وہیں کا یہ رہنے والا تھا جب سے سیناٹوریم کا قیام ہوا تھا وہ
یہاں آکر بھیک مانگا کرتا تھا میں تو سیناٹوریم میں نو وارد تھا۔ پر اسے وارڈوں میں چکر لگاتے
کئی بار میں نے دیکھا تھا اور اکثر اس بوڑھے فقیر کو پیسے بھی دیئے تھے لیکن آج نہ معلوم کیوں
اس کے چہرے بشرے سے ایک غیر معمولی خستگی آشکارا تھی، ویران، خشک، وحشت زدہ صورت
جھریاں زیادہ بھیانک ہو گئی تھیں۔ اُس کے گال اور پیشانی ایک جتے ہوئے لیکن غیر آباد
کھیت کی طرح تھے۔ جھریوں کی ہر تحریر میں صدہا المناک اور غم خیز افسانے مرتسم معلوم ہو رہے
تھے۔ جیسے ریکارڈ کی تحریر در میں اندوہگیں گیت بند ہوں سیناٹوریم کے مریضوں کی کراہ اور موت
کے وقت ان کے عزیزوں کی گریہ زاری شاید فقیر کے چہرے کی جھریوں سے لپٹ کر رہ گئے تھے
فقیر کی آنکھوں میں حلقے پڑے ہوئے تھے، گہرے، سنسان، خوفزا، جیسے کوئی آسیب زدہ اندھا
کنواں ہو۔ اُس کی آنکھوں سے ایک خاص قسم کی شعاعیں نکل رہی تھیں۔ اگر تاریکی سے
شعاعیں نکلتی ہیں تو اُس کی آنکھیں ایسی ہی تاریکیوں کی مخرج بنی ہوئی تھیں۔ اسکی نگاہوں
سے بیکسی، سوگواری، اداسی برس رہی تھی۔ فرقت زدہ دلوں کی تیرگی، ہجر کی سیاہ راتوں کی تاریکی
مایوس مریضوں کی اداسی، غربت کی بیگانگی، افلاس کی سیہ بختی، بوڑھے خمیدہ کمر لرزاں فقیر کی
آنکھوں سے نکل کر میرے دل میں کھچی جا رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں کی سیاہ پتلیوں کی حرکت سے زندگی
کی شور بختی اور ناسازگاری کے واقعات تمناؤں کی محرومی کے حادثات، اجل کی چیرہ دستیوں کے
سانحات میرے قلب پر اس طرح منعکس ہو رہے تھے جیسے کسی المیہ قصّے کے فلم سے تصویریں پردۂ فلم

برعکس ہوتی ہیں۔ وہ تھر تھر کانپ رہا تھا، ناتوانی کی کپکپی سے سردی کی تھرتھری نے مل کر اُسے ہمہ تن لرزشِ مسلسل بنا دیا تھا۔ اُس نے پھر اپنی کھوکھلی آواز میں صدا لگائی۔ ایک ایسی آواز جیسی ہوا کے گذرنے سے رخنہ ور قبروں اور مقبروں کے شکستہ گنبدوں سے پیدا ہوتی ہے

"با۔۔۔۔ با۔۔۔۔۔۔ کچھ۔۔۔۔۔ دو۔ دو۔ و۔۔۔۔۔ بھ۔۔۔ لا۔۔۔۔ ۔۔۔۔ ہو۔۔۔ گا۔۔۔۔۔!" بوڑھا فقیر بیٹھ گیا، اپنی لاٹھی اُس نے سرِ راہ دروازے کے سامنے اپنے پہلو کے قریب رکھ لی۔ وہ تھکا جا رہا تھا۔ نہ معلوم کہاں کہاں کی خاک چھان کر آیا تھا۔ اس کے بوسیدہ سراسر پیوند لگے ہوئے کپڑے بھیگے ہوئے تھے۔ میں نے اس سے دریافت کیا کہ ایسے موسم میں کیوں باہر نکلے ہو۔ اس نے ایک ایسی ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے جیسے کوئی مرنے والا نزع کے وقت سانس لینے کی آخری کوشش کرتا ہو، جواب دیا کہ آج اُسکی رفیق زندگی کی برسی کی نیاز کا دن ہے اور اُسے بستی میں ایک پیسہ بھی نہیں مل سکا۔ لہٰذا وہ سینا ٹوریم کی طرف نکل آیا ہے۔ وہ بیٹھا ہوا تھا پھر بھی اسکی گردن اور سر مختلف زاویوں میں ہل رہے تھے۔ اس کا ممیوں جیسا جھری دار خشک سیاہی مائل زرد ہاتھ کانپ رہا تھا اور دوسرے ہاتھ سے وہ اپنا چھاتا بغل کے اندر دبائے ہوئے تھا۔۔۔۔ وہ خاموش ہو گیا۔ اُس سے زیادہ بولا نہ جاتا تھا میں نے اُسے خوب غور سے دیکھا اور بٹوے سے ایک اکنی نکال کر اسکے آگے پھینک دی۔ اُس نے اُسے استعجاب سے دیکھا اور پھر خوش ہو کر کچھ زیرِ لب بڑبڑایا۔ وہ میری طرف اور سرک آیا اور جوشِ مسرت میں مجھ سے اِس طرح گفتگو کرنے لگا جیسے وہ مجھے اپنا ہمدرد اور ہمدم سمجھتا ہو۔ اس کی آنکھیں نم آلود ہو گئیں اور اس کے اعضا کی تھرتھراہٹ اور بڑھ گئی جس طرح

ابر آلود آسمان پر سیاہ بادلوں کے درمیان کبھی شگاف پیدا ہو جانے سے کوئی تنہا روشن ستارہ نظر آجاتا ہے۔ اسی طرح اس کی نگاہوں کی تاریکی کے درمیان آنسو کا ایک ڈھلکتا ہوا قطرہ چمک رہا تھا۔ وہ مخاطب تو مجھ ہی سے تھا لیکن اس کی نگاہیں کہیں دور بے خودانہ انداز میں جمی ہوئی تھیں۔ میں بوڑھے فقیر کی طرف ایک غیر معمولی کشش محسوس کر رہا تھا۔ لہٰذا نہایت ہی محو ہو کر میں اسکی باتیں سننے لگا۔ اُس کے لہجے میں درد تھا۔ ایک ایسا درد جو برسوں کسی وفادار محبت شعار سینے میں پرورش پا چکا ہو۔ اُس نے مجھے سنایا کہ پانچ سال قبل آج ہی جیسا طوفانی موسم تھا، بوڑھا فقیر اور اسکی بوڑھی رفیقِ زندگی بھوک سے مجبور ہو کر بھیک مانگنے نکلے۔ گھروں کے دروازے بند تھے۔ راستے بھی ویران، اکادُکا اگر کوئی نظر آبھی جاتا تو اُس بے برگ ونوا جوڑے کی طرف بغیر توجہ کئے گذر جاتا، اور ان کی صدائیں بادِ تند کے جھونکوں کے ساتھ بغیر اثر پیدا کئے اڑ جاتیں۔ ان دونوں نے ساری بستی کی خاک چھان ماری ہر گلی میں چکر لگائے ہر دروازے پر صدا لگائی لیکن ان کی کسی نے مدد نہ کی۔ غضب کی سردی تھی۔ بھیگی برسات، ٹھنڈی سطح مرتفع پر چلنے والی تند ہوائیں اُس پر قلتِ خوراک، نہ کپڑا، نہ لتّا۔ بوڑھی فقیرن کو نمونیا ہو گیا اور وہ تیسرے روز مر گئی، بوڑھا فقیر اتنا کہہ کر رونے لگا۔ میں خاموش تھا۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں گویا ہوا۔ اُس نے کہا کہ "میں بھی مرجانا چاہتا ہوں۔ . . . " اُس کی آواز خفیف تر ہوتی جارہی تھی۔ وہ خاموش ہو رہا۔ کچھ وقفے کے بعد اُس نے گردن اٹھائی اور ایک خاص جوش کے ساتھ سلسلۂ کلام جاری کرتے ہوئے کہنے لگا۔ کہ "میں ایک کسان ہوں، لوگوں کے کھیت بٹائی پر جوت کر اپنا پیٹ پالتا ہوں، میرا باپ بھی کسان تھا اور بوڑھی فقیرن کا باپ بھی" جیسے بجھتی ہوئی شمع دمِ آخر بھڑک اٹھتی ہے ویسے ہی اس کی آواز گرم تر و تیز تر ہو گئی۔ وہ کہنے لگا کہ لڑکپن میں ہم دونوں اسی جنگل میں جہاں آپ

سیناٹوریم سے بکریاں چرایا کرتے تھے اور ساتھ کھیلتے تھے۔ پھر ہم لوگوں کی شادی ہوئی اور بچے ہوئے ہمارے دو بیٹے جوان ہو گئے تھے۔ وہ کھیتی باڑی میں ہماری مدد کرتے تھے۔ گاؤں میں ہیضہ پھیلا اور وہ دونوں مر گئے"۔ بوڑھے فقیر کی آواز رکنے لگی۔ اُس کے چہرے پہ یادِ ماضی کے آثار سے رنج و غم کی علامتیں مل کر ایک عجیب کیفیت پیدا کر رہی تھیں۔ اب وُہ زار زار رو رہا تھا، کہنے لگا "بچے مر گئے ہم دونوں بوڑھے ہوتے گئے۔ اب محنت کر کے پیٹ پالنا بھی دوبھر ہو گیا۔ کاش بچوں سے پہلے ہم مر جاتے۔ لیکن قسمت میں دربدر مارے مارے پھرنا لکھا تھا"۔ سیناٹوریم کے فقیر نے اپنا افسانۂ حیات مجھے سنا دیا اور جھک کر زمین کی جانب بے معنی طور پر تکنے لگا۔ اس کی نیم وا آنکھوں سے قطرہ ہائے اشک بہہ بہہ کر اُس کے میلے گودڑ پر ٹپک رہے تھے، اُس کی جھکی ہوئی گردن اور جھکی جا رہی تھی۔ اُس کی تیز تیز سانس سے ملی ہوئی ایک زیرِ لب کراہ کی سی آواز نکل رہی تھی۔ ٹھیک اُس وقت دوشِ ہوا پر ایک وسیع ٹکڑۂ ابر جھوم کر اٹھتا ہوا سر پر آ گیا اور کچھ کچھ پھواریں پڑنے لگیں۔ سیناٹوریم کا ڈاکٹر گھومتا ہوا آ نکلا۔ اُس نے بوڑھے فقیر کو دیکھ کر وارڈ کے ملازموں کو ڈانٹ بتائی کہ اُسے سیناٹوریم میں کیوں آنے دیا جاتا ہے۔ فقیر نکال دیا گیا۔ پانی زور زور سے برسنے لگا۔ فقیر نے اپنا چھاتا کھولا اور کانپتا، ٹھٹھرتا ہوا چل دیا۔ بارش ہو رہی تھی، ظالم ہوا ہڈیوں کے اندر تک پیوست ہوئی جا رہی تھی۔ فقیر بھیگ رہا تھا۔ آہ اس کا چھاتا! وُہ تو اس کے افلاس کا پھریرا معلوم ہو رہا تھا۔ جگہ جگہ سے دھجیاں نکلی آ رہی تھیں۔ ہوا انہیں اڑا رہی تھی اور جو کافی بھیگ گئی تھیں۔ اُن سے پانی ٹپک ٹپک کر فقیر کے جسم کو تر کر رہا تھا اور پرانے لوہے کی ٹوٹی تیلیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ ایک طوفان زدہ کشتی کے بادبان کی طرح ہوا کے تیز جھونکے سے چھاتا قلابازیاں کھا کر فقیر کے ہاتھ سے چھوٹ کر اڑ گیا۔ باورچی خانے

سے چھوکروں نے یہ منظر دیکھا اور تالیاں بجا کر خوب ہنسے۔ کونے کا تزہیں سوئے ہوئے کتے اُٹھ بیٹھے اور غریب فقیر پر بھونکنے لگے۔ سامنے ایک بڑا سا بڑ کا درخت تھا، اُس کے سائے میں جا کر وُہ کھڑا ہو گیا۔ شاید انسانوں سے زیادہ فراخ حوصلہ اور نفع رساں یہ باوقار اور حلیم درخت ہوتے ہیں۔ وُہ کھڑا کھڑا سردی کی شدت سے کانپ رہا تھا، اُس کی سفید داڑھی سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ وُہ کانپ رہا تھا اور اُس کے ساتھ ساری کائنات کانپ رہی تھی۔

دوسرے دن یہ خبر ملی کہ سینا ٹوریم کا فقیر مر گیا۔

کسی ٹوٹے ہوئے دل کی آخری آہ کی طرح اُس کے زار و نزار جسم سے روح نکل گئی ہو گی

ٹن! ٹن! ٹن!!!! شام کی استراحت کا گھنٹہ ختم ہو چکا تھا۔ برقی قمقمے جھک سے جلا دیئے گئے، مریضوں نے کھانسا، کروٹیں بدلیں اور اُٹھ بیٹھے۔ اب بھی نرسوں کے کوارٹر میں گراموفون بج رہا تھا۔ مجھے ابھی تک برقی روشنی کے درمیان سینا ٹوریم کے فقیر کی آنکھوں کی تاریک شعاعیں رقص کرتی ہوئی نظر آ رہی تھیں، اور وہ درخت کے نیچے اُس کی آخری ہچکیاں، یکسانہ کپکپی!!

مریض

"خدا ایک حقیقتِ مطلق ہے اور "مطلقیت" کے لحاظ سے عیب و صواب کا تصور لایعنی ہے "بھلائی" اور "برائی" محض اضافی الفاظ ہیں مگر انسانیت کے لئے خدا اور کائنات کی اضافی حیثیت ہی حقیقت کبرٰے ہے کیونکہ ہم عرش کی سطح سے نہیں دیکھ سکتے اور خدا کی طرح "محسوس" کرنے سے قاصر ہیں ——"

یہ تھے وہ الفاظ جو میں نے جاوید کے روزنامچے کے ایک صفحے پر پڑھے۔ میرا عزیز دوست جاوید عرصے سے بیمار چلا آتا تھا۔ آج میں اُس سے ملنے گیا تھا۔ اُس کے سرہانے چند کتابیں اور ایک کھلی ہوئی ڈائری رکھی ہوئی تھی۔ پاس "فاؤنٹین پن" اس انداز سے پڑا تھا کہ اُسے لکھتے لکھتے یوں ڈال دیا گیا ہو۔ جاوید سے باتیں کرتے ہوئے میں نے مندرجہ بالا تحریر پڑھ لی اور چونکہ ہم لوگ بے تکلف

دوست تھے۔ میں نے ڈائری اٹھاکر پوری تحریر پڑھنی چاہی۔ مگر جب جاوید نے دیکھا کہ میں اس کا روزنامچہ اُٹھاکر پڑھنا چاہتا ہوں تو اُس نے ایک ہلکے شرمیلے پن سے یہ کہتے ہوئے ڈائری خود اُٹھا لی کہ ——

"بہت سی باتیں دل سے ایسی کی جاتی ہیں جن کے متحمل دوسرے لوگ نہیں ہو سکتے۔"

میرے پندار کو ٹھیس لگی، میں نے جواباً کہا

"یا تم دوسروں کی نکتہ چینیوں کے متحمل نہیں ہو سکتے۔"

جاوید کے جذبات کو ایک ہلکی سی چوٹ آئی، اُس نے منفعل ہو کر جواب دیا۔

"ٹھیک کہتے ہو، ہم میں سے بڑے سے بڑا اصاف گو بھی اپنے مصلحانہ دعووں کے باوجود لگی ہے گلی کہنے کے قابل باتوں کو بھی نہیں کہہ سکتا۔ وہ سماج میں انوکھے بننے کے "حیاتیاتی" نتائج سے غیر ارادی طور پر کانپ اُٹھتا ہے۔ اُس کی یہ غیر شعوری جھجک خود حفاظتی کے لئے بڑے کار آمد ہے ——"

"تو کیا تم مجھے غیر سمجھتے ہو؟" میں نے سوال کیا۔

"نہیں" جاوید نے مجھے ڈائری دیتے ہوئے کہا۔ "روزنامچہ اُٹھا لینا محض ایک فطری ردِ عمل تھا یہ ایک "انعکاسی حرکت" تھی جیسے تمہاری اُنگلیوں کے قریب آنے سے میری پلکوں کا جھپک جانا۔"

مَیں نے ڈائری لیکر ایک آدھ صفحہ پڑھا اور اُس کے بعد جاوید خود مجھے جگہ جگہ سے سنانے لگا اُسے تسکین ہو رہی تھی۔ اُس کی روح کا بوجھ ہلکا ہو رہا تھا۔ خیالات و واردات کا بھی بوجھ ہوتا ہے مندرجہ ذیل واقعات جاوید کی ڈائری سے ماخوذ ہیں مگر میں پہلے آپ سے اسکا تعارف

نوکرا دوں۔

جاوید ایک ذکی الحس شاعر تھا اور آغازِ شباب میں اُسے مصوری کا شوق بھی رہا تھا اور کچھ دنوں تک ڈرامانگاری اور اداکاری سے بھی شغف تھا۔ وہ اسکول اور کالج میں نہایت ممتاز رہا۔ تقریر بھی اچھی کر سکتا تھا اور اس سلسلے میں اُسے کئی تمغے بھی ملے تھے۔ یہ سب ایک بلند اور تخلیقی فطرت کی سعی اظہار تھی۔ جاوید تربیتاً مذہبی تھا اور فطرتاً اخلاقی۔ مذہب سے علمی واقفیت بھی رکھتا تھا۔ اُس کی تعلیم بھی کچھ عجیب طرح ہوئی تھی۔ میٹرک کے بعد دو سال سائنس کا طالب علم رہا اور اُس کے بعد میڈیکل کالج میں داخل ہوا۔ یوں تو وہ جنم کا روگی تھا مگر یہاں اس پر سِل کا حملہ ہوا۔ اُسے تیسرے سال میں آکر ترکِ تعلیم کرنا پڑی۔ اُس کے حوصلوں کو سخت دھکا لگا مگر اُس نے سپر نہیں ڈالی۔ دو سال تک نرا دیہاتی بنا رہا۔ کھیت کھلیان اور سیر و شکار بس یہی اسکا مشغلہ تھا۔ اُس کی صحت بحال ہو گئی اور اُس نے میڈیکل کالج کو چھوڑ کر بی اے میں نام لکھا گیا اسی دور میں اُس نے محبت کی اور اُس سے محبت کی گئی۔ شاید یہ محبت ہی کا اعجاز تھا کہ وہ ایک خطرناک بیماری سے شفایاب ہو گیا۔ وہ کسی کے لئے زندہ رہنا چاہتا تھا۔ زندہ رہنے کی شدید خواہش اکثر ضامنِ حیات ثابت ہوتی ہے۔ بی اے کے دوسرے سال میں اس کی شادی اپنی "پرستیدہ تمنا" سے ہو گئی۔ جس طرح زلزلے کی تباہ کاریوں کے بعد آفت رسیدہ لوگ ازسرِ نو مکانات تعمیر کر کے رس بس جاتے ہیں۔ ویسے ہی جاوید بھی اپنے ارمان و تمنا کی سوکھی ہوئی بیلوں میں نئی کونپلیں پھوٹتی ہوئی دیکھ رہا تھا۔ اُس نے انگریزی ادب میں آنرز کے ساتھ اعلیٰ نمبروں سے بی اے پاس کیا مگر دورانِ امتحان میں اس پر اُس کے پرانے مرض کا شدید حملہ ہوا اور جب نتیجہ نکلا

تو وہ اس حال میں تھا کہ اس کی زندگی موت سے برسرِپیکار تھی۔

جاوید کو سینا ٹوریم بھیج دیا گیا۔ حیات کے لئے انسان کو اکثر اپنے اوپر موت طاری کرنی ہوتی ہے۔ زندگی کی قیمت زندگی ہی ہے۔ سینا ٹوریم ایک سطح مرتفع پر واقع تھا۔ زندگی کے ہنگاموں سے دور۔ تہذیب کی نبض یہاں دھیمی بہت دھیمی محسوس ہوتی تھی۔ اُونچے ٹیلوں اور شاداب و ساکن جنگلوں کے درمیان اسپتال تھا۔ سل ودق کے مریضوں سے بھرا ہوا۔ جاوید کو ہلنے جلنے کی ممانعت تھی۔ وہ مہینوں اس طرح پڑا رہا ہے جیسے حنوط شدہ لاش۔ مگر وہ محسوس کرتا تھا اپنے دکھوں کو دوسرے کے دکھوں کو، شکستِ تمنا کو، لٹتی ہوئی صلاحیتوں کو، سسکتی ضائع ہوتی ہوئی زندگی کو، دم توڑتی ہوئی انسانیت کو۔ اور وہ محسوس کرتا تھا تقدیر کو، اعمال کو اور خدا کو۔

جب اُسے اُٹھنے بیٹھنے کی اجازت ملی تو اُس نے اپنی دکھی اور بیمار زندگی کو کتابوں کے کھلونے دیکر بہلانا چاہا۔ وہ پہلے بھی علم ہیئت، علم کیمیا، حساب، علم الادویہ، تشریح، حیاتیات، افعال الاعضا، معاشیات، اور ادب و انتقاد کالجوں میں پڑھ چکا تھا اور شوقیہ اُس نے فلسفہ و نفسیات، مذہبیات کا مطالعہ بھی کیا تھا۔ سینا ٹوریم میں وہ ادبیات، جنسیات اور اخلاقیات سے اُلجھتا رہا۔ اُس نے لینن کی سوانح حیات بھی پڑھی۔ وہ کتابوں میں سکون کی تلاش کرتا تھا اور اُسے ہیجانِ دماغ و اضطرابِ دل حاصل ہوتا تھا۔ وہ جبر و قدر کی گتھیاں سلجھاتا، جزا و سزا کے متعلق رائے زنی کرتا، موت کے بعد آنے والی زندگی کے تصور میں غرق رہتا۔ کبھی انسانیت کے نشہ میں چُور ہو جاتا اور انقلاب کا قرنا پھونکنا چاہتا اور کبھی وہ رومان کے رنگین و خواب آسا جزیروں میں کشتیٔ ہلال پر سوار ہو کر جاتا اور وہاں شاہدانِ سیم تن کے مشک افشاں گیسوؤں سے کھیلتا۔

پھر وُہ دور آیا کہ جاوید نے ساری کتابوں کو یہ کہہ کر پرے پھینک دیا کہ —— "این دفترِ بے معنی غرقِ مئے ناب اولے!" اب اُسے بُری طرح زندگی کی محسوس حقیقتوں کی پیاس تھی۔ اسکے اندر زندہ رہنے کی بے پناہ خواہش اُبھر آئی تھی وُہ چاہتا تھا کہ ہر لمحہ اپنے نفس کو یقین دلائے کہ وُہ زندہ ہے۔ وہ اپنی روح کو زندگی کا، اتصالِ جسم و جان کا، اپنے ہر عضو، اپنے ہر قوے سے ثبوت دینا چاہتا تھا۔ اس کی صحت بھی ترقی کر رہی تھی۔

صنفِ مقابل زنگار ہے۔ جب یہ زنگار زندگی کے شیشہ میں لگ جاتا ہے۔ تو ہم اُس میں اپنی خودی کو دیکھتے ہیں۔ مرد اپنی مخفی و جلی صلاحیتوں کو اُس وقت تک رُوبرو نہیں دیکھ سکتا جب تک اُسے اُس نازک وسریع الحس "برقِ پیما" کا توسط حاصل نہ ہو جائے، جسے عورت کہتے ہیں اور سینا ٹوریم میں یہ صنف پائی جاتی تھی نرسوں کی شکل میں وہ نرم خو ہمدرد، آغوش کشا دخترانِ کلیسا۔ کبھی جاوید کی پیاری بیوی . . . . اُس کی چشمِ تصور کے سامنے انگشتِ انتباہ بن کر کھڑی ہو جاتی اور اُسے جھرجھری سی آجاتی مگر اُس کیساتھ کتنی محرومیاں اور بدنصیبیاں وابستہ تھیں اِس کی بدقسمت شریکِ حیات کی اور کنبہ والوں کی —— جاوید ان باتوں کو بھول جانا چاہتا تھا وُہ شراب پی کر مدہوش ہو جانے کا آرزومند تھا۔ وُہ ہر اُس چیز سے بھاگنا چاہتا تھا جو اُسے "عشرتِ نشہ" سے محروم کر کے "اذیتِ خمار" میں مبتلا کر دے۔ اُن ہی دنوں عید آئی مگر جاوید ہلالِ عید سے آنکھیں چار کرنے سے ڈرتا تھا۔ اُس کے تصور میں ہلالِ عید اُس لب کی طرح تھا۔ جو طنز کرتے وقت کج و خمدار ہو جاتا ہے۔

مگر کبھی ان خود فراموشیوں کے درمیان گھر سے آیا ہوا کوئی خط کشیدہ کڑھے ہوئے رومال یا تکیہ کے غلاف جاوید کے تخیل کو ماضی کی حدود میں دھکیل دیتے تھے اور وہ شب کی تنہائیوں میں خاموش آنسوؤں کے موتی مقدس یادوں کے مندر پر چڑھاتا اور وہاں ایک دیوی محبت کی غمگینی سے زیر لب مسکراتی ہوئی براجمان ہوتی اُس کے جذبات دیوی کے قدموں پر سجدہ ریز ہو جاتے اور پھر اُسے خدا یاد آتا۔ رحم و قدرت کے عرش پر متمکن۔ وہ بیتاب ہو ہو کر دعائیں کرنے لگتا۔ نہیں معلوم کیا کیا۔ اس حالت میں اُسے نیند کی مہربان آغوش میں سکون، وقتی سکون حاصل ہو جاتا۔

جاوید ان ہی کیفیات میں مبتلا تھا کہ اُس کی بیوی اُس سے ملنے سینا ٹوریم آئی۔ وہ اس افیونی کی طرح جسے پانی کے چھینٹوں سے جگایا جائے۔ جاگا مگر ایک اعصابی کرب کے ساتھ۔ شاہینہ اُس ویرانے میں مہینوں ٹھہری ایک ٹوٹے پھوٹے سنسان مکان میں جاوید اور شاہینہ روز ملتے تھے، شاہینہ جاوید کی گمراہیوں کیلئے داروئے شفا بن کر آئی اور یہی وجہ تھی کہ وہ گاہے گاہے اُس سے لڑ پڑتا تھا۔ اُس مریض کی طرح جو زخم دھلنے کے وقت چیختا ہے۔ شاہینہ نے، اُس یوگی کی طرح جو اپنی تپشیا سے پرمیشور کی دیا کو جیت لیتا ہے، جاوید کی فریفتگیوں کو پھر ایک بار اپنے لئے مخصوص کر لیا۔ لق و دق صحرا میں بھٹکتا ہوا مسافر جیسے قندیل رہبانی سے راہ پاتا ہے۔ ویسے ہی جاوید شمع محبت کی روشنی سے ہدایت پا گیا۔ مگر اس نور میں زخمہائے حوادث زیادہ صاف طور پر دکھائی دینے لگے۔ وہ مغموم رہنے لگا۔ نیکیوں کے ساتھ ایک مقدس مغمومیت لازمی ہے۔ اب وہ روبہ صحت ہو رہا تھا۔ سینا ٹوریم کی آب و ہوا اکثر مسیحائی کر جاتی ہے۔ اس پر مستزاد وقت کی پابندی، مقوی غذا اور کافی سے زیادہ آرام۔ جاوید اب حقیقی زندگی اور فرائض کے بار کو اپنے تخیل میں تول رہا تھا۔ اُف فرض کا خیال

بھی کتنا وزنی ہوتا ہے اور اگر فرض کے خیال کے ساتھ امید کی روشنی نہیں ہوتی تو یہ کتنا روح فرسا ہو جاتا ہے!

جاوید کے دل میں بھی امید کی روشنی نہ تھی مگر وہ قطعی مایوس بھی نہ تھا، بلکہ اُس پر ایک بیحسی سی طاری رہتی تھی اور یہ بے حسی بار اوی تھی ——— دراصل اُس کے نفس میں ایک کشاکش تھی بیم و رجا کی۔ اس اذیت سے نجات حاصل کرنے کیلئے اُس کے نفس نے کروٹ لی بیحسی کا خاتمہ ہو گیا اور اب وہ ڈرامانگاری و اداکاری میں غرق تھا۔ آرٹ کی تخلیق یا تو وسعت و انبساط کے عالم میں ہوتی ہے یا تحدید و پابندی کی حالت میں۔ وہ فطرتیں جو ایک دنیا سے سیر ہو جاتی ہیں دوسری دنیا کی تخلیق کرتی ہیں اور وہ فطرتیں بھی خالقِ فن ہوتی ہیں جو اس دنیا کی محرومیوں سے تنگ آ کر عالمِ نو کی تعمیر پر مجبور ہوتی ہیں سیناٹوریم میں اور بھی چند نوجوان تھے جو کم و بیش اسی طرح کی زندگی بسر کر رہے تھے ایک مجلسِ ڈرامہ قائم ہو گئی اور خاص اہتمام کے ماتحت ڈرامے کھیلے جانے لگے۔ جاوید ناظم تھا، اداکار تھا اور ڈرامہ نویس۔ نرسوں نے بھی ڈرامے کھیلے اور اب وہ بیمارستان اپنی بستیِ آبادی کے لئے رومانستان تھا۔

شاہینہ واپس جا چکی تھی۔ اُس کے جانے کے بعد جاوید پر افسردگی طاری رہنے لگی وہ اپنی نئی مشغولیت میں بھی شاہینہ کو بھول نہیں سکا۔ وہ بالکل صحتیاب ہو چکا تھا موسم بھی اچھا تھا لہٰذا جاوید سیناٹوریم کو خیر باد کہہ کر وطن روانہ ہو گیا۔

اب جاوید وطن میں تھا جو ڈیڑھ سال کی غریب الوطنی کے بعد ایک ایسا فردوس معلوم ہو رہا تھا جس کی بازیافت ہوئی ہو اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ڈیڑھ سال تک ایک خواب دیکھتا رہا ہے ایک ایسا

خواب جس میں غمناکیاں زیادہ تھیں اور مسرتیں کم۔ اُسے وطن کا ذرّہ ذرّہ مہر در آغوش معلوم ہو رہا تھا اور وُہ محسوس کرنا چاہتا تھا کہ وُہ کبھی بیمار نہیں تھا۔ اُس کے لئے زندگی زیادہ روشن، زیادہ پر معنی ہو گئی تھی۔ وُہ ماضی و مستقبل کو بھول کر صرف "حال" کو دوام بخشنے کا آرزومند تھا مگر آفتاب نصف النہار پر کبھی نہیں رہ سکتا۔ فریبِ خیال بھی حقیقت کے سامنے بکھر جاتا ہے۔ جاوید کو کچھ دنوں کے بعد اپنی محرومیوں اور حدبندیوں کا احساس بری طرح ہونے لگا۔ "تم مریض ہو! مریض ہو! دُنیا کی وسعتیں تمہارے لئے بند ہیں، یہ عارضی صحت ہے، تم مریض ہو!" یہ آوازیں اُس کے کان میں آتیں۔ وہ پاگل ہو جاتا! ایک اضطراب، ایک ہیجان، ایک شورش اُس کے دماغ میں پیدا ہوتی اور وُہ چاہنے لگتا کہ "زمانہ" کے جگر کو چھید کر رکھدے، ماضی کے اثرات کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دے اور تقدیرِ خداوند تقدیر کو معطل کر دے وُہ اُن حدود کو بھی توڑ دینا چاہتا تھا جن کے اندر وُہ معمولی حالت میں رہنا پسند کرتا۔ بے عملی اُس کے لئے ناممکن تھی۔ وُہ مختلف مشاغل میں منہمک رہنے لگا اور رفتہ رفتہ اُس کے دل میں اعتماد پیدا ہونا شروع ہوا۔ یہ امید کا پیش خیمہ ہے۔ اس سے قبل تو وُہ امید کرنے سے بھی ڈرتا تھا جیسے کوئی چشم کا مریض آفتاب کی کرنوں سے خوف کھائے مگر جب آنکھیں اچھی ہونے کو آتی ہیں تو کمرے کی کھڑکیاں کھول دی جاتی ہیں اور پھر سنہری دھوپ کی طلب ہوتی ہے۔ تقدیر جاوید کے ساتھ تھی۔ اور اُسکی صحت بہت اچھی طرح قائم۔ اُس کے دل کی کھڑکیاں بھی کھلنے لگیں اور اُس کے اندر امید کی کرنیں داخل ہو رہی تھیں۔ جاوید اب آشا کی روشنی میں اپنی زندگی سدھارنے کا متمنی تھا۔

اُس نے ایم۔ اے کی تیاری شروع کر دی اور شریکِ امتحان ہو کر نہایت شاندار طور پر ایم۔ اے پاس بھی کر لیا۔ اُس کے حوصلے بڑھے ہوئے تھے اُسے میدانِ عمل مل گیا تھا اور مستقبل میں نئی وسعتیں

اس کی جولانگاہ بننے والی تھیں۔ ان دنوں وہ سرگرمِ عمل تھا۔ وہ علم و ادب کی خدمت میں مشغول تھا اور معاش کی تلاش بھی کر رہا تھا۔ آخر الذکر امر میں اُسے ناکامی پر ناکامی ہوتی۔ بعض نوکریاں اُسے اِس لئے نہیں ملیں کہ وہ سینا ٹوریم سے واپس آیا ہوا مریض تھا۔ جاوید کی امیدوں کا طلسم ٹوٹنے لگا۔ وہ کشتیِ شکستہ کی طرح بے سہارا ہو جاتا اگر ادب کی جل پری اُس کی محبوبہ نہ ہوتی۔

ابتلاء و آزمائش جاوید کے لئے مقدر تھی۔ وہ عروسِ ادب کے گیسوؤں سے کھیل ہی رہا تھا کہ یک بہ یک اس پر وجع المفاصل کا شدید حملہ ہوا۔ درد و اضطراب کے عذاب میں وہ ایک ماہ تک مبتلا رہا۔ جوڑ جوڑ میں درد، بند بند میں سوزش، وہ بستر پر جنبش کرنے سے بھی قاصر تھا۔ وہ "درد ہے جاں کے عوض ہر رگ و پے میں ساری" کی تفسیر تھا۔ دکھ، بیکلی اور خوف اس پر ہر وقت طاری رہتے موجودہ مرض کا عذاب اور گذشتہ بیماری کے اعادہ کا خوف جاوید کیلئے سوہانِ روح ہو رہا تھا اُس کے لئے رات اور دن یکساں تھے۔ کیونکہ مارے درد کے سو نہیں سکتا تھا۔ بخار سے بھنا ہوا زندگی کا ایک مکروہ سوانگ بنا وہ بستر پر سکڑا سکڑایا، کراہتا، چیختا پڑا رہتا۔ بے آس، مضطرب، مضمحل، وہ گھلتا جا رہا تھا۔ جلتا رہا تھا، فنا ہو رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس کی ہستی ایک دردناک کراہ بن کر فضا میں گم ہو جائے گی۔ اُس کا چہرہ بعض اوقات شدید طور پر مشتعل نظر آتا۔ اُس کی مٹھیاں بھنچ جاتیں اور وہ غیر واضح طور پر بڑبڑاتا ہوا انسانی دنیا

شاہینہ ایک وفا سرشت ہستی تھی۔ اُس کا دل یکسر سوز و گداز تھا۔ محبت کرنے کے بعد اُس کے اندر ایک خاص نوع کی الوہیت پیدا ہو گئی تھی اور یہی اُس کی مصیبتوں میں کام آئی۔ شادی نام تھا اس کے لئے ابتدائے آلام کا۔ لیکن دکھوں کو اُس نے ایک تیاگی کی طرح برداشت کیا۔

وہ سیناٹوریم کے ویرانوں میں مہینوں جاوید کے لئے جوگن بنی رہی اور اب بھی وہ زاہد شب زندہ دار کی طرح اُس کی خدمت میں مشغول تھی۔ لیکن جاوید گاہے گاہے شاہینہ کی خدمتوں سے چڑ جاتا۔ وہ چاہتا تھا کہ شاہینہ ایسی نہ ہوتی۔

ایک ماہ کی اذیتوں کے بعد جاوید اچھا ہونے لگا صحت اور بیماری کے درمیان کا عرصہ بھی کافی وسیع تھا۔ وہ بہت لاغر ہو گیا۔ زندگی کی دشواریوں کا مقابلہ کرنے سے زیادہ عاجز۔ وہ ابھر رہا تھا کہ اُسے پھر مٹایا گیا۔ اُس کے دل میں ایک خاموش خلفشار اُٹھ رہا تھا۔ وہ اپنی روح پر مذہب و اخلاق کے بندھنوں کو کمزور پا رہا تھا۔ وہ ایک بے اُمید، بے مستقبل انسان تھا۔ تقدیر کے تلون کا شکار۔ امید نہ بھروسہ ایمان کی بقا معلوم۔ اُس کے سامنے کوئی مقصد نہ تھا۔ اُس کے اعمال کے پیچھے کوئی خاص ارادہ نہ تھا۔ وہ ڈانواں ڈول ہو رہا تھا۔ بغیر کسی تمنا کے بغیر کسی خوف کے۔ وہ خدا کو بھول جانا چاہتا تھا کیونکہ خدا کو بُرا کہنے کی ہمت نہ رکھتا تھا۔ لیکن بعض اوقات اُس کی مذہبیت اُبھر کر اس کے نفس کو فرض کی طرف متوجہ کرنا چاہتی۔ پھر ایک تاریکی پیدا ہوتی اور اُس کی روح پر چھا جاتی اُس تاریکی میں سے کوئی کہتا ہوا سنائی دیتا کہ "اعمال کی سزا صرف اس لئے ہے کہ انسان صاحب ارادہ ہستی ہے مگر ارادہ خدا تو نہیں کہ بغیر سبب کے پیدا ہو جائے۔ ارادہ خود مخلوقِ اسباب و علل ہے جن پر انسان کا کوئی قبضہ نہیں۔ پھر جزا و سزا کیا؟ اور اگر ارادہ خود خدا ہے تو نتیجہ ایک ہی ہوا۔ ارادہ نفس کی ایک کیفیت ہے اور کیفیت اندرونی کیمیاوی اور برقی تغیرات نیز بیرونی تحریکات کا نتیجہ ہوتی ہے۔ ناقابلِ تسخیر غیر شعوری قوتوں کے سامنے ارادہ کی بے بسی روزمرہ کا مشاہدہ و تجربہ ہے۔ ارادہ ہمارے افعال و اعمال پر حاکم نہیں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ خود ارادہ نفسِ تحت الشعور کا غلام ہے"

اور اس تحت الشعوری قوت کی تخلیق زمانہ اور ماحول کرتا ہے"۔ اس آواز پر جاوید زیادہ کان دھرتا ان ہی دنوں اُس نے سیاسیات اور اشتراکیت کا مطالعہ شروع کیا۔ اُس کے لکھے ہوئے افسانوں میں زندگی کی تلخ حقیقتیں زیادہ نظر آنے لگیں۔ باوجود مجبوری و معذوری پر ایمان لانے کے وُہ سارے نظام سے بغاوت کرنی چاہتا تھا اور خدا سے بھی۔ مگر آخر الذکر امر کی اُس میں تاب نہ تھی۔ اُس پر اُس دَور میں اور بھی مصائب آئے اور بیکاری کی مصیبت و لعنت ان پر مستزاد۔ جاوید کا خاندان معاشی تنگی میں مبتلا ہو رہا تھا۔ اُن ہی پریشانیوں میں اُس کی صحت خراب ہوتی گئی۔ ڈاکٹروں نے اُسے تبدیلیٔ آب و ہوا کا مشورہ دیا اور وُہ تنہا ایک صحت افزا مقام کو چلا گیا۔ روپے کی تنگی کے سبب وُہ ایک نہایت ہی معمولی مکان میں ٹھہرا۔ وُہ مسکن مکان سے زیادہ ایک جھونپڑا تھا۔

—— جاوید کی زندگی اُن دنوں ایک سادھو کی سی بسر ہو رہی تھی۔ وُہ اپنی کٹیا سے باہر اگر نکلتا بھی تھا تو جنگل کے متصل میدان میں۔ اور رات کو آسمان کی چھت کے نیچے کھاٹ پر پڑا رہتا۔ اُس کا ایک وفادار مقامی ملازم اُس کے پاس سوتا تھا۔ ماحول کا اثر طبیعت پر بہت پڑتا ہے۔ فضا کی معصومیت جاوید کی رُوح میں سرایت کر رہی تھی۔ وُہ اپنے اندر ایک پاکیزگی محسوس کرتا تھا۔ وُہ اپنے نفس میں تیاگ کی کیفیت کو بیدار کرتا ہوا پاتا تھا۔ وُہ مقام آبادی سے بہت دور تھا۔ ہر طرف فطری مناظر تھے اور کھیتوں کا ابدی سکون۔ فطرت کی آغوش میں جاوید ماں کی محبت کی قسم کے ایک روحانی فیض کا تجربہ کر رہا تھا۔ اُس کے ذہنی و روحانی زخم مندمل ہو رہے تھے۔ حیات کی کامرانیوں اور ناکامیوں کو وُہ یکساں "مایا" سمجھنے لگا تھا۔ یہ احساس اُسے وجدانی طور پر ہوا اور اُسے ایک روحانی بصیرت بخش گیا اور ایک آسمانی مسرت میں کی ایک گرم دوپہر کو جاوید

اپنے جھونپڑے میں تنہا لیٹا ہوا تھا۔ یک بیک اُس کے دل پر رقت طاری ہوئی اور وہ رونے لگا اور خوب رویا۔ پھر وُہ اُٹھا اور خدا کے آگے سجدہ ریز ہو گیا۔ عرصہ سے اُس نے نمازیں ترک کردی تھیں۔ اب وُہ نہایت خلوص سے قائم الصلوٰۃ ہو گیا۔ یہ قابلِ رشک زندگی وُہ بسر کرنی چاہتا تھا کہ شاہینہ اور جاوید کے چند عزیز گھر سے آئے۔ جاوید کو مکان تبدیل کرنا پڑا۔ وُہ پہلے تو بہت خوش ہوا۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد اُس نے محسوس کیا کہ اسکا سکون مٹتا جا رہا ہے۔ دُنیا پھر اُس کے پاس آگئی تھی اور جاوید کے لئے دُنیا کے پاس کیا تھا۔ محرومی ہستی اور بیماری!

دوسرے مکان میں جا کر جاوید کی رگِ مقابلہ پھڑک اُٹھی۔ وُہ دُنیا کی ہر شے سے مقابلہ کرنا چاہتا تھا اور زندگی کے اصول وضوابط میں ایک ایسی تبدیلی کا آرزومند تھا جس میں اُس کیلئے کوئی جگہ ہو۔ وُہ موت وحیات کے آئین کو یکسر بدل دینا چاہتا تھا۔ اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وُہ شاہینہ سے اور اپنے اعزا سے بات بات پر اُلجھنے لگا۔ جا و بے جا اُسے جوش آجایا کرتا۔ اُسکی روح آثارِ حیات کی سُرخی و رونق کو قریب پاکر آمادۂ پیکار تھی۔ دُنیا اُس کیلئے خطرے کا نشان تھی

جاوید صرف ایک دو ماہ کے لئے برائے تبدیلِ آب و ہوا اس جگہ آیا تھا مگر اُسے یہاں چار ماہ رہنا پڑا۔ وُہ یہاں صحت کی ترقی کیلئے آیا تھا مگر اُسے حرارت رہنے لگی۔ ڈاکٹروں کو باعثِ حرارت کا پتہ نہ چلا۔ کبھی سل کے زخموں کے ہرا ہو جانے کا شبہ ہوتا اور کبھی وجع المفاصل کی تحریک کا۔ طبی مشورے کے ماتحت اُسے زیادہ وقت پلنگ پر گذارنا پڑتا۔ سیر کی اُسے مطلقاً اجازت نہ تھی۔ دوائیں بھی بے اثر ثابت ہو رہی تھیں۔ جاوید نہایت صبر وضبط سے اس سزا کو برداشت کر رہا تھا اُس کے اعزا واپس چلے گئے تھے۔ صرف شاہینہ رہ گئی تھی۔ وُہ اکثر شاہینہ سے بیزار رہتا اور

نوبت لڑائی تک پہنچ جاتی مگر وُہ ان دنوں خدا سے بیزار نہ تھا۔ وُہ صبر و رضا کی تصویر بننی چاہتا تھا۔ وہ اپنے دل کے اندر اُٹھتے ہوئے سیلاب کو روکنا چاہتا تھا اور روک رہا تھا۔ سیلاب کی راہ میں رکاوٹ شدید کف پیدا کر دیتی ہے۔ جاوید کا مزاج کف آلود ہو رہا تھا۔ اُس کی فطرت کی سطح پر سنجیدگی، خشونت طنز اور استہزاء کا کف اُٹھتا رہتا تھا۔ شاہینہ رنجیدہ تھی کہ جاوید اُس سے بہیمانہ برتاؤ کیوں کر رہا ہے۔ اُسے توقع نہ تھی کہ وُہ ایسا بے درد ہو جائے گا۔ مگر وُہ ایسا ہو گیا تھا۔ اس کی فطرت کی لطافت اس طرح غائب تھی جیسے جلیٹھ کے مہینہ میں کھیتوں سے سبزی مفقود ہو جاتی ہے۔ شاہینہ رونے لگتی۔ جاوید بہت دیر تک بے حسی سے اُسکے رونے کو دیکھتا رہتا اور کچھ تلخ و تند باتیں کہہ دیتا۔ شاہینہ ایک آئینہ تھی جس میں جاوید اپنی بے دست و پائی، دست نگری، نکھٹو پن کی شبیہہ دیکھتا تھا اور جھلاکر اس شیشہ ہی کو توڑے دیتا تھا جس میں ایسی بُری شکل نظر آتی تھی۔ یہ آئینہ اُس کی خودی کا منہ چڑا رہا تھا۔

اسی طرح مہینے گذر رہے تھے۔ برسات آئی اور وُہ ساری سطح مرتفع دیوانہ وار چلنے والی سرد و تند ہواؤں کی بازی گاہ بن گئی۔ ایک روز زوروں کی بارش ہوئی۔ جھڑی تو بہت دنوں سے لگی ہوئی تھی۔ ہر طرف نمی تھی۔ فضا ابر آلود ہو رہی تھی۔ بارش جو ذرا تھمی تو جاوید قریب کی بستی کی طرف چلدیا۔ ایک ہفتہ عشرے سے اُسے ٹہلنے پھرنے کی اجازت مل گئی تھی۔ وُہ رو بصحت تھا۔ ان دنوں اُس پر ایک مذہبی کیفیت طاری تھی۔ وہ مقامی جنگلی قوم کے افراد کو مذہب کی تبلیغ کرنے گاؤں گیا تھا۔ راہ میں اُسے بارش نے آ لیا اور واپسی کے وقت وُہ بھیگتا ہوا آیا۔ دوسرے روز اُس نے تمام جوڑوں میں درد محسوس کیا اور پھر اُسے شدید بخار آ گیا۔ وُہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گیا۔

اسی بخار و درد کی حالت میں دست بدست دیگرے و پا بدست دیگرے وُہ وطن کو لوٹ آیا اور شہر کے جنرل اسپتال میں داخل ہو گیا۔ وُہ کیف رضا و صبر کی حالت میں اِن اللہ مع الصابرین کی لذت کو محسوس کر رہا تھا اور اپنے اندر ایک بالیدگی پا رہا تھا۔ ہر چند کہ وُہ اسپتال میں تھا۔ پھر بھی وُہ خوش تھا تبدیلی اکثر باعث مسرت ہوتی ہے۔ یہاں اُس کے دوست احباب آ کر اُس سے مل جاتے تھے اور اس کا غم ہلکا ہوتا رہتا تھا۔ دو روز کے بعد اُس کا بخار اُتر گیا تھا اور درد رفع ہو چکا تھا۔ وُہ سمجھ رہا تھا کہ ایک دو ہفتہ میں وُہ اچھا ہو جائیگا اور آزادی سے ہر جگہ جا آ سکے گا۔

ٹھیک چودھویں روز اُس نے پھر جوڑوں میں درد محسوس کیا اور اُسے حرارت ہو گئی۔ ڈاکٹر آیا اور اُس نے دل کا معائنہ خاص طور پر کیا۔ "درد و حرارت زائل ہونے کے بعد بستر پر تین ماہ کامل آرام" ڈاکٹر نے سینہ پر سے اسٹرتھسکوپ اُٹھاتے ہوئے کہا۔ "کل سے وجع المفاصل کا انجکشن لینا شروع کرو"۔ ڈاکٹر چلا گیا اور جاوید پر بجلی سی گری۔ اُس نے اپنے چند دوستوں سے جو میڈیکل کالج میں اُس کے ہم جماعت تھے اور اب ڈاکٹر ہو چکے تھے۔ پوری کیفیت دریافت کی ہر چند کہ اُن لوگوں نے اُسے بہت تسکین دی مگر وہ اتنا تو سمجھ گیا کہ وجع المفاصل کے مزمن ہو جانے سے اُس کے قلب کی پہلی حرکت کمزور ہو گئی ہے اور عضوی اختلال کا خوف ہے۔ اُس پر سکتہ طاری ہو گیا۔ اُس کا دماغ کچھ سوچنے سے ڈرتا اور اُس کا دل محسوس کرنے کے فرض سے گریز کرتا تھا اور اُس کی آنکھیں آنسو بہانے سے قاصر تھیں۔ دن بھر وُہ اسی حالت میں پڑا رہا اور رات کو مریضوں کی کراہوں کے درمیان جاگتا رہا۔ صبح کو آفتاب نکل رہا تھا مگر اس کی زندگی کیلئے کوئی روشنی نہیں تھی۔ اُسے اپنی علالت کے سات طویل سال ایک تاریک رات کی طرح

محسوس ہو رہے تھے جیسے کبھی کبھی بجلیاں کوندی تھیں۔ اُسے دو ایک قدم آگے بڑھانے کے لئے اُس کے انجام کی طرف اور وہ انجام اب آگیا تھا ـــــ زندگی شکن عمیق غار! موت کا خیال آتے ہی اُس کے سارے جسم میں ایک خوفناک جھرجھری دوڑ گئی۔ کوئی سہارا نہیں! کوئی آسرا نہیں!! اور اگر وہ زندہ بھی رہا تو ایک مجہول، اپاہج، دُکھی زندگی بسر کرنے کے لئے۔ اس کی صلاحیتیں فنا کی جائیں گی۔ اُسے سسک سسک کر کراہتے ہوئے بیماری کی قید میں دم توڑنا ہوگا۔ یہ صبر و ضبط، یہ ہمت اور ارادے، یہ استقلال و امید سب لاحاصل! اسپتال میں اس کے چاروں طرف زندگی کا شور تھا۔ مگر روگی جیون کا، دُکھی زندگی کا "سارکوما" کے مریض گھل گھل کر مر رہے تھے۔ ہر طرف درد و غم تھا۔ ہر سو آہ و بکا تھی۔ اس کے پلنگ کے سامنے ایک نمونیہ کا روگی تین دن سے حالتِ نزع میں تڑپ رہا تھا۔ موت کا وحشیانہ رقص اور اُس کے دلدوز قہقہے فضا پر چھائے ہوئے تھے۔ حیات سسک رہی تھی۔ درماندگی، ہلاکت کے پنجے پھیلے ہوئے تھے۔ اور مسرت منہ چھپا کر گریہ کناں تھی۔ جاوید اسی طرح موت کی بازیگاہ میں ایک ماہ پڑا رہا۔ اُس کا مرض کابوس کے بھوت کی طرح اُس کے سینہ پر سوار تھا۔

اِس روح فرسا ماحول سے اکتا کر جاوید اپنے ایک عزیز کے مکان میں منتقل ہو گیا جس روز وہ جا رہا تھا۔ ایک سگ گزیدہ اسٹریچر پر اُسکے وارڈ میں لایا گیا۔ اُسکا آخری وقت تھا۔ وہ وہیں زمین پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر، سر دھن دھن کے اور اپنے جسم کو ناخنوں اور دانتوں سے مجروح کرتے ہوئے مر گیا۔ جاوید کی روح پیچ و تاب کھانے لگی۔ اور اُس نے زیرِ لب کہا "انتقالِ روح کا کتنا رحیمانہ طریقہ!" ایک بدقسمت بندہ اپنے آقا سے بیزار تھا

جس مکان میں اب جاوید تھا۔ وہیں شاہینہ بھی تھی۔ ان دنوں وہ شاہینہ کو نہایت ہی ترحم کی نظر سے دیکھنے لگا تھا۔ شاہینہ تو سربسر گریہ تھی۔ اُس کی نمازیں ایک طویل فریاد ہوتی تھیں جاوید میں ایک خاص قسم کی تبدیلی پیدا ہو گئی جسے وہ محسوس کرتی تھی۔ جب کبھی بھی جاوید کو درد کی ٹیس اُٹھتی۔ اُس کا چہرہ غیض و غضب سے تمتما اُٹھتا مگر اُس کے لب خاموش رہتے۔ ایک اندرونی جذبہ اُس کی روح کو کھا رہا تھا۔ اگر اُس کی ڈائری نہ ہوتی تو اس جذبہ کی حقیقت سے کون واقف ہو سکتا تھا۔ سوائے اس کے جس کے خلاف یہ تھا۔

"انسانوں کی یہ وسیع آبادی ایک وحوش خانہ ہے۔ جہاں جانور صرف اسلئے رکھے جاتے ہیں کہ انہیں "تماشا گاہ" میں ایک دوسرے کا خون پلوا کر ہلاک کیا جائے۔ قیاصرۂ روم خدا کے نقال تھے خوردبینی کیڑے، ادنیٰ و اعلیٰ جانور اور انسان اس "تماشا گاہِ ہستی" میں ایک دوسرے سے جنگ کر کے خدا کے لئے تفریح کا سامان مہیا کرنے، اور اپنے لئے موت کماتے ہیں۔ ان کی پرداخت بھی صرف اسی لئے کی جاتی ہے۔ یہ امراض کے حملے اور جرم کشی، یہ شکار و ذبح اور جانوروں کا انسانوں کو کاٹنا اور پھاڑ کھانا، یہ دشمنی قتال، حق و باطل کی آویزشیں، یہ رنگ و نسل کے جھگڑے سب خونیں تماشے ہیں جن کی کل خدا کے ہاتھ میں ہے اور آخرت! کون جانے جسے مذہب خیر کل سمجھتا ہے۔ وہ شرِ کل ہو اور اجر خیر ممنون محض وعدۂ فردا!" یہ ہیں جاوید کی ڈائری کے الفاظ معاذ اللہ! اس کی روح اُس کے جسم سے زیادہ بیمار تھی!

ایک روز جاوید کے جوڑوں میں شدید درد اُٹھا۔ اُس کی گردن مارے درد کے ٹرخ رہی تھی بخار بھی تھا۔ شاہینہ اُسے منہ دھلانے آئی اور اُسے کروٹ پھرانے لگی۔ جاوید کی گردن میں ٹیس اُٹھ

رہی تھی۔ وہ کروٹ پھیرنے سے عاجز تھا جب بھی گردن کو جنبش دیتا۔ رگ اور پٹھے میں ٹیک پیدا ہو جاتی۔ یک بیک اُس کی رگیں تن گئیں، اور چہرہ پر گرم خون تیزی سے دوڑ گیا۔ اُس نے اپنی گردن کو جھٹکتے ہوئے کروٹ پھیلی اور بولا۔ "اُف ظالم خدا!" یہی جملہ بہت دنوں سے اُس کے قلب میں گھٹ رہا تھا۔ اُسے جرأتِ اظہار نہ تھی۔ اعلانِ کفر بھی شہادتِ ایمان کی طرح ہمت طلب ہے۔ شاہینہ حیرت و غم کے سمندر میں ڈوب رہی تھی۔ وہ خاموش تھی مگر اُس کی آنکھیں مسترحمانہ انداز میں کہہ رہی تھیں "جاوید!"

پہلے تو جاوید کی خودی کو تسکین ہوئی لیکن کچھ دنوں کے بعد وہ ایسا محسوس کر رہا تھا کہ اُس نے ایک چٹان کو سرکا تو دیا مگر وہ چٹان اُس کے سر پر آ گئی اور اُسے پیسے ڈالتی ہے اُس پر ایک پسپا سپردگی اور ایک مظلومانہ بے توجہی کی کیفیت طاری رہی اور شاہینہ اُدہ کانپ رہی تھی گھلی جا رہی تھی اور اُس کی دعائیں زیادہ گریہ در آغوش ہو گئی تھیں۔ جاوید کو بستر سے اُٹھنے تک کی اجازت نہ تھی۔ بستر ہی اُس کی ساری کائنات تھی۔ اور وہ کیسی تاریک تھی! وہ اپنے چاروں طرف ایک خلا محسوس کر رہا تھا۔ ایک لا متناہی خلا۔ اُس کے دل میں بھی ایک خلا تھا۔ خارجی خلا سے زیادہ ہیبتناک زیادہ ناقابلِ الفہم زیادہ بے معنی۔ اس کے لئے زندگی کا کوئی اثباتی مقصد نہیں تھا بے کیف لا حاصل رائیگاں زندگی! کوئی ہاتھ اُس کے دل کو تسکین دینے والا، کوئی لب اُسکی رُوح کو محبت کا پیغام پہنچانے والا نہ تھا۔ ہر طرف ایک مہیب اور بھیانک خاموشی تھی۔ ہر سو سر شہری۔ جاوید ایک مجہول بھائیں بھائیں کرتی ہوئی تاریکی میں غرق تھا۔ زندگی سے زیادہ تلخ اور موت سے زیادہ خوفناک تاریکی۔ وہ اس بے پایاں ابدی تاریکی میں دھنسا جا رہا تھا۔ اور تاریکیاں اُس

پر گہری ہوئی جاتی تھیں۔

شاہینہ ان تاریکیوں کو دیکھ رہی تھی اور لرز جاتی تھی۔ وہ جاوید کے جسم و روح کی نجات کی متمنی تھی۔ دوانگیز شدت کے ساتھ۔ مگر وہ مجبور تھی، یکسر مجبور! ایک روز وہ دعا و عبادت سے فارغ ہو کر جاوید کے سرہانے آکر بیٹھ گئی۔ اُس کے چہرہ پر ایک قدوسی نور تھا۔ اور اُسکی آنکھیں امید کی تابانی سے چمک رہی تھیں۔ اُس نے محبت و شیرینی کے ساتھ جاوید سے کہا: "آپ کب تک اپنے مالک سے روٹھے رہیں گے؟" جاوید کو ایسا معلوم ہوا کہ یہ خود خدا کی آواز تھی۔ جو اُسے پکار رہی تھی۔ اُس نے اپنے قلب میں بھی اُس کی بازگشت سنی ——— "آپ کب تک اپنے مالک سے روٹھے رہیں گے"۔ محبت کی ایک پکار کے ساتھ جامد خاموشیاں ہٹ چکی تھیں۔ تاریکی چھٹ رہی تھی۔ اور وہ اپنے اندر اور باہر نور کی فاتح کرنوں کو دیکھ رہا تھا۔ اُس کی روح خدا کی پکار کا جواب دینا چاہتی تھی۔ لیکن نہیں دے سکتی تھی۔ اُس کے حلق میں دعائیں اٹک رہی تھیں۔ اور اس کی پلکوں پر آنسو تُل رہے تھے۔ شاہینہ بولی "دعا کیجئے! میری خاطر دعا کیجئے!!" جاوید پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور اُس کے لب ہل رہے تھے۔ جمود ٹوٹ چکی تھی، برف پگھل چکی تھی! جاوید و شاہینہ دونوں رو رہے تھے۔ اور دعا و التجا کے اہتزاز سے انکے لب کانپ رہے تھے۔ شاہینہ نے جاوید کے سر کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ اور جاوید کا ہاتھ اُس کی گردن میں حمائل تھا۔

——— اور خدا کی محبت کا ہاتھ اُن پر سکون کی بارش کر رہا تھا۔

یہ دُنیا

"چھی! یہ کمینے شور کتنا کرتے ہیں۔ دن بھر تو خیر سے بدذات دُور دفان رہتے ہیں مگر شام ہُوئی نہیں کہ بھیڑ بکریوں کی طرح آدھمکے اور آدھی رات تک غدر مچائے رکھتے ہیں۔ اس جیسا پڑوس تو کسی کا نہ ہوگا۔ میں اِس مکان میں رہنے کی روادار نہیں . . ." نوجوان راشدہ نے اپنے میاں سے چیں بہ جبیں ہوکر کہا۔

میاں نے تھوڑی سی ہاں میں ہاں ملائی اور دبی زبان سے عذر بھی پیش کیا ـــــ "سچ کہتی ہو۔ یہ نیچ لوگ جانور ہیں جانور۔ بلکہ اُس سے بھی بدتر۔ لیکن اِن کو اب کوئی کیا کہے۔ آج کل تو شرافت نبھانی بھی مشکل ہے۔ اِن نچلے طبقے کے لوگوں کے منہ لگنا کچھ آسان کام نہیں ہے۔"

"تو میں کیا کروں؟ وہ کوٹھری تو جیسے شہر بھر کے لچے لفنگوں کا اڈا ہے۔ اُن کے ساتھ ملکہ

میں بھی روز روز رتجگا مناؤں؟ ــــــ مجھے آپ میکے کیوں نہیں بھیجدیتے۔ دن بھر کھیلی پڑتی رہوں اور رات کی رات سر کا بھیجا کھلواؤں؟ ــــــ" راشدہ نے چڑ کے کہا۔

" نہیں میرا یہ مطلب نہیں بھئی کوشش کر دوں گا۔ کل منشی جی سے اِن حرامزادوں کو کھلواؤں گا۔۔۔" مولوی امجد علی نے دب کر جواب دیا اور کنجیوں کا جھبا لیکر مروانے میں اپنے آفس کی طرف چلے گئے۔

مولوی امجد علی رجسٹریشن کے محکمے میں انسپکٹر تھے۔ بڑے باوضع آدمی۔ گھر پر انکا رعب تھا۔ برادری میں عزت تھی۔ محلے میں کیا شہر کے اکثر شرفا میں اُن کا نام اونچا تھا۔ سرکار سے خان بہادری کا خطاب مل چکا تھا لیکن بیوی سے ذرا ڈرتے تھے۔ پچاس سے کچھ اوپر کا سن تھا صحت اچھی تھی اور خضاب کی مدد سے اور بھی اچھی معلوم ہوتی تھی۔ پندرہ پندرہ سال کی رفاقت کے بعد یکے بعد دیگرے دو بیویاں مرچکی تھیں۔ راشدہ تیسری تھی۔ شادی کو ابھی دو سال ہوتے تھے۔ گھر میں بال بچے، نوکرانیاں، ماماہیں، ملازمین، خدمتگار، اچھا بڑا سا کنبہ تھا۔ راشدہ بیس سال کی اچھے ناک نقشے والی سانولی رنگ کی عورت تھی۔ اُسے دیکھ کر عام طور پر ایسا احساس ہوتا تھا جیسے پکے ہوئے سیب یا بھری ہوئی بوتل کو دیکھ کر ہوتا ہے۔ وہ حسین سے زیادہ نوجوان تھی۔ اُسے شادی کے فوراً ہی بعد خانہ داری سنبھالنی پڑی۔ آخر مولوی امجد علی نے شادی اسی لئے کی تھی نہ کہ گھر دیکھنے والا کوئی نہیں۔ لڑکیوں کی شادیاں ہوچکیں اور وہ اپنے سسرال میں تھیں۔ اب اتنے بڑے گھر کا کارخانہ کیسے چلتا۔ لڑکے کالج میں پڑھتے تھے۔ اور وہ خود اکثر دورے پر ہی رہتے۔ راشدہ نے آتے ہی گھر گرہستی کا بوجھ اٹھا لیا۔ اِس نے تجربہ سے

اُسے بڑی مسرت حاصل ہوئی۔ اب وہ مکمل عورت تھی۔ اس کی ہر جگہ اہمیت اور منزلت تھی۔ راشدہ خوش مزاج تھی، زندہ دل اور صحبتوں میں ہنسنے بولنے والی۔ وہ التزام کے ساتھ برادری کی ہر تقریب میں شریک ہوتی۔ بلکہ مولوی امجد علی کے سبھی ہم چشموں کے گھروں پر خوب ملنے ملانے جایا کرتی۔ وہ ہر جگہ ملنسار اور خلیق مشہور ہو گئی۔ مولوی امجد علی بھی خوش تھے۔ کہ ان کی نئی دُلہن خوب رس بس گئی ہے۔

مولوی امجد علی گھر پر کم رہتے تھے۔ زیادہ تر وہ قصباتی رجسٹری آفسوں کے ملاحظہ کیلئے دورے کرتے رہتے تھے۔ گھر پر جب آتے تو فائلوں کا انبار۔ مگر فرصت کے اوقات میں وہ اپنے اہل کا پورا پورا حق ادا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ تعلیم پانے والے لڑکوں سے پوچھ گچھ اور بیوی سے ہنسنا بولنا اور فرض کی پابندی کے ساتھ انجام دیتے تھے۔ بیوی بھی ایک ڈیڑھ سال تک نہایت ہی اطاعت مندی کا ثبوت دیتی رہی تھی۔ مگر اِدھر چند مہینوں سے راشدہ چڑچڑی سی ہو گئی تھی۔ اکثر وہ مولوی امجد علی کو سخت سُست بھی کہہ دیتی۔ اور وہ اُسے پی جاتے۔ مولوی امجد علی کو تعجب تھا کہ راشدہ ایسی کیوں ہو گئی ہے اور گھر کے سارے لوگوں کو حیرت تھی کہ "خان بہادر" سا رعب دار آدمی بیوی سے ڈرنے لگا ہے۔ ایسا تو کبھی نہیں ہوا تھا۔ کنبہ کو دو بیویوں کا تجربہ ہو چکا تھا۔ یہ تو انوکھی بات تھی کہ سرکار کے سامنے کوئی زبان ہلائے۔ مولوی امجد علی نے ابتدا میں یہ سمجھنا چاہا کہ اُن کی نئی دُلہن شاید امید سے ہوں، ایسی حالت میں عورتیں ذرا چڑچڑی ہو جاتی ہیں۔ وہ خوش ہوئے اور اُن کے مردانہ پندار کو تسکین سی ہوئی۔ لیکن راشدہ کو یہ آسرا نہ تھا۔ جس کی بنا پر ممکن تھا اس کا چڑچڑا پن دور بھی ہو جاتا۔ خان بہادر اسی خیال خام کے ماتحت

سب کچھ سہتے گئے اور رفتہ رفتہ ان پر راشدہ کا رعب غالب ہوگیا۔ وہ راشدہ سے کترانے لگے دورہ پر سے واپس آکر بھی وہ مردانہ ہیں ہی رہتے اور فائلوں میں غرق۔

راشدہ ایک سال تک تو اپنی شادی شدہ زندگی کی منزلت کے کیف میں ڈوبی رہی۔ مگر خودی کی تسکین کے بعد جوانی نے اپنا خراج طلب کیا اور یہ ادا نہ ہوسکا۔ شباب بپھر گیا۔ لیکن قیدخانہ کی دیوار سے سر ٹکرانے کے علاوہ اور کیا چارہ تھا۔ جوانی کے مطالبے جب نہ پورے ہوئے تو راشدہ نے خودی کو کمک پر بلایا اور ملنے ملانے، تحفہ تحائف اور زینت و آرائش پر خوب خوب وقت اور روپیہ صرف کرنا شروع کیا۔ کچھ دنوں کے لئے شباب شکست کھا گیا۔ مولوی امجد علی خاصے ابیر تھے۔ لیکن ہاری ہوئی، دبی ہوئی جوانی چھپ چھپ کر طرح طرح کے حملے کرتی ہے۔ راشدہ کا چڑچڑاپن بھی اسی امڈی مگر محصور جوانی کی جھاگ تھا۔

خان بہادر کے عالیشان مکان کے پہلو میں چھوٹے چھوٹے بوسیدہ مکانوں کا سلسلہ تھا درمیان میں کوٹھی کا احاطہ اور ایک لانبی سی گلی حائل تھی۔ ان مکانوں کی بساط بس اتنی تھی۔ ایک چھوٹا سا برآمدہ اور اس سے لگی ہوئی ایک یا دو شکستہ حال کوٹھریاں۔ ایک دو مکان ایسے بھی تھے۔ جن کے عقب میں کھنڈر سی انگنائی تھی اور ٹوٹی پھوٹی چاردیواری۔ لانبی گلی کے اندر مسلسل سات آٹھ پیخانوں کی صفائی کے راستے کھلتے تھے۔ جن پر محض عذر کے لئے لکڑی کا اکھڑا ہوا ڈھکن یا سڑی ہوئی کواڑ کے آثار لگے ہوئے تھے گلی کے ایک پہلو میں ازکار رفتہ نالی دوڑ گئی تھی، جیسے پھولی ہوئی، سیاہ، بیمار و بیکار کوئی رگ ہو۔ نالی کیچڑ اور گندے پانی سے بھری ہوئی رہتی تھی۔ اور کبھی گلی کی سطح پر بھی پانی پھیل جاتا تھا۔ بوسیدہ مکانوں کے سامنے کوڑوں کے ڈھیر بھی رہتے تھے۔ اور ان ڈھیروں

کی آرائش کے لئے ٹوٹی ہوئی ہانڈیاں اُن کے سیاہ پیندے پھوٹے ہوئے گھڑے اور اُن کے گنگھوں کے دائرے پھپھوند لگی ہوئی پیلی اجلی دال، ٹین کی پرانی زنگ آلود ڈھبری اور سیاہ چیتھڑے ہوتے تھے۔ ایک سیاہ کتا اکثر کوڑے کے ڈھیر کو اس طرح انہماک کے ساتھ کریدتا رہتا تھا۔ جیسے آثارِ قدیمہ کا انکشاف کر رہا ہو۔ ان ہی مفلوک الحال مکانوں کے درمیان ایک چیز تھی جسے مشکلوں سے کوٹھڑی اور آسانی سے بھوسا وغیرہ رکھنے کی جگہ کہہ سکتے تھے۔ ریو چھپروں اور فرسودہ دیواروں کے درمیان ایک تاریک خلا سا اور بس۔ یہ خلا گلی کے بالکل ہم سطح تھا۔ اور نالی کے کنارے۔ اس پر لوہے کے پتروں کا ایک جافری نما پھاٹک لگا ہوا تھا۔ روشنی سے آنے والی آنکھوں کو یہ خلا محض ایک بڑا سا تاریک دھبہ نظر آتا تھا۔ کچھ دیر میں جب نظریں ذرا مانوس ہو جاتی تھیں تو اس تاریکی کے اندر سے مبہم شکلیں ابھرتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ پانی سے چپ چپ سی کچی زمین اور ٹھس ٹھسی سی نم دیواریں۔ یہ کوٹھری سی جگہ بالکل اندھی تھی۔ دیواروں میں کوئی شیشہ تک نہیں۔ کوٹھری کے حاشیوں پر کچی مٹی کے چولھے تھے۔ دن بھر یہ چولھے بھائیں بھائیں اپنے بھوکے منہ پھاڑے رہتے تھے۔ چھپر کی ٹھاٹ سے بندھی ہوئی کئی اونچی الگنیاں تھیں جن پر پھٹے پرانے کپڑے یا ڈبلی ڈبلی گھٹریاں ٹنگی ہوئی رہتی تھیں۔ کوٹھری کے کونوں میں لپٹی ہوئی چٹائیاں اور وسط میں بکھرے ہوئے برتن باسن —— پیتل کے لوٹے۔ مٹی کی ہانڈیاں اور جیت اکھڑے ہوئے تامچینی کے قاب ——

اس کوٹھری میں بھانت بھانت کے لوگ رہتے تھے۔ سب دور دراز کے گاؤں سے آئے ہوئے پلّے دار، مزدور، اور پھیری والے۔ اکثر یہ لوگ دن بھر غائب رہتے۔ کبھی کبھار کوئی اِکا دُکا

مزدور کوٹھڑی میں چٹائی پر لیٹا ہوا یا کچھ کام کرتا ہوا پایا جاتا۔ کوئی غلہ اور سبزی کی آڑھت میں قلی کا کام کرتا تھا۔ کوئی کوئلہ پھیری کر کے بیچتا تھا۔ کوئی چنیا بادام اور "ایک پیسے میں آٹھ مچا" کا خوانچہ لگاتا، کوئی چٹائی بنا کر بیچتا اور کوئی رکشا کھینچتا تھا۔ شام ہوتے ہی یکے بعد دیگرے وہ کوٹھری آباد ہونا شروع ہوتی۔ مزدور تھکے ہارے آکر چولھا جوڑتے، مصالحہ پیتے اور کھانا پکاتے تھے۔ دِن بھر میں بس ایک بار۔ صبح کو کبھی باسی بھات بچ رہتا اور اُسی پر گذارا ہو جاتا۔ اندھیری کوٹھری دھوئیں سے اٹ جاتی تھی اور مزدوروں کی آنکھوں میں پانی آجاتا مگر وہ آگ پھونکتے رہتے۔ اِن مزدوروں کے چولھے الگ الگ جلتے تھے۔ سب کی ذات علیحدہ، لہٰذا سب اپنا بھات بھی جدا جدا پکاتے تھے۔ تاریک کوٹھری کے اندر مختلف چولہوں کی آگ کی روشنی میں بیٹھے ہوئے مزدور غولِ بیابانی سے معلوم ہوتے تھے۔ یہ زور زور سے باتیں بھی کرتے جاتے تھے۔ سویرے ہی کھانے پینے سے فراغت کر کے یہ منڈلی خوب شور و غل کرتی، گیت گاتی، گالیاں بکتی، قہقہے لگاتی، لڑتی بھڑتی، قصے کہانیاں کہتی، روز کے گذرے ہوئے واقعات پر بے لاگ تبصرے کرتی اور پھر بھجن بھی گاتی۔ غرض اس کوٹھری کے لوگ محلے بھر کو سر پر اٹھائے رکھتے تھے۔ کبھی جو یہ مزدور پی پلا کر آتے تو اور غضب ہو جاتا فحش کی بھرمار اور کھلی ہوئی گالیاں۔ شام سے لیکر آدھی رات تک قیامت مچی رہتی۔

خان بہادر مولوی امجد علی نے شہر میں زمین خرید کر نیا مکان بنایا تھا۔ اس محلہ میں اور بھی معززین نے اسی طرح بڑے بڑے مکانات بنائے تھے مگر ابھی تک محلہ میں زیادہ تر غرباء کے مکانات ہی تھے۔ خان بہادر کے سونے کا کمرہ دوسری منزل پر مزدوروں کی کوٹھری کے سامنے پڑتا تھا۔ اِن فرسودہ مکانوں کے سلسلے کے پرے ایک بڑا سا کھلا ہوا میدان تھا۔ یہ

میدان کبھی کھیت تھا اور اب فٹ بال گراؤنڈ کے کام آتا تھا۔ سونے کا کمرہ دوسرے کمروں کی نسبت اِسی سبب سے زیادہ ہوادار تھا، مگر یہ رات کی رات شورِ قیامت۔

راشدہ نے پہلے تو اس روزمرّہ کے ہنگامہ کا کوئی خاص خیال نہ کیا تھا، مگر اب جب کہ اس کا مزاج اکثر مکدّر رہتا یہ شور و غل اُس کے لئے عذاب تھا اور جب یہ طوفانِ بدتمیزی مولوی امجد علی کے ہوتے ہوئے ہوتا تو راشدہ اور جل جاتی۔ اُسے غصہ اتارنے کا ایک بہانہ مل جاتا۔ آج اُس کوٹھری کے مزدور حسب معمول شور کر رہے تھے۔ کہ مولوی امجد علی سونے کے کمرے میں آنکلے جہاں راشدہ تھکی تھکی نیند کو بلانے کی بے چین سی کوشش کر رہی تھی۔ وہ جلی کٹی سنانے کے لئے اُٹھ بیٹھی تھی، مگر اُسے ابھی جی کی بھڑاس نکالنے کا پورا وقت بھی نہ ملا تھا کہ کچھ بھانپ کر خان بہادر کھسک گئے اور وہ زیادہ خشمگیں ہو کر دھپ سے پھر پڑ کر لیٹ رہی اور ایک بیزار سے جھٹکے کے ساتھ اُس نے دیوار کی طرف کروٹ بھی پھیر لی، جیسے وہ مولوی امجد علی کی نفرت انگیز صورت کو دفع ہوتے ہوئے بھی دیکھنے کی روادار نہیں۔ اُسے بہت دیر تک نیند نہ آئی۔ وہ خشمگینی کا بارِ جوانی کا بوجھ اور حسرت و نفرت کا وزن اٹھائے چھٹپٹاتی اور تلملاتی رہی۔ نہ جانے کب راشدہ پر اتنی تھکاوٹ طاری ہوئی کہ وہ سو گئی۔ اُس نے خواب میں دیکھا کہ سامنے فٹ بال گراؤنڈ میں مزدوروں کا بہت بڑا مجمع ہے۔ اور وہ خود دریچہ کے سامنے کھڑی ہے، سب مزدور اُسے گھور گھور کے دیکھ رہے ہیں۔ اور وہ انبساط و خفگی کی ملی جلی کیفیت میں ڈوبی ہوئی ہے۔ یک بہ یک مزدور مکان کے اندر گھس آئے اور مولوی امجد علی کو پکڑ لے گئے اور انہیں پیٹتے پیٹتے ادھ موا کر دیا اور پھر اُسے لے گئے۔ اور درمیان

میں اونچی جگہ پر بٹھا کے اُس کے سامنے ناچنے لگے۔ اور رقص کرتے کرتے سجدہ ریز ہو گئے ـــــــ وہ صبح کو بیدار ہوئی تھی اپنے کو حد سے زیادہ مضمحل اور چور چور محسوس کر رہی تھی۔

راشدہ کی زندگی بیزار، اداس خشمگیں اور مضمحل انداز میں گذر رہی تھی۔ ترسی ہوئی پیاسی جوانی اندر ہی اندر استری کے لوہے کی طرح سلگ رہی تھی۔ موانست کی خواہش کا دم گھٹ رہا تھا جنسِ مخالف سے چہل اور چھیڑ کی تمنائیں کراہ رہی تھیں اور جنوں خیز محبّت کے حسین شعلوں میں نہانے کی آرزو میں اُس کی منجمد و بے کیف زیست سسکیاں بھر رہی تھی۔

نرگس اُس کے میکے کی ایک نوخیز خادمہ تھی۔ گورا رنگ اور کھلتی ہوئی صورت۔ وہ ہنس مکھ، شوخ، چنچل اور بے پرواسی تھی۔ اُس کا شباب شکنجے سے آزاد تھا جو لیبوں میں پلی ہوئی جوانی شریف زادوں کے لئے تختۂ مشق کا کام دیتی ہے۔ نرگس خانہ زاد لونڈی کی تھی۔ خانہ زاد لونڈی کی بیٹی۔ اور خود بھی اسی طرح کی ایک لونڈی تھی۔ اُس کے بشرے سے شرفا کے خون کی آمیزش کا پتہ چلتا تھا۔ جو اُس کے مادری خاندان کے سلسلے میں شاید مسلسل ہوتی رہی تھی۔ لیکن وہ شریف نہیں تھی۔ محض ایک لونڈی تھی۔ جسے لوگ حرافہ اقطامہ اور بالزادی کہہ کر پکارتے تھے۔

راشدہ اپنی مسہری پر بیٹھی ہوئی تھکی تھکی انگڑائیاں اور نڈھال جمائیاں لے رہی تھی۔ کہ نرگس جھاڑو سنبھالے فرش آراستہ کرنے کمرے میں آئی۔ سورج دیر کا نکل چکا تھا۔ کھلے ہوئے دریچے سے دھوپ آ کر کمرے میں بکھر گئی تھی۔ راشدہ کا اُٹھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ بے مقصد زندگی کاہل ہو

جاتی ہے۔ نرگس راشدہ سے شوخ تو تھی مگر ایسی بے تکلف نہیں۔ وہ راشدہ سے ڈرتی بھی تھی۔ کیونکہ اُس کے ہاتھوں اکثر پٹ چکی تھی۔ راشدہ کی نظر نرگس کے ہنستے ہوئے چہرے پر پڑی اور اُسے محسوس ہوا کہ وہ اُس سے پست تر ہے۔ کوئی ادنیٰ تر مخلوق۔ نرگس آزاد اور خوش تھی۔ اور وہ مجبور وغمگین۔ اُسے ایسا معلوم ہوا کہ نرگس مالکہ ہے اور وہ خادمہ۔ اُسے اپنے حال پر بےساختہ رونے کو جی چاہ رہا تھا۔ اُس کے دل پر رقت طاری ہوئی اور اُس نے نرگس کو پاس بلایا ——

"نرگس!"

"جی!"

"سارے کام ختم ہو گئے؟"

"جی ہاں!"

"تو آج بڑی خوش ہے؟ کپڑے بھی صاف پہن رکھے ہیں۔ آنکھوں میں کاجل بھی ہے۔ کیوں ری؟" راشدہ نے مسکراتے ہوئے سوال کیا۔

نرگس شرما سی گئی۔

"اور یہ کپڑے ملے ولے کیسے ہیں رے؟ اور سر کے سنوارے ہوئے بال بھی کھل کھل گئے ہیں۔" راشدہ نے بامعنی سوال کیا۔ وہ اِس وقت نرگس سے بے تکلف ہونا چاہتی تھی۔

نرگس شہ پاکر ہنسنے لگی۔

"رات اچھے صاف کپڑے پہن کر سوگئی تھی؟ چیزیں برباد کرنی خوب آتی ہیں۔ بے ہودی!"

راشدہ کو ذرا سا رشک آمیز غصہ آگیا۔ مگر وہ فوراً ہی سنبھل گئی۔ اُس نے چھیڑ چھیڑ کر نرگس سے رات

کی ساری گذری ہوئی باتیں پوچھ ڈالیں۔ نرگس کے لئے یہ بالکل نئی چیز تھی۔ اُسے بے تکلفی بڑی اچھی لگی۔ وہ غرور و مسرت سے پھول گئی ——— اور سارے واقعات کھل کر کہہ دیئے۔

"بدمعاش!" راشدہ نے جذبات سے متاثر ہو کر کپکپاتے ہوئے لہجے میں کہا۔ اس کی سانس تیز و گرم چلنے لگی۔ اُس نے ایک گہری ٹھنڈی سانس لی اور رُک رُک کر نرگس سے پُر آرزو انداز میں پوچھا۔

"تیرے احمد بابو بڑے اچھے ہیں؟ بدذات! چھنال! بڑی بے ہودی ہے تو۔۔۔ چھی! ایسا بھی کوئی کرتا ہے۔۔۔ دائی ماما کی ذات جو ٹھہری۔۔۔"

یہ اپنی کمزوری بھرم رکھنے کی پُرتصنّع ڈانٹ تھی

"اوں! ہم کا کرتے۔ احمد بابو بڑے کھراب سے ہیں۔ سب بات اچھی ہے بابو۔ یہی ایک بات بڑی کھراب ہے۔ سچ بولو۔"

نرگس کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ راشدہ اِس خواہش سے تلملا اُٹھی کہ کاش وہ اِسی طرح ہنس سکتی۔

مولوی امجد علی صاحب دوروں پر جاتے رہے اور راشدہ آپ ہی آپ کڑھتی رہی۔ وہ ہوتے بھی تو کیا تھا۔ جاڑے کی چاندنی، خضاب آلودہ داڑھی سے بوجھل تبسّم۔ پُرشکن حلقوں میں دھنسی ہوئی آنکھوں کی ہوسناکیاں۔ ملتجی بڑھاپے کی اُمنڈے ہوئے شباب سے بھیک۔ مضحکہ خیز حرکتیں اور نفرت انگیز شکست۔ راشدہ دن دن بھر اپنے کمرے میں بیٹھی رہتی۔ اس کے صرف دو مشغلے تھے۔ دریچہ سے گلی اور دور کی سڑک کو تکتے رہنا اور نرگس سے اُس کی جوانی کی کامیابی کی

داستان سننا۔ وہ نرگس سے ایسی باتوں کے متعلق سوال کرتی جس کا نرگس کو گمان تک نہ ہوتا۔

احمد میاں کے تذکرے اکثر رہتے تھے اور دوسرے شریف زادوں کے بھی۔ یہ احمد مولوی امجد علی کا بھانجا تھا۔ اور اُن ہی کے یہاں رہ کر کالج میں بی۔ اے کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ خوش رو سا نوجوان ٹینس اور سینما کلب طرح شوق اور لباس کا خبط۔ ادب و علم سے ذوق نہ تھا۔ مگر فلمی گانے ازبر تھے۔ اگر اُس کی زبان پر کوئی نیا گانا از قسم "گھونگھٹ پہ ایک چھبیلی پانی بھرن کو آئی" سنا جاتا تو سمجھ لیجیے کہ شہر میں کوئی نیا فلم آگیا ہے۔ سہگل کی طرح کرتا پہننا اور آوسٹن کی شان سے ریکیٹ بغل میں دابنا اُس کی معراجِ تخیل تھی اور انتہائی حسنِ کردار۔ احمد مولوی امجد علی سے ڈرتا تھا۔ راشدہ کا بہت ادب لحاظ کرتا اور نرگس پر فلمی تعلیمات کی عملی مشق کرتا تھا۔ کچھ دنوں سے وہ محسوس کر رہا تھا کہ ممانی جان اُس پر بہت مہربان ہیں۔ اُسکے کھانے پینے کا خیال، آرام کا لحاظ۔ یہی چھوٹی چھوٹی باتیں اور کیا۔ رفتہ رفتہ ممانی جان اُس سے خاصی دلچسپی لینے لگیں اُس سے کالج کے دلچسپ قصے سنتیں، پیچ اور سینما کے متعلق باتیں کرتیں، احمد خوش ہوا کہ چلو ماموں جان کی خشکی اور سختی کا ممانی جان نے کفارہ ادا کر دیا۔

راشدہ نے احمد کی تواضع کچھ یونہی انجان طور پر شروع کی تھی۔ بہرا ہے تو کرانیوں کو اس کے کھانے کے متعلق تاکید کر دیتی۔ نوکروں سے اس کی چیزوں کے بارے میں پوچھ لینا وغیرہ وغیرہ آہستہ آہستہ احمد کی خاطرداریوں میں اُسے لطف آنے لگا۔ اُس کا یہ بھی جی چاہتا کہ احمد سے باتیں کرے۔ اُس کی کوئی نہ کوئی تقریب نکل ہی آتی۔ جانے کیسے۔ پھر یہ ہوا کہ موقعہ پیدا کیا جاتا اور کچھ دنوں کے بعد یہ معمول سا ہو گیا۔ کہ احمد اپنی باتوں سے ممانی جان کا دل بہلا

رہا ہے۔

راشدہ کو اپنی ویران زندگی میں تھوڑی سی آبادی نظر آنے لگی تھی مگر اس آبادی پر وہ حکمران نہ تھی۔ اس کے دن اب بھی ایک مضطرب بے شغلی اور راتیں ناکام بیتابی میں کٹتی تھیں۔ وہ طویل دوپہر اور پہاڑ سے دن کمرے کے دریچہ سے لگی کاٹ دیتی۔ وہ پہلو کے بوسیدہ مکانوں کے رہنے والوں کو جان پہچان گئی تھی۔ بڑا سا سفید کمانیوں کا چشمہ لگائے ہوئے خمیدہ کمر بڑھیا گوالن۔ جو اپنی کوٹھری میں اکیلی جان سے رہتی اور دودھ سے بالائی نکال کر بیچتی تھی۔ اس کی بغل میں ایک چھوٹا سا غریب خاندان جس میں بہت باتیں کرنے والی عورتیں اور ایک لڑاکا مرد تھا۔ گلی میں بیٹھ کر پڑوس کی عورتیں ایک دوسرے کی جوئیں دیکھتی تھیں۔ اور مولوی امجد علی کے احاطہ کی چار دیواری پر میلے میلے کپڑے اور بودے شکستہ گیندڑے سوکھنے کو دیتی تھیں۔ راشدہ ان گیندڑوں کے مختلف رنگ کے پیوندوں اور چیلڑ کی طرح میل سے اٹے ہوئے بخیوں سے مانوس و شناسا ہو گئی تھی۔ مزدوروں کی کوٹھری کے عین پہلو میں ایک بہت ہی تنگ سا سائبان تھا جسے گھیر گھار کر زبردستی کوٹھری کی شکل دے دی گئی تھی۔ اس میں ایک سیاہ رنگ بڑھیا میلے سے گیندڑے پر اوندھی جھکی ہوئی یا نالی کے کنارے بیٹھی ہوئی پائی جاتی تھی۔ اس کا سارا بدن بے حد پھولا ہوا تھا۔ اس کے تنتے ہوئے چہرے سے بڑھاپے کی شکنیں بھی دور ہو گئی تھیں۔ اس کا بھیانک چہرہ لڑکوں کو ڈرانے کا ہوّا معلوم ہوتا تھا۔ اس کے ساتھ کھونٹے سے بندھی ہوئی ایک نوکیلی داڑھی والی بکری رہتی تھی۔ یہ پیلی آنکھوں والی بکری سیاہ رو بڑھیا کی شریک زندگی تھی اور سرمایۂ حیات۔ گلی کے دوسرے سرے پر ایک کھنڈر سے مکان میں تین خاندان

رہتے تھے۔ ان سب سے بھی راشدہ واقف ہو گئی تھی۔ ایک درمیانی عمر کی مہترانی اپنی نوخیز بیٹی اور گانے اور بڑے بڑے بالوں کا شوق رکھنے والے بیٹے کے ساتھ رہتی تھی۔ ایک میونسپلٹی کی موٹر کا چنڈ لاڈرائیور اپنی بہت سے بچوں والی رنگین ساریوں کی شوقین بیوی کے ساتھ رہتا تھا۔ اور ایک بیمار دمہ کی ستائی ہوئی گوری چٹی بڑھیا اور اُس کی بے حد جوان بہو۔ بڑھیا عریاں و فحش گالیاں بکنے میں وہ وہ جدت و ندرت پیدا کرتی تھی۔ کہ اس کی تخلیقی صلاحیتوں کا قائل ہونا پڑتا تھا۔

راشدہ طرح طرح کے پھیری والوں اور اُن کی منفرد صداؤں سے بھی آگاہ ہو گئی تھی ——— "ایک سیتیا پیسے میں۔ تین سلیا پنکھے میں" اور ——— "ہند و بس... چنیا باد... کھوئے کا لڈ..." ٹوٹے ہوئے آخری لفظ پر ختم ہونے والی مترنم آفریں بہ دم بہتی ہوئی آواز۔ غرض وہ دریچے کے سامنے والی گلی کے جزئیات اور اُس کے سارے متعلقات سے پورے طور سے واقف ہو گئی تھی۔ اور وہ ساری چیزیں اُس کی زندگی کا حصہ بنکر رہ گئی تھیں۔ راشدہ کو اب سامنے کی کوٹھری کے مزدوروں کا شور بھی گوارا تھا۔ اُن کے دم سے ویران شاموں اور اداس راتوں کی رونق تھی۔ اُسے کوٹھری والے مزدوروں سے ہمدردی تو نہیں دلچسپی سی ہو گئی۔ نرگس کے ذریعہ وہ اُن کے حالات دریافت کرتی۔ روزی کی تلاش میں دور دور سے آئے ہوئے مزدور سال سال بھر گھر نہیں جاتے تھے۔ وہ جا بھی کیسے سکتے تھے۔ اوسطاً تین آنے روزینہ کمانے والے لوگ ایک آنہ اپنی ذات پر خرچ کرتے تھے۔ اور مشکلوں سے مہینہ بھر میں چار روپیے گھر کو بھوکے پیٹوں کے بھرنے کے لئے روانہ کرتے تھے۔ "بیچارے مزدور!" کبھی کبھار راشدہ کو انکی

حالت پر تھوڑا سا رحم آجاتا۔

اوائل گرمیوں کے دن تھے۔ اپریل کا مہینہ۔ صبح کو گلابی خنکی ہوتی تھی اور گرم دوپہریں نہایت ارمان انگیز تھیں۔ راتیں آغوش میں بھنچی ہوئی نوجوان دلہنوں کی طرح مدہوش۔ کوئل اور فاختہ کی آوازیں دلوں کو برماتی تھیں اور ہوا کے جھونکے جذبات میں تموّج پیدا کرتے تھے۔ غنودہ آرزوئیں انگڑائی لیتی تھیں۔ اور جسم کا جوڑ جوڑ کسمساتا تھا۔

ایک خاموش دوپہر کو راشدہ اپنے دریچہ سے لگی بیٹھی تھی۔ نرگس بھی اس کے پاس کھڑی تھی۔ سامنے کی گلی غیر آباد سی تھی۔ مزدوروں کی کوٹھری کا پھاٹک تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ اور دونوں پٹ پر کپڑے ڈال دئے گئے تھے۔ اندر سے ایک آدمی نکلا اور گلی سے گذرتا ہوا سڑک کے کونہ پر جاکر کھڑا ہوگیا۔ وہاں وہ کچھ دیر کھڑا اور پھر کوٹھری کے اندر واپس آگیا۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد ایک ادھیڑ عمر کی عورت گلی میں آئی اور اِدھر اُدھر دیکھ کر مزدوروں کی کوٹھری کے اندر داخل ہوگئی۔ "بولو!" نرگس نے کہا۔

"چپ! ٹھہر تو!" راشدہ اس کوٹھری کی طرف متجسسانہ دیکھتی رہی۔ تین چار جوان مزدور اور جانے کدھر سے آگئے اور سب کے سب اطمینان کے ساتھ کوٹھری کے اندر چلے گئے۔ کوئی بیس منٹ کے بعد ایک مزدور نے کوٹھری سے باہر نکل کر گلی کا جائزہ لیا اور اطمینان کر کے اندر واپس گیا۔ فوراً ہی وہ ادھیڑ عمر کی عورت جھپ سے نکلی اور گلی سے تیزی کے ساتھ گذر کر سڑک کے موڑ میں غائب ہوگئی۔ اُس کے آنچل سے بندھے ہوئے پیسے پیچھے جھول رہے تھے۔

"ای تو اُو ہے بولو۔ چور ہے کے کونے پر تلکٹ اور ریوڑی بیچتی ہے۔ بیوہ ہے چار پانچ

لڑکا بھی ہے اُس کے" نرگس نے رازدارانہ انداز میں کہا۔

"چھی! بڈھی ہوگئی اور ایسا کام کرتی ہے . . . ."

راشدہ کو مولوی امجد علی کا خیال آیا اور وہ کڑھ کر رہ گئی۔ اُس ادھیڑ عمر کی عورت کے بالوں کو ابھی خضاب کی ضرورت بھی نہ تھی اور جو ہوتی بھی تو وہ خضاب کہاں سے لاتی۔ راشدہ نے اپنی طبیعت کی عجیب ناقابلِ برداشت کیفیت سے نجات پانے کے لئے نرگس سے مذاق کیا:-

"تو کیوں نہیں چلی جاتی ہے اُن مزدوروں کے پاس؟"

"اونہہ . . . . ! ان کمینوں کے پاس؟"

شام تک راشدہ برافروختہ مضمحل، چڑچڑی اور نڈھال سی رہی ——— شام کو احمد بھی کالج سے نہیں آیا۔ ادھر ہی سے کھیل میں چلا گیا۔ قریباً آٹھ بجے شب کو وہ گھر لوٹا تو راشدہ نے اُسے اپنے کمرے میں بلا کر بہت سی باتیں کیں۔ وہ اضمحلال اور افسردگی کا بار اٹھا کر تھک چکی تھی۔ لہٰذا احمد کی صحبت میں معمولی معمولی باتوں سے مسرت کی تقریب پیدا کر رہی تھی۔ احمد کو حیرت ہوئی کہ آج ممانی جان اتنی بشاش کیوں ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد احمد اپنے کمرے میں چلا گیا۔ آج اُسے سکنڈ شو، سینما جانا تھا۔

راشدہ اپنے کمرے میں تنہا رہ گئی۔ وہ بیقراری سی نظر آ رہی تھی کبھی بیٹھتی، کبھی اُٹھتی، کبھی یونہی ٹہلنے لگتی۔ وہ دریچہ کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ سامنے کے میدان میں نشہ پر چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ نیلے آسمان کی نسیم آمیز گھلاوٹ بذات کو لے اڑتی تھی۔ موسم میں سکر سارا چاہو اٹھا بٹرک

کہ اُس کھڑکی کے پردہ اکڑ والے مکان کے دریچہ سے بجلی کی روشنی میں ایک مرد اور ایک عورت کے جسم کا بالائی حصہ معلوم ہو رہا تھا۔ وہ خوش فعلیاں کر رہے تھے۔ مزدور کوٹھری سے باہر نکل کر گلی میں بیٹھے ہوئے تھے۔ سبھا خوب جمی ہوئی تھی۔ سب ملکر زور زور سے گیت گا رہے تھے ——

"چھولنی پہنا کے سیاں چھوڑے چھنیا —— سیاں چھوڑے چھتیا!" خوب تھا تھیا مچی ہوئی تھی۔ ایک گیت ختم ہوتا نہیں کہ دوسرے نغمہ کا بول فضا میں لہرانے لگتا۔

"چھوٹے نہ دیب جوبنا پٹ گاڑھی دیب ہو...."

راشدہ ان گیتوں کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اُن کے ایک ایک لفظ سے اُسے لطف آ رہا تھا۔ وہ بیتاب سی ہو گئی۔ خون کا ایک فوارہ اُس کے دل سے چھوٹ کر سارے جسم میں تیر گیا۔ اُس کے لب خشک ہو رہے تھے۔ اور اُس کے حلق میں کانٹے پڑے ہوئے تھے۔ اس کی سانس چلنے لگی۔ اس پر ایک عجیب ہیجان اور انتشار طاری تھا۔ تکلیف اور لذت سے ملا ہوا۔ وہ دریچے سے ہٹ آئی اور ذرا رُک کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ یک بہ یک اُس نے محسوس کیا کہ دل منہ کو آیا جاتا ہے دھک سے ہلکر اُس کا دل رُک سا گیا اور پھر تیزی سے دھک دھک دھک چلنے لگا۔ گھر کے نوکر اپنے اپنے کمروں میں تھے اور دائیاں، مامائیں صحن میں لیٹی ہوئی تھیں یا باورچیخانہ میں برتن باسن دھو رہی تھیں۔ مولوی امجد علی دورے پر گئے ہوئے تھے۔ وہ سیدھی احمد کے کمرے کی طرف گئی اور جھانک کر اندر داخل ہو گئی۔ وہ کپڑے بدل رہا تھا۔ صرف ٹائی باندھنی باقی تھی۔ راشدہ کو دیکھ کر وہ چونکتا ہو گیا۔

"کون ؟ ممانی جان !"

پھر وہ ٹائی باندھنے اور سینما کے متعلق باتیں کرنے لگا۔

"آج سینما مت جاؤ!" راشدہ نے نہایت ملتجیانہ انداز میں کہا

"بہت اچھی ظلم ہے ممانی جان۔ زمانہ کے بعد دیوداس صرف ایک شو کے لئے آیا ہے"۔

"میری طبیعت جو گھبرا رہی ہے۔ مت جاؤ" راشدہ نے ناز کرتے ہوئے کہا اور آگے جھکر وہ احمد کا شانہ پکڑ کر کھڑی ہوگئی۔ وہ کوٹ پہن کر آئینہ میں اپنا آخری جائزہ لے رہا تھا۔ وہاں اُسے اپنے سے بہت قریب راشدہ شانہ پکڑے ہوئے نظر آئی۔ اُس نے اس کے ہاتھ کی لمس بھی محسوس کی اور حیرت زدہ ہو کر پیچھے مڑا۔ آج پہلی دفعہ اچانک اُس کی نظروں سے جیسے پردہ اُٹھ گیا ہو۔ راشدہ کی عجیب حالت ہو رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں سے تمنائیں عریاں طور پر جھانک رہی تھیں۔ احمد کے لیے یہ نیا انکشاف تھا۔ بہت سی باتوں کا مفہوم اُسے اب سمجھ میں آنے لگا۔ وہ مبہوت کھڑا تھا۔ راشدہ نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر بھینچ لیا۔ اُسے گھبراہٹ سی محسوس ہو رہی تھی ہاتھ آہستہ سے چھڑا کر وہ فوراً حیران پریشان کمرے سے یہ کہتا ہوا باہر چلا گیا۔

"ممانی جان بہت دیر ہو رہی ہے"۔

راشدہ بھی اس کے ساتھ ساتھ کمرے سے باہر نکلی اور "میں بھی چلونگی" کہتی ہوئی اُس کے پیچھے پیچھے صدر دروازہ تک گئی۔ احمد تیزی سے نکلا اور چلا گیا۔ راشدہ چیخ مار کر بے ہوش ہوگئی گھر کے لوگ دوڑے آئے۔ کوئی اُسے ہوش میں لانے کی تدبیریں کر رہا تھا۔ کوئی دوڑا ہوا محلہ کے ڈاکٹر کو بلا لایا۔ ڈاکٹر آیا تو وہ ہوش میں آکر دیوانوں کی طرح چیخ رہی تھی۔ ڈاکٹر نے معائنہ کیا۔

"ہسٹیریا" اُس نے کہا۔ ماما ئیں اور نوکرانیاں آسیب کا سایہ سمجھ رہی تھیں۔ اور کوٹھری کے مزدور اب تک گا رہے تھے۔

"میری پھلتی پھولتی جوبن کی ڈال
اسے کیسے میں رکھوں سنبھال کے..."

پس منظر

"بہن زمانہ برا ہے۔ ایسا بھی کیا۔ دھاکڑ سی جوان جہان کنواری لڑکیوں کو بندریا کی طرح دربدر لئے پھرنا۔ بڑی بھابی تو زمانہ بھر سے نرالی ہو گئی ہیں۔ آخر میں نے بھی تو تین لڑکیوں کو پوس پال کر بیاہا۔ اور اب یہ ماشاء اللہ چوتھی شاکرہ ہے بھلا کوئی انگلی تو اٹھائے۔"

——— اور اس کے جواب میں "کیا مجال!" اور صدائے بازگشت کے طور پر ———

"سچ کہتی ہو بہن۔ کنواری لڑکیوں کو داب کر رکھنا چاہیے۔ واقعی بڑی بھاوج شرافت پر بٹہ لگاتی ہیں۔ تنویر و پروین کو تو دیکھو۔ یہ فرنگیوں کے انداز۔ اٹھان پر کی لڑکیاں اور ایسی سرچڑھی۔ بڑی بوڑھیوں کی باتوں میں ٹپ ٹپ دخل کیسا دیتی ہیں۔"

یہ تھی وہ گفتگو جو شاکرہ نے اپنی کوٹھری میں بیٹھے بیٹھے سنی۔ اسکی ماں اور رشتے کی خالہ آپس میں

باتیں کر رہی تھیں۔ شاکرہ کو غصّہ آگیا۔ اُسے خالہ صاحبہ سے نفرت تھی۔ ایک تو اُس کی والدہ سخت پابندیوں کی قائل اور اس پر کریلے اور نیم چڑھے والی بات۔

"خالہ بنی ہیں! اونہہ خالہ! ہے کیسی موٹی گول مٹول۔ ہر وقت کچر کچر پان چباتی رہتی ہے۔ بوڑھی بکری!" شاکرہ نے ناخن کریدتے ہوئے زیرِ لب کہا۔ اسکی تیوری پر بل آگئے۔ شاکرہ پندرہ سال کی تھی مگر اسکی پرورش ایسے خاندان میں ہو رہی تھی جہاں کنواری لڑکیاں اس طرح رکھی جاتی ہیں جیسے جیل کے خطرناک قیدی یا پاگل خانہ کے تشدد پسند مریض۔ اسکی صحت یوں تو اچھی خاصی تھی مگر وہ کچھ گھٹی گھٹی اور چڑچڑی سی معلوم ہوتی تھی۔ خالہ بی کی باتیں سنکر وہ جل ہی تو گئی۔ پھر کچھ واضح اور غیر واضح خیالات اس کے دماغ میں چکر لگانے لگے۔ وہ تنویر و پروین کو بے حد پسند کرتی تھی۔ انکی خوبصورت ساریاں اُن ریلوں کی حسین بندشیں نظر فریب آرائشِ گیسو اگر کا بیان سینٹ اور ربنوں کا گلگونہ ایک بار یک تنویر و پروین کے گلنار لب شاکرہ کے تصوّر میں مہک اٹھے۔ کاش میں بھی اس طرح سج سکتی! پھر اُن دو بہنوں، دو حسین بہنوں کی پیاری پیاری باتیں، ادب، افسانے، نظمیں، آہ ان نظموں میں کیا جادو ہوتا ہے! وہ بھلی سی نظم۔ اچھا وہ —— کاش تم چلے آتے مستیٔ صبا بنکر! اور میرے ہاں۔ کل کا گھوڑا سمندری شہزادی جیسے میں ابھی تک بنھی سی دھری ہوں۔ ہوں! اور دیکھ لو۔ کیا کتاب ہوئی! راہِ نجات۔ بسوچ کا ثواب۔ جنت کا حصول۔ بہشتی زیور۔ برائی کا انجام۔ صبغۃ اللہ۔ . . . وہ تو خدا بھلا کرے ناصر کا۔ بھائی جان کی میز پر سے اچھے اچھے رسالے چرا کر لا دیتا ہے۔ بچارہ ناصر۔ اور جو ناصر نہ ہوتا! اونہہ . . ."

شاکرہ انہیں خیالات میں گم تھی کہ پھر گفتگو کی ایک سمع خراش موج باہر سے آئی۔

"یہ تنویر و پروین تو مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتیں۔ مجھے انکے لچھن اچھے دکھائی نہیں دیتے بھلا

کنواری لڑکیاں یوں ٹھٹھا کے لگاتی ہیں۔ یہ خالہ بی کی تنقید تھی۔ شاکرہ کا جی چاہا کہ وہ انہیں چیخ کر خوب زور سے قہقہے لگائے مگر یہ ناممکن تھا۔ اس کا ارادہ بغاوت بجھ کر رہ گیا۔ اُسے تو مسکرانے تک کی اجازت نہیں تھی۔ ہر وقت سنجیدہ کیا ماتمی چہرہ بنائے بیٹھے رہنے کا حکم تھا۔ اِسے منحوس مت بدلومت۔ چوروں کی طرح دبے پاؤں چلو مجرموں خطاکاروں کی طرح سمٹے سمٹائے رہو۔ بغرض سینکڑوں احکام تھے۔ جنکے مسلسل بوجھ تلے اس کی ساری امنگ پس کر رہ گئی تھی۔ شاکرہ کے چہرہ پر نفرت، پسپائی اور ایک بیزار سی چڑچڑاہٹ کے نقوش بنے اور پھر نوع در نوع جذبات کی موجوں کے ہلکوروں سے مٹ گئے۔

یہ خالہ بی شاکرہ کی والدہ کی ہاں میں ہاں ملاتیں۔ اور انکی مہربانی کو سراہتی تھیں۔ اسکے صلے میں دعوتیں، سوغاتیں اور ہر طرح کی خاطرداریاں۔ ان کے میاں نے ایک رنڈی رکھ لی تھی اور یہ انتقاماً اکثر گھر سے غائب رہا کرتی تھیں۔ ایسے ہی قدرداں عزیزوں کے یہاں مگر اُن کے برتاؤ میں ایک خاص ٹھسا اور رکھ رکھاؤ تھا۔ یہ ہاں میں ہاں ملاتیں بھی تو اس انداز سے جیسے بزرگانہ پسندیدگی کا اظہار فرما رہی ہوں۔ شاکرہ کی والدہ پر انہوں نے اپنی اہمیت اور ضرورت ثابت کر دی تھی۔ اور یوں بھی گھر گرہستی اور سماجی اصولوں میں دونوں کا اتفاق تھا۔ شاکرہ کی والدہ 'خالہ بی' کی پسند اور ناپسند کا بڑا پاس کرتی تھیں۔ جیسے ایک فن کار دوسرے ہم نظر و ہم ذوق فن کار کی تعریف کو بہت عزیز رکھتا ہے۔ اسی طرح انہیں "خالہ بی" کا سراہنا بہت مرغوب تھا۔ دوسری باتوں کے علاوہ کنواری لڑکیوں کی تربیت کا معیار قائم کرنے میں بھی 'خالہ بی' کا بڑا دخل تھا۔ خالہ بی تو سرزنش تک کی قائل تھیں اور اس بلند معیار پر شاکرہ کی والدہ کا پورا اترنا ضروری تھا۔ لہٰذا جب بھی یہ 'خالہ بی' گھر میں

رونق افروز ہوتیں۔ شاکرہ اپنے کندھوں پر تربیت کا وزن زیادہ محسوس کرتی۔ شاکرہ جب نو سال کی ہوئی اُسی وقت سے وہ باضابطہ طور پر محض لڑکی سے کنواری لڑکی شمار کی جانے لگی اور مکلف بنا دی گئی۔ اوامر و نواہی کی بوچھاڑ شروع ہوئی۔ احکام سے ممانعتوں کی فہرست زیادہ طویل ہوتی گئی۔ کنواری لڑکیاں یوں نہیں کرتیں۔ وہ نہیں کرتیں۔ عمر کے ساتھ ساتھ احکام زیادہ مستحکم اور ممانعتیں زیادہ شدید ہوگئیں۔ یہاں تک کہ پندرہ سال کی عمر میں وہ ایک کوٹھری میں مقید ہو کر رہ گئی۔

شاکرہ سینا پرونا، کھانا پکانا، اور خانہ داری کے دوسرے کام سب سیکھ چکی تھی۔ گھر میں باورچن، خادمائیں، مامائیں موجود تھیں۔ لہذا اُسے کچھ خاص کام بھی کرنا نہ ہوتا۔ بس یونہی سینے پرونے رہنا۔ کبھی کبھار باورچیخانہ میں کوئی اچھی چیز پکانے چلے جانا اور پھر اپنی کوٹھری میں پڑے بہشتی زیور پڑھنا۔

”اتنی بڑی ہوگئی اور اوڑھنی گلے میں لپیٹے پھرتی ہے۔ اِدھر آ! اِسے یوں اوڑھتے ہیں کمبخت اتنا بھی سلیقہ نہیں تجھے۔“

یہ تھے تادیبی الفاظ جو شاکرہ نے آٹھ سال کی عمر میں سنے۔ اُس نے سوچا تھا کہ یہ اوڑھنی اوڑھنے میں مجھ پر نئی پابندیاں کیوں لگائی جا رہی ہے۔ حکم کو تو وہ بھول گئی۔ لیکن حکم کی تلخی کا ایک مبہم احساس اس کے دل سے مٹ نہ سکا۔ اُس نے کئی بار گھر کیاں سنیں۔ مگر وہ اوڑھنی کے الجھاوے میں گرفتار ہونے کے لئے تیار نہ تھی۔ ماں اور بڑی آپا کے سامنے تو خیر مگر بہنوں اور چھوٹے بچوں کے ساتھ کھیلتے وقت وہ کچھ انتقاماً بھی اوڑھنی کو اتار پھینکتی۔ بارہ سال کی عمر میں اُسے خود اوڑھنی سلیقے سے اوڑھنے کی ضرورت نمایاں نظر آنے لگی۔ لیکن حکم کی غیر ہمدردانہ شدت کی خلش اُسے اکثر عدولی حکم پر مجبور کرتی اور وہ اوڑھنی گلے میں نام کیلئے لپیٹ کر کبھی کبھی گھر کی انگنائی یا کوٹھے کی چھت

پریوں ہی یا کسی چھوٹے بچے کو پکڑنے کے لئے دوڑ جاتی۔ اُسے کپڑے کی سرسراہٹ اور ہوا کے مس سے لذت حاصل ہوتی اور سب سے بڑھکر نافرمانی کی مسرت۔

"اری کمبخت! بے حیا! اُچھلتے لگاتی پھرتی ہے۔ بے شرم! جوان ہو گئی اور لاج شرم کچھ نہیں جب دیکھو اُڑی ہوئی ہے یہاں آ!" "شاکرہ! کدکڑے مت لگاتی پھر!" اسی قسم کی آوازوں سے شاکرہ کی پھوٹتی کونپل کو "خوش آمدید" کہی جاتی تھی۔ وہ سوچتی کہ آخر مجھے کیا ہو گیا ہے جو یک بیک اماں جان اور ابا جان مجھ سے ناحق کے خفا رہنے لگے ہیں جب سنو "جوان ہو گئی ہے" یہی سنتے سنتے تو کان پک گئے۔ جیسے اِن باتوں میں میرا قصور ہے۔ شاکرہ اُٹھتی ہوئی نظروں سے اپنی بیش نگاہ تبدیلیوں کو دیکھتی اور ایک مسرت آگیں حیرت کے احساس میں بزرگوں کی سختیوں کو بھول سی جاتی۔

"کنواری لڑکیوں کو دبا کے رکھنا چاہیئے۔ جوانی دیوانی . . . ." ایک روز شاکرہ نے 'خالہ بی' کی یہ بولی سنی۔ اُس روز اُسے ایک نہایت ہی عجیب اور وحشتناک تجربہ ہوا تھا۔ وہ ابتک اُس تجربہ کی گھبراہٹوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ڈری ڈری، سہمی ہوئی، پریشان، متفکر، بدحال ــــ خالہ بی کی بکواس سے وہ سر سے پاؤں تک سلگ سی اُٹھی۔ وہ سوچنے لگی "لوگوں کو مجھ سے نفرت ہو گئی ہے تو میں بھی سب سے نفرت کروں گی۔ نہ جانے مجھے کیا ہو گیا ہے اور یہ لوگ بے حس بنی ہوئی اُلٹا میرے خلاف مشورے کر رہی ہیں۔ میں جوان جو ہوئی تو جیسے بڑا گناہ کیا جس کی سزا مجھے دی جاتی ہے۔ اے اللہ میں مر ہی کیوں نہیں جاتی۔ اچھا ہے اب اِسی طرح جان نکل جائے گی۔"

شاکرہ کبھی سوچتی کہ آخر یہ جوان ہونا کیا بات ہے۔ وہ مبہم مگر حقیقی نئی کیفیتوں کی تہ میں

ڈوب کر اپنے آپ سے واقف ہونا چاہتی تھی۔ اُس کے ذہن و تخیل نیم بیداری کے عالم میں کروٹیں بدل رہے تھے رفتہ رفتہ اس کے احساسات غیر واضح انداز میں انگڑائیاں لینے لگے۔ وہ اپنے دل کی دھڑکنوں کے ساتھ ایک موہوم مگر شیریں سرگوشی کا سُراغ پانے لگی تھی۔ اس کی زندگی کا افق وسیع اور رنگین ہوتا محسوس ہو رہا تھا مگر اس وسعت میں ایک کپکپا دینے والا حیرت افزا خوف بھی تھا اور اس رنگینی کے ساتھ بے دردی اور اوامر و نواہی کے سیاہ بادل بھی منڈلاتے نظر آتے تھے۔ وہ اب تک چھوٹے بچے بچیوں کے ساتھ کھیلتی رہی تھی مگر اب وہ نوجوان لڑکیوں کی صحبت کو پسند کرنے لگی شاید وہ ان کے مطالعہ سے اپنا راز معلوم کرنا چاہتی تھی۔ اس کی دو بہنیں ہنوز کنواری تھیں۔ ایک اکیس سال کی اور دوسری اُنیس کی۔ وہ دونوں ہمیشہ ساتھ رہتیں اور آپس میں گاہے گاہے رازدارانہ طور پر باتیں کرتی پائی جاتیں۔ شاکرہ کو بھی ایک جستجو سی رہنے لگی کہ وہ کیا باتیں کرتی ہیں اور ایسی باتیں جو اماں جان اور بڑی آپا کے سامنے آتے ہی رُک جاتی ہیں۔ مگر وہ اُن کی صحبت میں نہیں باتی تھی۔ "شاکرہ تو بڈھی کی طرح ہم لوگوں کے ساتھ آکر کیا بیٹھتی ہے؟" غریب شاکرہ عجیب دوراہے پر تھی۔ وہ چھوٹے بچوں کے ساتھ کد کے بھی نہیں لگا سکتی تھی اور نوجوان لڑکیاں اُسے پوچھتی نہیں تھیں۔ محلے کی کنواریاں بھی اپنی بہنوں ہی کے ساتھ جا کر بیٹھتیں اُٹھتیں یہاں تک کہ اس کی ہم عمر لڑکیاں بھی اُسی مجلس کو پسند کرتیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ وہ بھی اُسی محفل کی دلدادہ تھی۔ ہاں شاکرہ کی ایک دو ہم سن لڑکیاں جب اُس بزم سے نکالی جاتیں تو پھر شاکرہ کے ساتھ باتیں کرنے آجاتیں مگر یہ سب بھی تو ویسی ہی بھولی بھالی تھیں۔ تیرہ چودہ سال کی عمر ہی کیا ہوتی ہے۔ بہر کیف شاکرہ کا جذبۂ جستجو تشنہ ہی رہا۔ اُس کے دل میں نئے نئے سوتے پھوٹ رہے تھے مگر وہ ماحول کی ناہمدردی کے سبب

سوکھ سوکھ کر فنا ہو جاتے تھے۔ اُس کے جی میں صدہا سوالات پیدا ہوتے اور اسکا جواب بس اِس طرح ملتا ـــــ "کنواری لڑکیوں کو یہ نہیں بولنا چاہئے۔ وہ نہیں کہنا چاہئے۔ ٹپ ٹپ باتوں میں دخل دینا بُرا ہے۔ بال یوں نہ سنوارو۔ نظریں یوں نہ اُٹھاؤ۔ اِس طرح چلنا معیوب ہے۔ اِس طرح ہنسنا بے شرمی ہے۔ ایسے کپڑے نہ پہنو۔ یہ مت کھاؤ۔ وہاں مت بیٹھو۔ ادھر نہیں جاؤ" شاکرہ سوچتی آخر وہ کیا کرے۔ بس اسی طرح سوچتے رہنے سے اس کی زندگی ہی محض سوچ ہو کر رہ گئی۔ وہ اپنے من کی کٹیا کے اندر تنہا عالمِ خیال میں زندگی بسر کر رہی تھی۔

جب شاکرہ چودہ سال کی ہوئی تو ایک ہی ساتھ اُسکی دونوں کنواری بہنوں کی شادیاں رچائی گئیں۔ ان دنوں خالہ بی تو مستقلاً شادی کے گھر ہی آ کر رہ گئی تھیں۔ انکے حاضر و ناظر ہوئے بغیر کوئی کاج بھلا کیسے انجام پا سکتا تھا۔ مہمان بی بیاں بھی آئی تھیں۔ لہٰذا شاکرہ پر سخت پردے کے احکام نافذ کر دئے گئے تھے۔ دلہنوں کے مانجھا بیٹھنے والے کمرے میں بھی اُسے جانے کی اجازت نہ تھی۔ اوّل تو رشتہ دار بی بیاں وہاں دلہنوں کو دیکھنے آتی رہتی تھیں اور پھر دلہنوں کی سکھیاں رنگین محفل جمائے بیٹھی چھیڑ چھاڑ کرتی رہتی تھیں۔ برات کے دن قریب آتے گئے اور رنگ رلیوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ ہر طرف گھما گھمی اور کام کاج کے ساتھ بے کام کے کام بھی ہوتے رہتے تھے۔ راتوں کو محلے کی نوجوان لڑکیاں آجاتیں تو شاکرہ کا دل خوب بہل جاتا۔ مگر دن کو وہ تنہائی اور قید سے اکتائی رہتی۔ گھر میں ہر سو چہل پہل مگر اُس کے لئے گھر بیابان۔ ان دنوں شاکرہ پر کچھ راز منکشف ہوئے۔ کنوار پنے اور جوانی کے راز۔ شادی کے گھر میں عمر رسیدہ عورتیں بھی ماضی کی رنگینیاں بیان کر کے کچھ دیر کے لئے سرشار ہو جاتی ہیں۔ اور نئی شادی شدہ لڑکیاں کنواریوں کو چھیڑ چھیڑ کر راہ و رسمِ منزل سے آگاہ

کر جاتی ہیں۔ شاکرہ پر بھی رنگین انکشافات ہوئے، مگر غیر واضح طور پر۔ اس کے تخیل کو اور مہمیز لگ گئی۔ وہ دن بھر کوٹھری میں پڑی نئی باتوں کو سوچتی رہتی۔ وہ علم اور لاعلمی کی بھول بھلیاں میں الجھی رہتی۔ اس کا جذبۂ تجسس اسے بے قرار رکھتا اور سوچتے سوچتے وہ تھک کر چڑچڑا سی جاتی۔ اس کا اپنا جسم اس کے لئے باعثِ حیرت تھا۔ اور روح کی گہرائیاں اس سے زیادہ حیرت فزا۔ خون کی روانی اور مبہم تمناؤں کی موجیں کبھی اسے خواب آگیں رنگین جزیروں میں لے جاتیں اور کبھی سرشارِ حقیقتوں کی طرف مائل کر دیتیں، وہ تخیل کے طیارے پر پرواز کرتی، تمناؤں اور حسرتوں کی کشتی پر ڈگمگاتی اور گاہ تصور کے بت خانے تعمیر کر کے اپنے نوجوان بیدار ہوتے ہوئے حواس کو انجان تجربوں سے ولولہ خیز لذت کے حصول کا موقعہ دیتی۔ اس کے دل و دماغ اور ذہن و روح ایک علیحدہ دنیا بناتے اور بگاڑتے رہتے تھے۔ رات آتی تو شادی کی فضا سمندِ ناز پر اک اور تازیانے کا کام کر جاتی۔ شاکرہ رات رات بھر جاگتی رہتی۔ کروٹوں پر کروٹیں بدلتی اور اٹھ اٹھ کر صراحی سے پانی پیتی تھی۔

آخر کار وہ دن کی نشتر بدست تنہائیوں سے گھبرا اٹھی تھی۔ اس نے ایک روز ناصر کی منت سماجت کی تاکہ وہ اسے بھائی جان کی کچھ کتابیں پڑھنے کو لا دے۔ ناصر رشتے کا ایک غریب لڑکا تھا جو ملازم نما طالب العلم کی طرح شاکرہ کے گھر رہتا تھا۔ بیوقوف، خوفزدہ، سمٹا سمٹایا سا بارہ سال کا کم رو لڑکا۔ چھوٹے چھوٹے برابر ترشے ہوئے سر کے بال، اونچی مہری کا تنگ پاجامہ، دھاریدار میلی سی قمیص، پرانی سلیپریں، جھکی ہوئی گردن اور بنے ہوئے مسکین سے تیور۔ یہ اس کی خصوصیات تھیں۔ شاکرہ ہمیشہ ناصر سے نفرت کرتی رہی تھی، مگر اب ضرورت کے وقت وہ اس کی خوشامد کرنے پر مجبور تھی کیونکہ بھائی جان کی میز پر یا الماری میں سے کتابیں اڑا چھپے نکال لانا خطرے سے خالی نہ تھا۔ ناصر اس کی امداد پر

راضی ہو گیا تھا۔

شادی کے ہنگامے ختم ہوئے اور شاکرہ اس دور سے ایک نئے جاگے ہوئے احساس کے ساتھ نکلی ادھوری آقفیت، رنگین ابہام اور ابہام کی آرزو انگیزی، مگر وہ تکمیل کیلئے کڑھتی ہی رہی اور نوجوان زندگی کے قدم آہستہ مگر یقینی طور پر اپنے جدید ممکنات اور نئے مطالبات کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے۔

بہنوں کی شادی ہو جانے کے بعد اب وہ بھی اپنی نو رسیدہ برتری کی دھونس شاکرہ پر جمانے لگیں۔ وہ شادی شدہ ہو گئی تھیں اور یہ نیا اعزاز و افتخار انہیں اکسا تا رہتا تھا۔ وہ خالہ بی، اماں جان اور آپا جان سے بھی زیادہ اس کے کنوار پنے کی داروغہ بن گئی تھیں۔ شاکرہ کا تخیل آباد تھا مگر اسکی دنیا ویران تھی۔ اُسے تنہائی، بیگانگی، اور کسمپرسی کا تلخ احساس ہوتا رہتا تھا۔ وہ اپنا غصہ گھر کی نوکرانیوں پر اتارتی۔ ذری ذری بات پر بگڑ جاتی، ناک بھوں چڑھاتی اور اکثر برس بھی پڑتی بلیّن چوکی سے دور کیوں ہے؟ گھڑوں میں نہانے کا پانی دیر میں کیوں بھرا گیا، صابن دانی کدھر دھری گئی بلیّن کیا ہوا بس اتنی سی بات اُس کے مزاج کو برہم کر دینے کے لئے کافی ہوتی اور اُسکے نتیجے میں اُسے اکثر سخت سست سننا پڑتا تھی۔ شادی شدہ بہنیں بول اُٹھتیں "ہے کیسی بد مزاج، بد زبان، دماغ ہر وقت عرش پر رہتا ہے۔ دیکھتیں نہیں اماں جان شاکرہ کی بد دماغیاں، کنواری لڑکی اور ایسی بیباک شوخ چشم!" شاکرہ دل میں کہتی "اونہہ کل کو خود بھی تو کنواریاں تھیں۔ اور بد مزاجی میں گھر میں مشہور۔ اور اب تو دماغ ملتے ہی نہیں۔ چلی ہیں مجھ پر دھونس جمانے" گھر کی نوکرانیاں بھی شاکرہ سے منہ پھلائے رہتی تھیں۔ شادی شدہ بہنیں اگر ڈانٹتی تھیں تو پیسے اور کپڑے بھی دیتی تھیں اور شاکرہ محض ایک کنواری لڑکی تھی بس ایک بیچارہ ناصر تھا جو شاکرہ کی نرم و گرم سُن لیتا تھا۔ اور ہر حال میں شاکرہ سے مانوس اور اُس کا طرفدار رہتا

تھا۔ مگر اس کی ہستی ہی کیا۔ ایک ہیچ سا غریب لڑکا۔ بہر حال شاکرہ رفتہ رفتہ ناصر کو اپنا بہی خواہ سمجھنے لگی۔ شاکرہ نے ایک بلی اور چند خرگوش پال رکھے تھے۔ اُن کی دیکھ بھال بھی ناصر کے سپرد تھی۔ بلی خرگوش اور ناصر شاکرہ کی جذباتی زندگی میں دن بہ دن زیادہ اہمیت حاصل کرنے لگے خرگوش سب سے زیادہ۔ کیونکہ وہ کھلنڈرے تھے اور چونچال۔ اس کے بعد بلّی کہ وہ اس کے ساتھ ملکر خُر خُر سوتی تھی۔ اور پھر ناصر کبھی کبھی شاکرہ چاہتی کہ ناصر بھی شوخ چنچل ہوتا اور اچھی اچھی باتیں کرتا مگر وہ تو ایک بیوقوف سا مضمحل کم گو لڑکا تھا۔ کاش اس کی آنکھوں میں کچھ زندگی کے آثار ہوتے جیسے خرگوش کی سُرخ یا بلّی کی ہوشیار چمکتی ہوئی کنجی آنکھوں میں تھے۔ خرگوش، بلّی، اور ناصر کے علاوہ بڑی آپا کا دو سالہ بچہ بھی شاکرہ کی توجہ کا ایک نقطہ تھا۔ وہ اِسے گود میں لیکر خوب پیار کرتی۔ اسکے بوسے لیتی اور اُسے خوب زور سے اپنی آغوش میں بھینچتی۔ اسے اس عمل سے بڑی تسکین ہوتی۔ بچہ کو آغوش میں چمٹاتے چمٹاتے وہ تیزی سے دوڑ جاتی اور پھر بچے کو ہوا میں اچھالتی۔ کبھی یک بیک اسکا جی چاہتا کہ ناصر اُس کی گود سے آکر بچے کو لے لے۔ وہ ذرا شرما جاتی اور پھر بچے کو زور سے سینے سے چمٹا کر بھینچتی اور چٹاخ چٹاخ اُس کے بوسے لینے لگتی۔ اُس نے دو تین بار ناصر کو بلا کر بچے کو اُسے دیا بھی مگر ناصر تو ڈرا ڈرا، سہما سہما آکر حکم کی تعمیل کر جاتا اور بس۔

تو ہاں سائبان میں شاکرہ کی اماں جان اور خالہ بی بیٹھی ہوئی مسلسل باتیں کر رہی تھیں۔ شاکرہ مُٹھی بھینچے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اپنی کوٹھری سے نکل کر یونہی سارے گھر میں گشت کر آئی۔ بڑی آپا سسرال چلی گئی تھیں۔ نئی شادی شدہ بہنوں میں سے ایک اپنے میاں کو خط لکھ رہی تھیں۔ آنکھے

کے کمرے میں جو شاکرہ جا نکلی تو انہوں نے ناز و فخر و شرم کی آمیزش کیساتھ چیں بر جبیں ہو کر اُسے ایک ہلکی سی جھڑکی دی اور جھٹ سے خط کو چھپا لیا۔ دوسری بہن غسل کے نہیتہ میں ادھر اُدھر چہ چہ کرتی پھر رہی تھیں۔ شاکرہ اُن سے بچتی ہوئی پھر اپنی کوٹھڑی میں واپس آ گئی اور آ کر دھب سے پلنگ پر بیزاری کے ساتھ پڑ رہی۔ تھوڑی دیر پڑی رہنے کے بعد وُہ اُٹھی اور آئینہ میں اپنا مُنہ دیر تک دیکھتی رہی اُس نے ہر زاویے سے اپنے چہرے کا جائزہ لیا۔ اُسے اپنے پر کچھ اعتماد ہوا۔ وُہ اچھی خاصی صورت رکھتی ہے۔ اسکی سہیلیاں بھی تو یہی کہتی ہیں۔ اس نے پھر اپنے جوڑے کو کھول کر آئینہ میں دیکھا۔ اُس کے چہرے پر مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ وُہ اپنے کھلے ہوئے جوڑے کو سنوارنے لگی۔ اُسے اپنی سیدھی مانگ اور لپی ہوئی پٹی دیکھ کر غصّہ آ گیا۔ تنویر و پروین کیسی خوبصورت کج مانگ نکالتی ہیں اور وہ ہلکی پھلکی خم بہ خم ایک طرف کو جھکی ہوئی حسین سی پٹی۔ اُس نے آئینہ میں اپنا چہرہ پھر غور سے دیکھا۔ ایسی بدوضع مانگ اور ایسی فرسودہ انداز کی پٹی نے اُس کی شکل کو کیسا غارت کیا ہے۔ وُہ تو سچ مچ بدصورت ہی دکھتی ہے۔ اندر سے ایک آواز اُٹھی۔ نہیں نہیں تو حسین ہے لیکن اُس پرانے فیشن نے تجھے بدنما کر دیا ہے۔ شاکرہ کا جی چاہا کہ وُہ ساری پابندیوں کی زنجیریں توڑ کر رکھدے پھر ایک اور خواہش اُبھری۔ کوئی آ کر اُسے دیکھتا اور اُسے پُر زور طریقے پر یقین دلاتا ”شاکرہ تم بیحد حسین ہو“ مگر زنجیریں شکستنی نہ تھیں اور کوئی اُس کے حُسن کی ستائش کرنے والا بھی نہ تھا۔ وُہ ناامیدی اور بے اعتمادی کی چوٹ کھا کر رونے لگی۔ اُس نے آئینہ جھٹک کر ہٹا دیا اور پلنگ پر لیٹ کر سسکیاں بھرنے لگی۔ وُہ کچھ دیر اسی طرح سسکیاں بھرتی رہی

”ناصر! ناصر! ادھر آ ناصر، ذرا بازار سے پان لا دے!“

یہ اُس کی ماں کی پکار تھی۔ شاکرہ اُٹھ بیٹھی اور بستر کے نیچے سے ایک پڑا ہوا پرچہ نکالکر یونہی ورق گردانی کرنے لگی۔ ناصر ادھر سے گذرا۔ شاکرہ نے اشارے سے اُسے اپنی کوٹھری میں بلایا اب ناصر تیرہ سال کا ہوگیا تھا۔ اُس سے ملنے میں تھوڑی سی پابندی لگادی گئی تھی یعنی دونوں تنہائی میں ایک جگہ نہ پاتے جائیں بس اتنا۔ ورنہ ناصر تو ایک بدھو قسم کا کوتاہ قد سہروسالڑ کا تھا ناصر اِدھر اُدھر دیکھتا، ڈرتا ہوا شاکرہ کی کوٹھری میں دبے پاؤں آیا۔ شاکرہ نے کہا "ناصر! ادا اپنی میں بھائی جان کی الماری میں سے کوئی اچھی سی کتاب لیتے آنا طبیعت بہت گھبرا رہی ہے۔" ناصر "اچھا" کہتا ہوا چلا گیا۔ شاکرہ اپنے بال سنوارنے لگی۔

شاکرہ نے پروین و تنویر کی طرح بال سجائے مگر پن کے بغیر وہ جمتے نہ تھے، بڑی کوشش سے کچھ بات بنی۔ وہ دیر تک طرح طرح سے آئینہ میں اپنی نئی سجاوٹ کو دیکھتی رہی۔ اس کی کوٹھری کی طرف کسی کے آنے کی چاپ سنائی دی۔ اُس نے ڈر کر جھٹ ٹیڑھی مانگ کو مٹا دیا مگر وہ یونہی سی آواز تھی۔ کوئی آ نہیں رہا تھا۔ اُس نے بالوں کو پھر جدید فیشن سے بنایا اور خود کو آئینہ میں دیکھکر بہت مسرور ہوئی۔ وہ اُٹھی اور اُٹھ کر اُس نے قلمدان سے قلم نکالا، اُلٹی جانب سے اُسے دوات میں ڈبو کر پیشانی کے وسط میں سیاہ بندی لگائی اور آئینہ کے سامنے جھوم سی گئی۔ اچانک اُسکے دماغ میں ایک خیال آیا۔ وہ زیرِ لب مسکرا اُٹھی۔ اُس نے دوسرے قلم کو سُرخ دوات میں ڈبویا اور اُسے اپنے متبسم لبوں پر مل لیا۔ اُس کے لب انار کلی کی طرح لہک اُٹھے۔ اُس کے دل میں مسرت کی موجیں مچلنے لگیں اور اُس کی مسکراتی ہوئی آنکھوں سے سرمستی کے پھول برسنے لگے۔ وہ اپنی شبیہ دیکھکر حیرت زدہ رہ گئی۔ اس کا دل چاہا کہ کاش یہ آئینہ ایک بولتا ہوا جادو کا آئینہ ہوتا، اُسکے حُسن کی تعریفیں کرتا

اور شاکرہ ایک وجد کے عالم میں اُسے پیار کر لیتی۔ اپنے سینے سے لگا لیتی اور اُس سے بہت ڈھیری سی اچھی اچھی باتیں کرتی رہتی۔

"شاکرہ باجی! شاکرہ باجی ——! فرحت بھائی اپنے پرچے تلاش کر رہے ہیں۔ جلد لائیے نا —— جلد! پرچے!"

ناصر کی گھبرائی اور گھٹی ہوئی آواز نے شاکرہ کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ وہ شرما گئی مگر اُسے غیر متوقع خوشی بھی حاصل ہوئی۔ ناصر نے اُس کا جلوۂ تازہ دیکھا۔ وہ مبہوت ہو جائیگا "اُف شاکرہ باجی اتنی حسین ہیں!" اور شاید شعلۂ حسن اُس کے ٹھنڈے، منجمد سے دل اور مرجھائی ہوئی آنکھوں میں زندگی، رواں و دواں زندگی کے چراغ جلا دے۔

"کتاب لائے ناصر؟" شاکرہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں! —— فرحت بھائی، پرچے! باجی پرچے!" ناصر نے ہکلاتے ہوئے جواب دیا۔

"میں نہیں دیتی پرچے۔ تم کتاب نہیں لائے۔" شاکرہ نے پرچے نکالتے ہوئے شرارت سے ناصر کو دیکھا اور بے ساختہ ہنس دی۔

"باجی! خدا کے لئے!"

"لے لو نا اگر ہمت ہے! تم کتاب کیوں نہیں لائے؟"

ناصر پرچے لینے کیلئے آگے بڑھا۔ شاکرہ نے پرچوں کو پیچھے ہٹا لیا۔ ناصر پرچوں پر جھپٹا۔ شاکرہ نے انہیں اپنی آغوش میں دبا لیا۔ "میں نہیں دوں گی۔ میں نہیں دوں گی! لو تو جانوں!"

شاکرہ نے ہنستے ہنستے ناصر کا ہاتھ پکڑ لیا۔ گھبرایا ہوا ناصر جلد پرچے حاصل کرنا چاہتا تھا، ورنہ فرحت

بھائی اس کی ہڈیاں توڑ دیں گے۔ شاکرہ کھلکھلا کر ہنسی اور ناصر کے ہاتھ کو اس نے پرچوں سمیت اپنے قریب تر چھپا لیا۔ پرچے کشاکش میں نیچے گر پڑے مگر ناصر کا ہاتھ ہنوز گرفت میں تھا۔ اس نے ایسا محسوس کیا جیسے وہ خرگوش کے چھوٹے بچوں کو مس کر رہا ہے

"شاکرہ! شاکرہ! یہاں آؤ!"

شاکرہ اپنی اماں جان کی آواز سن کر سیدھے سائبان کی طرف بھاگی۔ پھر اُسے اپنی ہیئت کا خیال آ گیا۔ کوٹھری میں واپس آ کر اس نے اپنے کو درست کیا۔ تب اماں جان کے پاس گئی

"کیوں کیا کر رہی تھی شاکرہ؟ کنواری لڑکیاں بھی بھلا اس طرح ہنستی ہیں"

"میں 'راہِ نجات' پڑھ رہی تھی اماں جان۔ خرگوش کے بچے میز پر چڑھنے کی کوشش میں گر گر پڑتے تھے۔ مجھے ہنسی آ گئی"

"بھلا یہ بھی کوئی ہنسنے کی بات ہے۔ کنواری لڑکیوں کو شرم و حیا چاہیے۔ اچھا ذرا کی ذرا خالہ بی کیلئے فرنی تو نکالو۔ کیوڑا اور پستے کی ہوائیاں دے دینا۔ دو انڈے بھی تل لینا۔ نعمت خانہ میں حلوا ہے، وہ بھی لیتی آنا۔ جاؤ سلیقے سے ناشتہ کا سامان کرو ——— جلد ——— ہاں جاؤ!"

"جی اچھا اماں جان!" کہتی ہوئی شاکرہ باورچی خانہ کو نہایت ہی مودبانہ طور پر چلدی

"خالہ بی" کی آواز آئی ———

"بہن! ماشاء اللہ تمہاری لڑکیاں البتہ باحیا باتمیز ہیں"

اب؟

اکبر پور ریلوے اسٹیشن کے سامنے بہت سے یکے لگے ہوتے تھے اور دو موٹر لاریاں کھڑی تھیں۔ ڈرائیور اور کارندے سامنے کے قصباتی چائے خانے میں بھنکتی ہوئی مکھیوں، سوکھے بسکٹوں اور پرانی کیتلیوں کے درمیان گندی ناٹ کی چٹائی پر بیٹھے ہوئے "چاہ" پی رہے تھے کڑے کاٹھ بسکٹوں کو توڑتے ہوئے ان کے جبڑے، دانت، لب اور آنکھیں سب مل کر آپس کی طرح طرح کی چپقلش سے چہروں کے متعدد خندہ آفریں نمونے بنا رہے تھے اور پھر یہ سخت جان بسکٹ ملگجی چائے کی پیالی میں غوطوں پر غوطے کھلائے جاتے تھے اور کچے اوپلوں کی طرح پھول کر چائے کی سطح پر تیرنے لگتے تھے۔ موٹی توند اور میلی دھوتی والے حلوائی کی دوکان کے سامنے بھی کچوریاں اور آلو کی کالی کالی ترکاریاں کم اور پیتل کے لوٹوں میں پانی

زیادہ استعمال ہو رہا تھا مگر سب سے زیادہ بھیڑ خوانچہ والے کے گرد تھی۔ بوڑھے، جوان، یکہ بان اور قلی دھیلے پیسے کی گھنگنیاں لیکر کھا رہے تھے۔ کوئی پتوں پر کا مصالحہ چاٹ رہا تھا۔ کوئی اپنی انگلیوں کو منہ میں ڈال کر چٹخارے لے رہا تھا اور کوئی اس کی بھی توفیق نہ پاکر حسرت سے دیکھ رہا تھا اور گالیاں بک رہا تھا۔ موٹے، مضمحل، کالے اور بھورے کتے ادھر اُدھر دونے چاٹ رہے تھے۔ آپس میں نخ نخ اور بھبول بھبول بھی ہو رہی تھی۔ موٹے کتے کمزوروں پر غرا اٹھتے تھے اور کمزور موقع کی تلاش میں تاک لگائے بیٹھے تھے۔ خوانچہ والا ایک لانبی چھڑی سے اپنے سر کے اوپر تھوڑے تھوڑے وقفے پر ہوا میں دائرے پر دائرہ بنا رہا تھا کیونکہ بھاری بھرکم چیلیں فضا میں دلیرانہ منڈلا رہی تھیں اور کالے چالاک کوے اپنے گول دیدے پھاڑے اچکوں کی طرح گھات میں لگے ہوئے تھے۔

اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر بھانت بھانت قسم کے مسافر ٹکٹ کٹا کٹا کے جمع ہو رہے تھے۔ دور یارڈ میں مال گاڑی کے چند خالی ڈبے غریب الدیار مسافر کی طرح کھڑے ہوئے تھے اور انجن کو پانی پلانے والا اشتر گردن ہلا ہلا اُن کا مذاق اڑا رہا تھا۔ ٹن! ٹن! ٹن! ٹن! ٹن! دوسری گھنٹی بجی ہر طرف کھلبلی مچ گئی۔ قرمزی کرتے کی وردیاں پہنے ہوئے قلی بے تحاشا دوڑ پڑے۔ اسٹیشن ماسٹر صاحب کالا کوٹ پہنے اور سفید عینک ناک پر نیچی لگائے ہوئے اپنی اہمیت کے احساس سے لبریز کمرے سے باہر نکلے اور کسی لٹھ بردار دیہاتی کی بدحواس دوڑ کے سبب اُس سے ٹکراتے ٹکراتے بچے۔

"ابے حرامزادہ سالا! سوجھتا نہیں!" اسٹیشن ماسٹر صاحب گذرے ہوئے خطرے کے

خوف کی جھرجھری لیتے ہوئے بولے۔ قلیوں اور خلاصیوں نے صدائے بازگشت کی طرح مزید اعلان کے ساتھ کہنا شروع کیا۔

"ہوں! اندھا سالے کو تو دیکھو۔ پکڑو سالے کو۔ تیری آنکھ اندھے کے جنے تیری دم میں گھس گئی ہے۔ دیکھتا نہیں اسٹیشن ماسٹر صاحب کھڑے ہیں۔۔۔"

یکہ بان اور موٹر لاری کے کارندے بھاگتے ہوئے آئے اور اسٹیشن کے آہنی پھاٹک کے پیچھے کھڑے ہو گئے۔ عفریت کی طرح شور مچاتی برانچ لائن کی پسنجر گھڑ گھڑ گھڑ ڈھک ڈھک پلیٹ فارم سے آکر لگ گئی اور ہر طرف ایک عجیب سا خلفشار مچ گیا۔ مسافر غلط ملط ہو کر چڑھنے اترنے لگے۔ یکہ بانوں اور لاری کے کارندوں نے نعرے لگانے شروع کئے ——

دلدار نگر —— مخدوم پور —— چلئے! چلئے —— سید پور —— دلدار نگر —— چلئے! —— موٹر لاری! موٹر لاری! —— بابو یکہ! حاضر ہے یکہ! یکہ! ٹم ٹم! جہاں چلئے آرام کی سواری! ٹھٹھا۔ بھرت پور —— مخدوم پور —— دلدار نگر! موٹر —— موٹر، یکہ یکہ! ٹم ٹم! —— حجور ادھر آیئے —— ادھر ادھر حجور! —— مالک جنانہ سواری یکہ پہ۔۔۔۔"

پھاٹک پر لال پیلا ٹکٹ دکھا دکھا کر مسافر باہر جانے لگے اور ان کے حصول کے لئے کشاکش شروع ہو گئی۔ بس لائن پر پہلے لاری نہیں چلتی تھی لہذا عام طور سے یکہ بانوں کو لاری سے خفی صحبت تھی۔ مگر لاری کی کامیابی اور مسافروں کی قلت کے سبب یکہ والوں کی آپس میں چشمک ہی نہیں چپقلش تھی۔ پہلے تو دونوں لاری والوں سے بھی لڑائی کی ٹھنی تھی لیکن

انہوں نے ایکا کر کے وقت بانٹ لیا تھا۔

مسافر زیادہ تر خود ہی لاری کی طرف رُخ کر رہے تھے مگر یکہ بانوں اور لاری والوں کی چیخ پکار جاری تھی بلکہ گھبراہٹ میں اور تیز ہو گئی تھی۔

ایک منچلے یکہ بان نے اپنی ناکامیابی کے دُکھ کو چھپانے کے لئے ایک طنزیہ صدا لگائی ——— "ٹائر پھٹ۔ موٹر بسٹ ایکہ سواپکا، موٹر پر کھاؤ دھکا" اکثر یکے پڑتی کھیت کی طرح خالی پڑے ہوئے تھے۔ ایک دو پر اُن سمتوں میں جانے والے مسافر چڑھے تھے۔ جن اطراف میں لاری نہیں جاتی تھی۔ ایک یکہ والے سے لاری کے کارندے لڑائی کر رہے تھے "مسافر کو چھین لینا خراب بات ہے۔ ہم کہہ دے ہیں ہانک پکار کے۔ ہم کامپٹیشن کرنے لگیں گے تو تم سب بم بول دو گے۔ ہم سے بُرا اچھا نہیں" یکہ والے نے جواب دیا ———

"ہم کامپیٹسن نہیں کرتے ہیں۔ تم لوگ ہمرے سب کا روجی مار کے بھی جبردستی کرتے ہو"

"تب ین مسافر چھین لینے والا کون ہے؟"

"سوچھتا نہیں کہ مسافر اپنے سے یکہ پر آیا"

"ہمرے آنکھ میں دھول ڈالنا چاہتا ہے بے" لاری کے کارندے اپنی کارکردگی دکھانے کے لئے خوب چڑھ چڑھ کر بول رہے تھے۔ کیونکہ لاری کا مالک آج لائن کے ملاحظہ میں آیا ہوا تھا۔

رفتہ رفتہ بات بڑھ گئی اور اب ہاتھا پائی تک نوبت پہنچنے والی تھی۔ گالیوں کا سرمایہ بھی

فریقین نے ختم کر دیا تھا کہ خود مسافر نے بات دبا دینی چاہی

" ارے بھائی لڑو مت! ہم جنانہ سواری کے کھیال سے یکہ پر اپنے سے آگے بیٹھے ہیں۔"

وقت پر لاری کے مالک نے بھی گرج کر کہا "چھوڑ دو! ان کمینوں کو، یہ رانڑ جات اب تو لات سے بھی نہیں مانتے۔ بیسیوں کی مار سالوں کو دو تو سب شیخی نکل جائے گی۔ اگر یہی حال رہا تو ہم مفت میں سب مسافر کو لے جائیں گے۔ دیکھیں یہ کھلیچا کے دن تک سسک سسک کر چلتے ہیں؟ بال بچے بھوک مریں گے تب سب کس بل نکل جائیگا . . . "

غصے کی رَو میں بابو کرپال سنگھ مالک مخدوم پور ایکسپریس، انتقامی جذبات کی انتہائی منزل تک پہنچے جا رہے تھے کہ اُن کے ضمیر نے ہلکی سی ملامت کی۔ جب اُس کے جوش میں کمی آئی تو دماغ نے سوچنا شروع کیا۔ کرپال سنگھ فطرتاً سخت دل آدمی نہ تھے۔

" ان کے بال بچے بال بچے آخر میرے بال بچوں کی طرح کے تو ہیں۔ بال بچوں پر مار ٹھیک نہیں۔ اگر اتنے مسافر اُتریں کہ میرا بھی پیٹ بھرے اور ان کا بھی دلدّر دور ہو تو بہت اچھا ہو۔ مگر آج کل کاروبار بھی تو دھیما ہے۔ بڑا بُرا سمے آ گیا۔ عجت بچانی مشکل ہے۔"

کاروبار کا خیال آتے ہی کرپال سنگھ کے سامنے عملی ضروریات کے مطالبات آ گئے۔

" اگر لاری کی لائن نہ چلے تو پھر میرے بال بچے کیا کریں گے۔ جمینداری تو مکدمہ اور شادی بیاہ کے بجر ہوئی۔ سپھید پوسی نباہنی بھی جرور ہے اور سلے رعیت کسان سبھا کے اندولن سے ملگجاری بھی تو نہیں دیتے۔"

کرپال سنگھ کو پھر غصّہ آگیا۔ زندگی کے بہیمانہ مقابلے میں جبلت کی فکر سارے جذبات پر حاوی رہتی ہے۔ انہوں نے اپنے کارندوں کی ہمت بڑھانے اور یکہ بانوں کو ڈرانے کے لئے مصلحتاً گرج کر کہا:۔

"یہ کمینے لوگ اگر پھر بدمعاشی کریں تو ان کو ٹھیک کر دو۔ ہم دیا کر کے چھوڑ دیتے ہیں تو یہ نیچ جات والے اور سر پر چڑھ کر ناچتے ہیں"۔

لاری کے پاس ہی جمنا یکہ بان اپنے دانت پیس رہا تھا۔ وہ زیر لب بڑبڑانے لگا۔

"ہونہہ! دیا کر کے چھوڑ دیتے ہیں۔ . . . ! بہت بڑے دیالو۔ . . . گریب کا رجی مار کے دیا دھرم کا نام جپتے ہیں سرم بھی تو نہیں لگت۔ سب یکہ والے تو مر گئے۔ اب کرایہ گھٹا کے اپنا نکسان کر دوگے، ہونہہ! اُلٹا احسان ہمرے سب پر۔ دیا کر کے چھوڑ دیتے ہیں۔ . . . ! سالے سب یکہ والے بھی تو بے شرم ہیں۔ لوٹ لے لاری کو۔ . . . توڑ پھوڑ دے سیسہ۔ . . پھاڑ دے ٹائر۔ . . ."

جمنا کا تخیل جذبۂ انتقام کی گرمی سے بے باک تر ہوتا جا رہا تھا۔ خود جذب کی شدت نے اُسے چونکا سا دیا۔ . . وہ محسوس کرنے لگا کہ یہ سب خیال خام ہے۔ لاحاصل۔ . . بے کار۔ . . غریب کا حصّہ غریبی کے سر۔ مایوسی نے جمنا کو پھر گھیر لیا۔ نراس کے ساتھ شدید بھوک کا احساس بھی اس کے جسم کے ذرے ذرے میں نشتر چبھو رہا تھا۔ اُس کے دل کی گہرائیوں میں بغاوت اور مقابلے کا ایک تازہ طوفان اُٹھنے لگا۔ وہ تنہا مقابلہ کرے گا۔ بزدل یکہ بانوں کا گلا گھونٹنے کے بعد وہ لاریوں کو دیا سلائی کے ڈبے کی طرح چور کر رکھ دے گا۔ . . جمنا

بپھرے ہوئے جذبات کی روانی میں بہا جا رہا تھا کہ لاری پوں پوں پوں کرتی ہوئی اکبر پور کے بازار سے گذر گئی۔ موٹر پر چند لڑکوں نے شور مچایا۔ . . . منہ بنا بنا کر پوں پوں کی نقلیں اتاریں اور پھر سب کے سب گرد کی چادر میں لپٹی ہوئی موٹر کے پیچھے دوڑ گئے۔ بازاری کتوں نے بھی دور تک لاری کا دھاوا کیا۔ جمنا یہ منظر دیکھ کر کچھ مسرور سا ہوا۔ کتوں کی جھاؤں جھاؤں اور بھول بھول خود اُس کے دل کی آواز سے مشابہ تھی۔ اُسے گولا، کالو اور بنڈا پر بہت پیار آ رہا تھا۔ وہ انسانوں سے زیادہ اُس کے ہمدرد معلوم ہو رہے تھے جمنا نے للکارا . . . .

"واہ بیٹا بنڈا! لینا ہے کالو . . . . گولا گولا! لیو لیو لیو! لگ لگ لیو! لگ لگ، لیو لیو لیو! چالیس سال کا یکہ بان بچوں کی سی حرکتیں کر رہا تھا۔ للکار کے متواتر اتار چڑھاؤ سے اُس کے جذبات کے شعلے تیز تر بھڑک اُٹھے۔ اب طفلانہ کیفیت کی جگہ وحشیانہ تعاقب کا بھوت اُس پر سوار ہو گیا۔ جمنا نے سچ مچ اپنے نحیف گھوڑے کو جلد جلد تین چار چابک رسید کئے اور خود بھی یکہ کی نشست پر بے چین ہو کر وہ اپنے اعضاء کو حبس کرنے کی حالت میں لے آیا۔ گھوڑا اچانک کی مار سے بھڑک کر یکہ کو سرپٹ لے بھاگا۔ جمنا اپنے خیال میں اپنے دشمن کا قاتلانہ تعاقب کر رہا تھا۔ اکبر پور کے بازار میں ہلڑ سی مچ گئی۔ کئی دہقانی گھبراہٹ میں دوڑ پڑے کسی نے چھلانگ لگائی، کوئی چیخ اٹھا۔ سڑک سودا بیچنے والے اور بیچنے والیوں میں بھاگڑ کی وجہ سے کچھ توجیں بر جبیں تبسم کا اُلجھاؤ پیدا ہوا اور کچھ دلچسپ نوعیت کی خلط ملط رونما ہوئی۔ وہ کانوں اور پیشر منہ ول

سے لوگ تماشہ بینی کے لئے باہر نکل آئے تھے۔ قصباتی شاہدانِ بازاری کو یہ یک وقت نمائش اور دل بہلاؤ کا موقع مل گیا۔ وہ بھی مٹکتی ہوئی زینوں اور دہلیزوں پر آ گئیں۔ بازار میں چلتی ہوئی پرانی سِنگر مشینوں کا سمع خراش نغمہ بھی کچھ دیر کے لئے رُک گیا۔ پُرانی سفید عینکیں لگائے ہوئے نوکیلی داڑھیوں والے بوڑھے خلیفے اور تیل سے چمکتے ہوئے انگریزی بال رکھنے والے گلابی اور فیروزی بنیانیں پہنے ہوئے نوجوان درزی بھی برسرِ راہ نکل آئے یک ٹٹ یکہ کے تماشے کے علاوہ مبالغہ کے ساتھ نخرے کرنے والی رنڈیوں کے نین بھی جھمک رہے تھے۔

جُمنا دُور تک اسی بے تحاشا انداز میں یکہ دوڑائے چلا گیا۔ کئی کتے تھک کر پیچھے رہ گئے مگر بنڈا جُمنا کا ساتھ دیتا رہا۔ راستے میں لڑکوں نے خوب شور مچایا۔ موٹر لاری دُھر کھیل کرتی ہوئی بہت دور جا چکی تھی۔ جب مقصود سامنے نہ رہے تو پھر کوشش سرد پڑ جاتی ہے۔ جُمنا کا بحران دور ہوا اور اُس کا مریل گھوڑا بھی قابو میں آ گیا۔ اُسے خفت محسوس ہو رہی تھی۔ پھر اُسے غصہ آنے لگا۔ اضطراب و ہیجان کے بعد وہ تھکاوٹ بھی محسوس کر رہا تھا۔ خاص کر اس حال میں کہ اُس نے پچھلے گھنٹوں سے کچھ نہیں کھایا تھا اور آج بھی اُسے اسٹیشن پر ایک بھی مسافر نہیں ملا تھا۔ خفت، خفگی، ناکامی اور مایوسی کی ملی جلی کیفیت میں وہ آہستہ آہستہ یکہ ہنکاتا لوٹا آ رہا تھا کہ بہت سے لڑکوں اور چند بے فکروں نے جمع ہو کر جُمنا کا مذاق اڑانا شروع کیا۔ پھبتیاں کسی گئیں۔ بولیاں بولی گئیں، جملہ بازیاں ہوئیں، نخچڑیاں اور نعرے مزید برآں۔ بھرے

بازار کا جاگا ہوا ہیجان اب جمن کے خلاف بروئے کار آ رہا تھا۔ جمن نے لڑکوں کو گالیاں دیں، کوسا۔ ایک دو کو چابک بھی رسید کیا۔

"ای کتنے کے پلّے مریں بھی نا۔"

کوستا، گالیاں دیتا، چابک لہراتا جمنا بڑھا جا رہا تھا۔ اُس کا جی چاہا کہ سب فسادیوں کو یکہ تلے کچل کر رکھ دے مگر وُہ ایسا کر کب سکتا تھا۔ اکبر پور میں اُسے زندگی بسر کرنی تھی۔ وُہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ لڑکے چلّا رہے تھے۔ . . . . "واہ جمن بول بول! واہ جمن پوں پوں!" جمنا اپنے آپے سے باہر ہونے لگا۔ اُس نے دو چار کو چابک کے دستے سے پیٹا، مگر یہ بلا تو قدموں لگی تھی۔ اب چوراہے کے قریب تو بڑے بوڑھوں نے بھی بولی ٹھولی سے جمن کی تواضع کی۔ جمن کی ہیئت کذائی اور اُس کے گرد غول بیابانی کو دیکھ کر کسبیوں نے بھی تھپڑیاں پیٹنی شروع کیں۔ جمنا کو اپنے اوپر رحم آنے لگا۔ وُہ دُنیا سے بیزار ہو رہا تھا۔ اُسکی آنکھیں نم آلود ہو گئیں۔ اُس کے دل نے محسوس کیا۔ ساری دُنیا اُس کو شکار بنائے ہوئے ہے۔ اُسے جھنجھوڑے ڈالتی ہے اور اسے فنا کر دینے کے درپے ہے۔ اپنے اندر وُہ تابِ مقابلہ کو پگھل پگھل کر مٹتا پا رہا تھا۔ اُس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور اپنی فوری خفت کو چھپانے کے لئے یکہ کو ٹھہرا کر ایک بنئے کی دوکان میں گھس گیا۔

"چودھری! ایک پیسے کی بڑی تو دو!"

جمنا نے بلا سوچے سمجھے بڑی خریدنی چاہی۔ پھر اُسے خیال آیا کہ اُس کی گرہ میں

کوڑی بھی نہیں ہے۔ مگر وہ مانگ تو چکا ہی تھا۔ جواب کا انتظار کرنے لگا۔

"جمن اب ادھار ایک پائی بھی نہیں ملے ہمارا پہلے بہت کرجہ باکی ہے . . . ."

پھر بھی جمنا نے بنئے کی دوکان میں دیر لگائی تا کہ بے فکروں، لفنگوں اور شیطان کے گرگے بازاری لڑکوں کے ہنگامے ختم ہو چکیں

جب جمنا دوکان سے باہر آیا تو اس کا دماغ آج کی فکر، کل کے فکر، کل کے سوچ اور ایسے ہی نامراد آنے والے دنوں کے رنج میں غرق تھا

سامنے سے ایک بوروں سے لدی ہوئی بیل گاڑی گذر رہی تھی۔ اس کے عقب میں پرچوں کی دوکان کی دیوار پر برٹینیا بسکٹ کا اشتہاری ٹین لگا ہوا تھا جو وقتی طور پر بوروں سے چھپ کر پھر نمودار ہوا اور اس کے پہلو میں لپٹن ٹی کا بڑا سا بورڈ بھی دیر سے لٹکا ہوا تھا۔ بازار کے لوگ اپنے اپنے کام میں لگ گئے تھے۔ رنڈیاں بھی اپنی اپنی کوٹھریوں میں واپس جا رہی تھیں۔ ان میں سے ایک کے بھرپور جوان کولھے کو ساری کی لپیٹن کے اندر جمنا نے کوٹھری کے اندھیرے میں تحلیل ہوتے ہوئے دیکھا۔ اسے جانے کیوں اپنی جوان بیٹی یاد آ گئی۔ جس کی شادی محض اس کی غربت کی وجہ سے نہیں ہو رہی تھی اور وہ لرز کر رہ گیا۔ بیس سال کی چٹان سی ہندوستانی لڑکی . . . جمنا کو تکلیف دہ حیرت کا احساس ہوا کہ کمبخت کیا کھا کے ایسی جوان ہو گئی۔ بھوک مرتے تو دن کٹے۔ اس پر یہ بدن ہاتھ نکالا ہے۔ اس وقت اس کی یہ عجیب سی تمنا تھی کہ اس کی سب بیٹیاں مر جائیں کمبخت ہیں بھی تو پانچ عدد . . . . . . اور دو بیٹے۔ سب سے بڑی تو وہ بڑھی

گھوڑی اُس کی بیوی کہ دیئے جاتی ہے بچے پر بچے۔ اسی کا گلہ کیوں نہ گھونٹ دیا جائے . . . . . . اس خیال کے آتے ہی اچانک اُسے اپنے سارے بال بچوں پر رحم آنے لگا اور اپنی شریک حیات پر بھی۔ اُس کی یہ خواہش ہوئی کہ وہ خود ہی کچھ کھا کے سو رہے . . . . .

جمنا کو اپنا گذرا ہوا زمانہ یاد آنے لگا۔ بازار میں ٹھٹھیرے دھات کے برتن پیٹ رہے تھے اور ایک سکھ جوتشی سڑک پر شکار پھانسنے کے لیے منڈلا رہا تھا۔ ایک دفعہ جب جمنا ابھی اپنے کھیت سے بے دخل نہیں ہوا تھا۔ کسی جوتشی نے اُسے یہ خوش آئند بات بتائی تھی کہ اُس کو بہت سی دولت ملنے والی ہے اور نتیجہ یہ ہوا کہ کھیت سے بے دخل ہو جانے کے بعد گھر کا برتن بھانڈا گرو رکھ کر اُسے یکہ خریدنا پڑا اور اُس کی بیوی کی ہنسلی بیچکر اُس نے گھوڑا مول لیا۔

جمنا نے ایک دلدوز آہِ سرد کھینچی۔ وہ ایک باعزت کسان تھا۔ اپنی محنت سے اپنے کھیتوں کو چوتھی کی دلہن بنائے رہتا تھا۔ اُسے محنت سے رغبت تھی۔ بلکہ محنت ہی اُس کی زندگی تھی جب اُس کے کھیت پک کر سونے کی طرح پیلے ہو جاتے تھے تو وہ ایک غنی دل کے ساتھ خدا کا شکر ادا کیا کرتا تھا۔ پھر اُس کی بدقسمتی کا دور . . فصل کی خرابی مالگذاری کا بقایا . . . . ساہوکار سے قرض . . . . سود در سود اور پھر سارے کھیت نیلام۔ خدا نے تو دو تین سال کے بعد رحم کیا تھا۔ بارشیں خوب ہوئیں اور فصل بھی اچھی لگی۔ مگر انسانوں کا گھن۔ خدا کی آزمائش جا اُس کی لعنت سے بھی بڑھ کر ہے۔ خدا کا

قانون نہ سمجھ میں آئے مگر انسانوں کا نظام تو سمجھ میں آتا ہے۔ ایک بہیمانہ مقابلہ . . . . اگر کوئی کمزور ذرا گر جائے تو پھر ساری دنیا اُسے پیستی ہوئی روندتی ہوئی آگے بڑھ جاتی ہے۔

دُکھ اور مصیبت کے وقت آدمی فلسفی بن جاتا ہے جمنا اپنے رنگ میں اسی قسم کے خیالات میں غرق تھا لیکن انسان صرف خیالات ہی میں اُلجھا نہیں رہ سکتا۔

وہ اپنے یکہ پر آ کر بیٹھ گیا اور گھر کی طرف چلنے لگا۔ اُس سے گھر جایا نہ جاتا تھا۔ اس کی بیاہتا اُس کے بال بچے بھی چوبیس گھنٹوں سے فاقہ کئے ہوئے تھے۔ یکہ بانی سے اس کی گذر بسر ہوتی چلی جا رہی تھی لیکن جب سے اس سڑک پر لاری چلنے لگی تھی جمنا اور دوسرے یکہ بانوں کا دیوالہ ہی نکل گیا تھا۔ دو مہینے سے قرض پر بسر اوقات تھی اور اب تو بنئے بھی ہوا کا رُخ دیکھ کر اودھار دینے کے نام سے کانوں پر دھرتے تھے۔

نا امیدی کی تند ہوا کی زد پر امید کا دیا جلانا زندگی کے اَن گنت بھیدوں میں سے ایک راز ہے۔ جمنا یکہ سے اتر پڑا اور اس کے چراغ کی لو کو دانستہ تیز کرتا ہوا بدھن ساؤ کی دوکان پر پہنچا۔ بدھن ساؤ قصبہ کا سب سے بڑا آڑھتیا تھا اور اپنے پُن دھرم کے کاموں کے لئے بھی خاصی شہرت رکھتا تھا۔ پُن پُن ندی کے کنارے بھوتنی جی کا مندر اسی کا بنوایا ہوا تھا۔ یوں ہر روز بھی سنت سادھو اس کی ڈیوڑھی سے دھِپنا لے جایا کرتے تھے۔ اُسکی آڑھت میں ہزاروں من غلہ اکثر رہتا تھا۔ آڑھت کے سامنے اس کی دوکان بھی تھی۔ جمنا سیدھا بدھن ساؤ کی دوکان میں گیا۔ ساؤ گدی پر براجمان تھا۔ اس کے شکن اندر شکن توند سے پسینہ نکل رہا تھا۔ میلی سی دھوتی جانگھ تک چڑھی ہوئی تھی۔ فربہ چہرے پر قشقہ لگا ہوا تھا اور لوہے کی تجوری

پاس ہی رکھی ہوئی تھی کئی ملازمین دوکان کا کام سنبھالے ہوئے تھے اور منیب کھاروا ل کی سُرخ جلد والی بہی پر حساب کتاب لکھ رہا تھا۔ جمنا پر فضا کا رعب طاری ہوگیا مگر ضرورت ہر چیز پر غالب آجاتی ہے۔ اُسی نے بدھن ساؤ سے عرض کی۔ ۔ ۔ ۔ "حضور مائی باپ اس سرکار پر میرا حال جاہر ہے حضور جان بچالیں تو جنم بھر کی گلامی نوکر نا ہئے ہے۔ ۔ ۔"

بدھن ساؤ منیب سے لیکر حساب دیکھنے لگا۔ جب تھوڑی دیر کے بعد جمنا نے پھر اپنا دکھڑا سنایا تو ساؤ نے نہایت ہی ایماندارانہ کاروباری انداز میں جواب دیا۔

"جمن! کاروبار میں اودھار بگیر آگے کی اُمید پر نہیں دیا جاتا۔ ۔ ۔ ۔" اور پھر وہ حساب کی بچھارن میں اٹل طور پر لگ گیا

جمنا بے حس سا دوکان سے باہر نکلا۔ دو موٹے سادھو لوہے کے چِونٹے جھنجھناتے اور آشیرباد دیتے دوکان میں داخل ہو رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے لئے تو جمنا کا دماغ بالکل ایک خلا جیسا تھا۔ پھر اُس پر جذبات کی ایک رو طاری ہوئی۔ وہ اپنے مریل گھوڑے کو جب کہ پیار کرنے لگا بغیر معمولی پیار اور جب جذبات کا سیلاب رُکا تو جمنا کے دماغ میں صرف ایک مہیب سوال گونج رہا تھا —— **اب؟** ——

گندے انڈے

"یار آج دانا پور رجمنٹ اور ٹاؤن اسپورٹنگ کا میچ ہے۔" کلّو نے عیدو نانبائی سے کہا۔

"سچ کہو؟ یار کلّو کام تو سالا سو دن کا ہے۔ ہم میچ جہر ور دیکھیں گے۔ بکریداکیو دکان پر بٹھا دیں گے۔" عیدو بولا۔

دس بجے دن کو عیدو نانبائی کی دکان کے سامنے باتیں ہو رہی تھیں۔ کچھ اور لوگ بھی جمع ہو گئے۔ سن رسیدہ لوگ۔ جوان، چھوکرے۔ نانبائی کی دکان محلے بھر میں بہ یک وقت کلب، ریڈنگ روم اور کونسل ہال کی حیثیت رکھتی تھی۔

کلّو اس حلقے میں سب سے زیادہ باخبر شخص تھا۔ یہاں اس کی حیثیت صدر کی سی تھی۔ محلے میں اس کا کافی اثر تھا۔ کلّو اور عبید ولڑکپن کے دوست تھے۔ اس اُدھیڑ عمر میں بھی انکی نبھی جا رہی تھی عبیدؔ تین پشت سے نانبائی تھا اور اس نے اپنے بیٹے قمرو اکو بھی اسی کام پر لگایا تھا۔ مگر وہ ذرا کھلنڈرا تھا۔ لونڈوں کے ساتھ لٹّو، پتنگ بازی، تاش میں وقت گذار رہتا تھا۔ کلّو کا باپ حقہ مرمت کیا کرتا تھا۔ اس کی تو اچھی گذر گئی۔ رئیسوں کے یہاں پہنچ تھی۔ وہ حقہ چڑھانے میں بھی ماہر تھا۔ اس کام میں اسے فن کاری کا درجہ حاصل تھا۔ تمباکو کی قسمیں، چلم کے اقسام، سرپوش کے سائز، حقوں کے انواع، حقہ نوشوں کی مزاج کی نوعیت، موسم کا اثر حقہ اور اس کے متعلقات پر، ان سب باتوں کے متعلق "میر صاحب" کی واقفیت حیرت انگیز تھی۔ وہ محلہ کیا شہر بھر میں "حقہ والے میر صاحب" کے نام سے خاص و عام میں مشہور تھا۔ جب تک اس کی کمر خم نہیں ہوئی تھی وہ اپنے محلے کے اکھاڑے میں استادی کے فرائض بھی انجام دیتا تھا۔ لکڑی، لاٹھی، گتکا، بنگیٹھی، بنوٹ، تلوار، رومالی ہر فن میں وہ طاق تھا۔ جن کے انار پر بھی اُس کا ہاتھ دیکھنے کے قابل تھا۔ اپنے بیٹے کلّو کو بھی اُس نے اپنے فنون سکھانے چاہے لیکن وہ لڑکپن سے شریر اور بھگوڑا تھا۔ اُسے دنگل، بھیڑے کی لڑائی، بٹیر بازی، فٹ بال میچ اور نوٹنگی کا شوق تھا۔ محرم کے اکھاڑوں میں نام پیدا کرنے کیلئے اس نے باپ سے لکڑی، گتکا، تلوار کے ہاتھ تو سیکھ لئے لیکن حقے کے فن سے اُسے نفرت تھی اور ہمیشہ رہی "میر صاحب" پر بڑھاپا طاری ہوتا گیا اور پھر سگرٹوں کی وہ دھواں دھار ہوئی کہ حقے کی گرم بازاری سرد پڑ گئی اور میر صاحب کا پیشہ ماند پڑ گیا۔ کلّو اپنے دوست عبیدؔ نانبائی کی روٹیاں بیچ کر اپنے کنبے کا پیٹ پالنے پر مجبور ہو گیا۔ مگر اس کا خیال اونچا تھا اور اُسکی ناک اُسکے خیال سے بھی زیادہ اونچی تھی۔ وہ صرف افسروں کی کوٹھیوں پر جا کر پاؤ روٹیاں اور کیک فروخت کیا کرتا تھا۔ پھر شام کو بنگلوں کی خیریں خوب نمک مرچ لگا کر دکان پر سناتا

"یار عبدوا ہم تو لاکھ برس گلیوں میں پھر کر دو دو روٹیاں نہ بچیں۔ اللہ کی قسم کوٹھیوں پر جو عجب ہے سو کہیں نہیں! باورچی، بیرا، مالی، خانساماں سب بھلے سے بولے ہیں اور میم صاحب بھی ہنس ہنس کر بات کرتے ہیں . . . ."

"ائیں بھائی کلو میم صاحب لوگ بھی . . . ." جمو باورچی حیرت اور حسرت سے آنکھیں مٹمٹانے لگتا

"ارے جموا اب کا!" کلو سرپرستانہ انداز میں کہتا۔ "ولایت کے صاحب لوگ تو یہاں سے بہت چلے گئے تھوڑے رہ گئے ہیں۔ اب تو بنگالی بابو کی چلتی بنتی ہے۔ ایک آدھ اپنے دیس کے لوگ بھی ہیں کچھ مسلمان رئیس کے لڑکے بھی پڑھ لکھ کر افسر ہوئے ہیں مگر افسر لوگ سب اچھے ہووے ہیں سرکاری ٹھاٹھ باٹھ ہے۔" سرکاری، پر کافی زور دیتے ہوئے۔

شبراتی فلمی گر معاملہ فہمی کے ساتھ اپنا چندلا سر ہلاتا اور عبدو گڑگڑی کے دو تین کش لگا کر قمروا کو پکارنے لگتا۔ ہر دس بارہ منٹ کے بعد وہ اپنے بیٹے کے شجرہ نسب کے متعلق نئی نئی تحقیقات کا اعلان کرتے ہوئے اُسے آواز دیا کرتا تھا۔ مگر اس کا سعادت آثار فرزند ہمیشہ مفقود الخبر ہی رہتا۔

"ہم تو اپنے شہر کے "ٹاؤن اسپوٹنگ" کی طرف ہیں۔ یار عبدو۔ رجمنٹ والے سالے بوٹ پہنے کھیلے ہیں۔ سالے کرنٹے!" کلو نے کرنٹے اس طرح کہا کہ وہ دنیا بھر کے کرنٹوں کا گلا گھونٹ کر ہی تو جیسے رکھ دیگا۔

"اوستاد! کہو تو حربہ ہتھیار ساتھ رکھ لیں۔ پولیس سالا کیا کرے گا!" رمضانیاں گاڑیبان نے سینہ تانتے ہوئے کہا۔

"نہیں رے رمضنیاں! ہم نہتے سالے گوروں پر بھاری ہیں" کلو نے اپنے آبائی فن کے زعم میں کہا

"نہیں بھائی لڑائی بھڑائی ٹھیک نہیں۔ گورا چمڑا ہی حاکم ہے۔"

خیراتی درزی نے اپنی نوکیلی داڑھی ہلاتے ہوئے روپہلے بیضوی چشمے کے اوپر سے مشورہ دیکر اپنی اہمیت ثابت کرنی چاہی۔

"ہاں کھلیچھ! ٹھیک بات ہے۔" عیدو نے تاکید کی۔

"ارے اِن کرنٹوں کی مرمت تو کلکتہ میں ہوئے ہے کلکتہ میں محمڈن اسپوٹنگ کے میچ میں جُم کھال اور رسا تو اِن سالے حرامجادوں کو ایسا اَئیناک دیوے ہیں آتنا بھر مار مارے ہیں کہ نخری چھوڑ بیں ویری ڈل ڈسم کی راہ سے نکل جا ہے۔" مجمع پر اُسکے "کلکتہ رٹرنڈ" ہونے کا رعب پڑا اور خود اُس کے جذبۂ انتقام کو تسکین ہوئی۔ بات یہ تھی کہ کوٹھیوں پر وہ صاحب لوگوں سے اکثر جوتوں کی ٹھوکریں اور ہنٹر کی مار کھا چکا تھا جلی ہوئی پاؤروٹی یا باسی کیک سپلائی کرنے پر اُس کی پیسی تو اضع اکثر ہوئی تھی مگر محلے میں اپنا وقار قائم رکھنے کیلئے وہ صاحب اور میم صاحب لوگوں کی بہت بڑائی کیا کرتا تھا۔ کلو کی اپنی طاقت اور باپ کی استادی کے سبب محلے والوں میں اُس کی قدر تھی اور وہ اس قدر میں ہمیشہ اضافہ کرنے کی کوشش کیا کرتا تھا اُس میں ترقی کرنے کی زبردست خواہش پائی جاتی تھی۔ شاید نوجوانی کی لاپروائی کا نفسی کفارہ تھا۔

"بھائی ہم لوگ کبھی محمڈن کا میچ نہیں دیکھا۔" عیدو نے بڑی حسرت سے کہا۔

"ارے یار عیدو! ہم بھی کیا آدمی ہیں۔ کلہے چٹرجی بابو کی کوٹھی پہ ریڈیو کا کھبر تھا کہ محمڈن اسپوٹنگ اور موہن بگان کا میچ ہیاں ہوگا۔ ہم بھُل گئے۔ تم سب کو کہے کو۔"

"ائیں محمڈن کا!" ہر طرف سے حیرت زدہ آوازیں آئیں "ہاں ہاں! محمڈن اسپوٹنگ کا میچ

موہن بگان سے" کلّو نے نہایت تیقن سے کہا۔

"ہاتھ لاؤ اوستاد! سچ؟ محمڈن کا میچ؟" رمضنیاں گاڑیبان تو آپے سے باہر ہوا جا رہا تھا

"ارے یار کلّو کب ہے میچ۔ جلدی سے بتاؤ نا!" عیدو نے بےقراری سے دریافت کیا۔ اور اسے خیال آیا کہ اس روز بھی قمروا کو دوکان پر بٹھانا پڑیگا۔— ارے الّو کا پٹھا کب بھیس کا جناحرامجادہ سوہر کا بچہ! دن بھر لٹو کھیلے گا رے! ارے کمروا! کہاں گیا رے! دو گھڑی تو دوکان پر بیٹھا کر کس ساہت کا پیدا ہے رے......"

عیدو کی نسلی تشریحات اور جنسی انکشافات کا سلسلہ ذرا لمبا ہوتا جا رہا ہے اور ادھر یاروں کے پیٹ میں محمڈن اسپورٹنگ اور موہن بگان کے میچ کی تاریخ جاننے کے لئے چوہا کود رہا تھا۔

"ارے جانے دو عیدو بھائی۔ لڑکا ہے لڑکا...۔ ہاں استاد کب ہے میچ؟ یار قسمت کھلی ہے۔" رمضنیاں نے دریافت کیا۔

"آج ہیری شیلڈ کا فائنل ہے اور کل بس کل محمڈن کا چرٹی میچ ہے۔ سنا ہے لڑائی کیلئے چندہ جمع ہوگا۔ سرکاری سکتری کے افسر کبیر صاحب کہہ رہے تھے۔

کیا کہو بھائی؟ کل؟ ایں کل؟ تو سرکاری میچ ہوا نہ؟" عیدو بولا۔

"تو اور کا! کبیر صاحب بولے میاں کلّو! تم کو تو میچ کا بہت شوکھ ہے۔ محمڈن کا میچ ہوگا اور آٹھ آنہ فی کس ٹکٹ! ہم کہا کہ سرکار کی جندگی چاہیئے میچ تو جرور دیکھیں گے۔ بھائی! یہ سپرنٹنڈنٹ صاحب بہت اچھے ہیں۔ ہر دم کہیں لڑکے کو پڑھاؤ لڑکے کو پڑھاؤ۔ انہیں کے کہے سننے سے تو کمروا کو ہم پڑھے کو بٹھا دیا۔ کون جانے شبراتی میاں قسمت کے بھید ہم سب کا دن اکروا کے بہانے ہی پلٹ جائے میر صاحب سے گدری پر کے منن نواب صاحب بات چیت کیا کرتے تھے کیسی کدر بات تھی۔ اور آج یہ دن ہے۔ پاک پرودگار

کی قدرت۔ اور اُس کی شان دیکھو۔ نواب صاحب کی ڈیوڑھی بھی آباد نہیں رہی اور کل کے کھبیس آج کے رئیس بن گئے ہیں۔ اللہ کی قدرت ہما شما کس گنتی میں ہیں اور اُس کو قسمت پلٹتے بھی دیر نہیں۔"

خیراتی درزی اور شبراتی قلعی گر نے خدا رسول کی بات سن کر متاثر ہونے کی کوشش کی۔ اللہ اور پیغمبر کی باتیں جب ہوں تو ایسا ہی کیا کرتے ہیں۔ "ہاں بھائی۔ پاک پروردگار سب کا مالک جو چاہے کرے!" شبراتی نے پھیپھڑوں کی گہرائی سے سانس لیتے ہوئے کہا۔ اُس کی چندیا کچھ زیادہ چمک اُٹھی "سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائیگا، جب لاد چلے گا بنجارا۔" خیراتی درزی نے اپنی نوکیلی داڑھی کو سر کے ساتھ داہنے بائیں وجدانی انداز میں جنبش دی۔ رمضانیاں کچھ اکتا سا گیا اور اعصابی تناؤ کو دُور کرنے کے لئے اُس نے گلی کی طرف نگاہ کی۔ جہاں بھاری سینے والی ایک عورت ترکاری کا ٹوکرا اٹھائے تیزی سے جا رہی تھی۔ رمضانیاں نے ایک انگڑائی لی اور بولا۔

"تو اُستاد! آٹھ آنے پھیس میچ کی!" اُس کے ذہن میں چوک کے محاذ پر بیٹھنے والی کسبیاں تھیں۔ وہ میچ اور کسبیوں میں موازنہ کر رہا تھا۔ اور عبدو، قمرو اور اصغرو کے مستقبل کا مقابلہ کر کے اپنے دوست کلو سے جل رہا تھا۔

"آٹھ آنے کی کا ہستی ہے۔ میچ کے کھلاڑی ملک میں نامی۔ سات سمندر پار تک انکے نام کا ڈنکا بجے ہے۔ جو ہو سو ہو میچ تو ضرور دیکھا جائے اور بات جب ہے کی محلے سے ساری پارٹی چلے۔" ہامی تو سب نے بھر لی مگر اٹھنی جیسے حلق میں اٹکی جاتی ہو۔ عبدو تو کیک کے ساتھ اُسے کوشش کر کے نکل گیا شبراتی اور خیراتی اُس کی خلش بری طرح محسوس کرتے رہے۔ رمضانیاں نے اُسے وقتی طور پر ذہن سے ہٹا دیا اور اُس کے تعاقب میں خود بھی خیالات کی فضا میں پرواز کرنے لگا اور کلو صاحبوں کے بنگول کے

درمیان گھومنے لگا۔ اٹھنی ذرا سخت تھی۔

کلو کو میچ دیکھنے کا بے حد شوق تھا مگر آٹھ آنے خرچ کر کے میچ کو دیکھنا اُسے بھی اکھر رہا تھا۔ اسکے لئے اتنی رقم بہت تھی جب سے بڑے بڑے ہوٹل کھل گئے تھے "ریجس"، "ڈالس"، "گرانڈ ہوٹل" وغیرہ پرانے طرز کے نانبائیوں کی دکانیں نیچے گر رہی تھیں۔ کلو کو یہ بات کبھی سمجھ نہ آئی کہ جب صفا لوگ اور اُنکے نقال بابو لوگ اونچی دکانوں اور کمپنیوں پر کیوں ریجھے رہتے ہیں۔ پکانے والے تو ہر جگہ نانبائی ہی ہوتے ہیں۔ کلو کی طبیعت میں اُبھرنے کی خواہش بہت تھی۔ اُس نے بھی ٹوکری اور خوانچہ ترک کر دیا اور "گرانڈ ہوٹل" کی نقل میں ایک بڑا سا بکس بنوا لیا تھا جس پر کریم پینٹر سے اُس نے سیٹی بیکری بہت ہی نمایاں پھولدار خط میں لکھوایا تھا۔ پہلے پہل جب وہ سیٹی بیکری لکھا ہوا بکس اٹھا کر کوٹھیوں کے طواف کیلئے چلا تھا تو وہ اپنا سر کتنا اونچا محسوس کر رہا تھا اور اسکی گردن کی رگوں میں فخر و انبساط کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ اس روز اُس نے بہت سے خواب دیکھ ڈالے تھے۔ چلنے پھرنے کے خواب۔ اُس نے یہ شیخ چلی کے سے خواب نہایت سنجیدگی سے دیکھے تھے۔ شیخ چلی ہمیشہ سنجیدہ ہی ہوتا ہے۔ اُس کی سنجیدگی ہی دنیا والوں کیلئے مزاح اور اُسکے لئے درد و سوز پیدا کرتی ہے۔ اُس نے ایک کیک سے ابتدا کی اور کیک کے اوپر کیک رکھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ اُس کا اپنا ایک بہت بڑا گرانڈ ہوٹل بن گیا۔ اُسی روز اُس نے یہ بھی طے کر لیا کہ صغرا کو پڑھا لکھا کر وہ افسر بنوائے گا۔ اُس نے محلے کے مدرسے میں اپنے بیٹے کو بٹھا دیا اور اُسکے مکتب کے وقت مولوی صاحب اور محلہ والوں کا منہ بھی میٹھا کیا۔ مگر ہوا یہ کہ کلو سے مدرسے کے مولوی صاحب کا ماہانہ مشاہرہ بھی ٹھیک سے نہ چل سکا۔ پہلے تو اُس نے جوش میں بڑی باضابطگی دکھائی لیکن جب

بڑے ہوٹلوں کے مقابلے میں اُس کا بیوپار گرنے لگا تو مہینے خالی جانے لگے۔ مولوی صاحب تقاضا تو نہ کرتے تھے لیکن جس مہینے میں مشاہرہ نہ ملتا تھا وہ اصغروا کو بری طرح پیٹتے۔ حالانکہ وہ تیز اور شوقین لڑکا تھا۔ اظہارِ خیال کا یہ طریقہ خاصا پُراثر ہوتا ہے۔ مگر پٹنے کی بھی ایک حد ہوتی ہے جب خالی مہینوں کی تعداد زیادہ ہونے لگی تو مولوی صاحب کلّو سے اکثر کہنے لگے ”میاں کلو اصغروا نہایت کندذہن ہے۔ بالکل کندۂ ناتراش۔ اسکے ساتھ سر کھپانے سے کیا فائدہ۔ مدرسے سے ہٹوا لو۔ اس پاجی کو“ کلو اسکا مطلب ٹھیک وہی سمجھا جو مولوی صاحب سمجھانا چاہتے تھے۔ مگر اس کی اپنی حالت تو یہ تھی کہ سیٹھ بیکری کا بکس محض نام ہی کا رہ گیا تھا۔ یوں محلے والوں پر تھوڑا رعب ضرور پڑا رہتا تھا۔ وہ تو اب بنگلوں پر انڈے اور چوزے سپلائی کیا کرتا تھا اور وہ بھی چپ چاپ سیٹھ بیکری کی مینجری سے گر کر مرغی والا ہرگز کہلانا پسند نہیں کرتا تھا۔ اُس نے کلکتے جا کر بھی قسمت آزمائی کر دیکھی۔ کلکتہ لاکھ بڑا سہی لیکن ساری دُنیا تو اس میں سما نہیں سکتی۔

”بانی چلے گی تو پھر میرا جانا بھی جر رہی ہے“۔ کلّو نے سوچا۔ ”ہم محمڈن کے ہیج کا بات ہی کا ہے کو نکالا!“ مگر اب تو وقار کا سوال تھا کچھ ہو جائے۔ ناک اونچی رہے۔ دن بھر کلو نے اپنے ذرائع سے انڈے اور چوزے جمع کرائے۔ انہیں لادا کر کوٹھیوں اور بنگلوں پر گیا اور جتنا ہو سکا کل پرسوں کے وعدے پر ادھار بیچ آیا۔ پھر بھی آدھے کے قریب انڈے اور چوزے بچ ہی رہے۔ اس تجارت میں اُسکا اجارہ تھوڑا ہی تھا بہرحال اُسے باورچیوں اور بیروں کی خوشامدیں کرنی ہی پڑتی تھیں مگر سب سے زیادہ ٹیڑھی کھیر ہندوستانی میم صاحبائیں ہوتی ہیں۔ وہ ان کی کھچ کھچ سے عاجز تھا۔ ایک تو دام ساٹھ مول مولائی کرنے میں وہ چمر چٹ ہوتیں دوسرے خریداری کم کرتیں اور سب پر طرہ یہ کہ انڈے اگر گندے ہونگے تو واپس کئے جائینگے۔ دام کٹے گا۔

خریداری بند کی جائے گی وغیرہ کا الٹی میٹم۔ اب مصیبت یہ کہ زیادہ ہندوستانی افسر ہی مقرر ہوتے جا رہے تھے اور اُن کی بیویاں بیگم صاحب یا بہورانی تو ہوتیں نہیں بلکہ "نقلی میم صاحب لوگ" بننے کی کوشش کرتی ہیں۔ ہر بات میں اُن کا دخل ضروری۔ دھوبی حجام مہتر سے وہ منہ لگیں۔ روٹی والے پھل والے مرغی والے انڈے والے کا دین و دنیا خراب۔ اُن سے نوکر چپراسی باورچی بلکہ خود اُنکے صاحبوں کی روح ہر وقت لرزتی رہتی ہے۔ محلے کی رونق گھر کی ڈکٹیٹر۔ ولایتی میم صاحبائیں ٹھوکریں تو لگاتی تھیں مگر اُن سے پیسے بھی خوب ملتے تھے۔ اور جو پیسے کافی ملیں تو بڑے بڑے افسر بھی صاحب بہادروں کی ٹھوکر کھانے کو تیار رہتے ہیں لیکن اب تو پیسوں پر مہر تھی۔ اور کھچ کھچ مفت کی۔

شام کو کلّو کی پارٹی نے داناپور رجمنٹ اور ٹاؤن کلب کا میچ دیکھا۔ مقابلے کا رہا اور دوسرا کھیل پرسوں پر ملتوی کر دیا گیا کیونکہ دوسرے دن محمڈن اسپورٹنگ اور موہن بگان کے درمیان چیریٹی میچ تھا۔ پارٹی نے گرنٹوں کو خوب گالیاں دیں اور ہندوستانی ٹیم کا دل خوب چیخ چیخ کر بڑھایا۔ آج کے میچ نے کل کے لئے سب کو اور بیقرار کر دیا۔ رات گئے تک عبدو کی دکان پر میچ کے متعلق رائے زنی ہوتی رہی اور کل کے بارے میں قیاس آرائیاں۔ شاید سوتے میں بھی سبھوں نے فٹ بال میچ ہی کے خواب دیکھے ہونگے

صبح ہوتے ہی کلّو پھیری میں نکل گیا۔ بکری ہو نہ ہو وہ سیٹی بجا کر ہی کا بکس اٹھا کر ایک گشت ضرور کر آتا تھا۔ اس کام سے اس کی شخصیت کچھ اس طرح گھل مل گئی تھی کہ اُس سے علیٰحدہ ہونا سخت اذیت رساں ہوتا۔ اب عقل کی رہبری میں نہیں بلکہ ایک اندرونی مطالبے کے ماتحت وہ صبح کا گشت

کیا کرتا تھا۔ آج اُس نے انڈے اور چوزے کے بقائے کا تقاضا بھی سویرے سے شروع کیا۔ ویسے وہ عموماً تقاضے میں مصلحتاً نرم تھا۔ مگر آج وہ ذرا مجبور تھا۔ کل اُس نے خیراتی درزی سے روپے قرض لیکر انڈے اور چوزے مول لئے تھے۔ وہ ایک ہی روز کا تھا۔ میچ کے بہانے خلیفہ آج ضرور تقاضا کرتا۔ کلّو بانو اپنے یار عیدو سے قرض لیا کرتا تھا یا خیراتی سے کبھی تیسرے کے سامنے اُس نے کبھی ہاتھ نہیں پسارے۔ محلے میں آخر اُس کی ایک عزت تھی۔ روزمرّہ کے خرچ کے سلسلے میں وہ عیدو کا پہلے ہی سے کافی مقروض تھا۔ میچ کے لئے اُس سے آٹھ آنے مانگنا قطعی ناممکن تھا۔ غرض خیراتی کا قرض ادا کرنے اور محمڈن کا میچ دیکھنے کے لئے آج کسی طرح اُسے خریداروں سے اپنے دام وصولنے تھے۔ بیوی نے آتے وقت گھر کے خرچ کے لئے پیسوں کا مطالبہ الگ کیا تھا۔ خیر، وہ تو روز کا معاملہ ہے۔ اُسے ٹالا بھی جا سکتا تھا۔ مجبوری کا نام صبر۔ وہ غریب تو اب عادتاً صبر و شکر کی عادی ہو گئی تھی۔

پہلے تو کلّو نے بکری کا سودا بیچنا چاہا۔ مگر جس دکان میں ہفتے ہفتے چیزیں نہیں بھلا وہاں کا باسی تو اسی سودا کیا خاک کوٹھیوں اور بنگلوں پر بکے کبھی کبھار۔ چپراسی، مالی، بیرے، ہبکٹ، نان ختائی لے لیا کرتے تھے۔ اب جہاں جہاں چوزوں اور انڈوں کے دام باقی تھے کلّو نے تقاضا بھی شروع کیا۔ مگر جواب میں اُسے باورچیوں اور ملازموں کی ڈانٹیں سننی پڑیں۔

"کیا بلا کرتے ہو جی۔ کل سودا بیچا اور آج سر پر سوار۔"

"کا بک بک ہے۔ اب کبھی تم سے سودا نہیں لیا جاگا۔" "جاؤ جاؤ کل پرسوں لے جاؤ گے۔" یہ سب تو انکار کی نرم قسمیں تھیں۔ اس سے بھی زیادہ گرم باتیں اور تلخ جھڑکیاں کلّو کے خیر مقدم کیلئے ارزاں کی گئیں۔ دوپہر ڈھل گئی۔ مگر اُس کے ہاتھ کچھ نہ لگا۔ بھلا اتنا جلد بھی کہیں تقاضا کیا جاتا ہے جن

بنگلوں کے باشیوں کو مہینے مہینے آنے والے بلوں کی عادت ہو وہ کل سودا اور آج دام سے بگڑ نہ جائیں تو اور کیا۔ یہی کلو عموماً ہفتے ہفتے پر حساب صاف کرایا کرتا تھا۔ آج اُس نے لاکھ اپنی ضرورت دکھائی، احتیاج کا رونا رویا۔ مگر کسی کی خاطر اصول کیوں بدلے جائیں۔

جس کوارٹر سے کلو دانستہ طور پر گریز کر رہا تھا۔ آخر کار اُسے وہاں بھی جانا پڑا۔

"سیٹی بیکیمی! انڈا والا سرکار!" کلو نے صدا لگائی۔

"ہاں ہاں رحمت اس کو روکو! دنیا کتنی بے ایمان ہوتی جا رہی ہے یہ بدمعاش سمجھتے ہیں کہ مفت کا مال ہے بے ایمانی شیطانی سے خوب لوٹو۔ رحمت! دیکھو پٹاری میں انڈے رکھے ہوئے ہیں۔ کل یہ ایک درجن انڈے دے گیا تھا۔ رات کو تین انڈے گندے نکلے سب واپس کر دو!" میم صاحب نے خفگی کے ساتھ نوکر کو ہدایات دیں۔

نوکر سات انڈے لئے باہر نکلا۔ اور ضمیمے کے طور پر اُس نے بھی کلو کو بری بھلی سنائی۔

"حجور! تین انڈا ہم دے جانگے۔ ایک درجن پہلے کا دام مل جاتا سرکار؟"

"پہلے آٹھ انڈے بھی گندے نکلے تھے۔ کل تو میں کہلانا بھول ہی گئی تھی تم لوگ بلا یان ہوا! ڈاکو ہو! تو آنے درجن انڈے! آگ کا مول اور اُس پر یہ اندھیرا! جب تو تو آدھے انڈے گندے لے جاؤ اپنے انڈے واپس!" میم صاحب اب خود دروازے پر آگئی تھیں۔

"سرکار تین انڈا ہم دے جانگے۔ ایک درجن پہلے کا دام دیدیا جاتا ہو اُس کو بھی رکھ لیجئے۔ باورچی کا بدماشی ہوگا۔ حجور گندا انڈا رکھوا دیا کیجئے" کلو نے عرض کی۔ رحمت اندر جا چکا تھا۔

"آہین ایک درجن کہاں کا؟ چار پہلے کے اور دو کل کے اچھے نکلے تھے۔ تمہارا آدھے

درجن کی قیمت نکلی۔ بے جانا کیسی روز تم لوگ تو فقیر کی طرح ٹنک جاتے ہو۔ ہم لوگ کہیں بھاگے جاتے ہیں؟

"سرکار آج بہت کام تھا۔ آٹھ آنہ بھی دے دیجئے۔ ایک آنہ پہلے کے حساب کا باقی رہے گا۔"

"دیکھو تو! ساڑھے چار آنے کو نو آنے بناتا ہے۔ مجھے چڑھاتا ہے بے؟ کیسے جھوٹے یہ کمینے ہوتے ہیں۔ بیچتے وقت تو سو طرح سے وعدے کرتے ہیں اور دام لیتے وقت کیسی ڈھٹائی پر اتر آتے ہیں!"

"حجور! گندا انڈا لے دیکھیے ہم مجرا نہیں دیں گے۔"

"تو کیا میں جھوٹ بولتی ہوں؟ جاؤ نہیں ملیں گے پیسے!"

"سرکار ہم انڈا کے پیٹ میں گھس کر دیکھے جا ہیں۔ اگر ایسا سودا بیچا کریں تو دیوالہ سدھ ہو جائے سب کوٹھے پر بیچے ہیں ایسا کہیں نہیں ہووے ہے۔" کلو نے تنگ آ کر کہا اور میم صاحب بس آپے سے باہر ہو گئیں۔

"رحمت! رحمت! نکالو اس کو یہاں سے۔ بدتمیز، جھوٹا! بدمعاش! پاجی! گستاخ! جھوٹ بولتے شرم بھی نہیں آتی۔ عہد کر کر کے مکرتے ہیں یہ کمینے۔ خدا کا بھی خوف نہیں!"

خدا کا نام درمیان میں آتے ہی کلو کے رونگٹے ذرا دیر کیلئے کھڑے ہوئے۔ لیکن ضرورت کی مار سخت ہوتی ہے۔ خدا کو کسی طرح بہلا لیا جاتا ہے۔ کلو نے معاہدہ تو ضرور کیا تھا کہ گندے انڈوں کے دام نہ لیگا۔ مگر اس نے اپنے ضمیر کو یوں تسکین دی۔ بغرض کے بندے پیٹ کے ملے جو نہ معاہدہ کر لیں۔ اور پھر کیا ضرور کہ میم صاحب

سچ ہی بول رہی ہوں ضمیر کے نشتر سے بچ کے اب ذرا وہ دلیر ہو کے بولا "نہیں! ہم تو ایک درجن کا دام لینگے" یہ آخری دروازہ تھا بیگم صاحب کلو کی ہٹ دھرمی سنکر بیحد برافروختہ اور چراغ پا ہوگئیں۔ کل کے گندے انڈے سرے پر ذرا نوڑے ہوئے باورچی خانے میں رکھے تھے۔ انہیں وہ اٹھا لائیں اور کلو کے سامنے رکھے ہوئے انڈوں پر زور سے ٹپک دیا۔ کئی انڈے ٹوٹ کر بھرکس ہو گئے۔ زردیاں اور سفیدیاں لت پت ہو کر پھیل گئیں۔ کلو کے دل میں ہلکا سا درد پیدا ہو کر غصّے کی لہروں میں ڈوب گیا۔

کلو کا سینہ اپنے قہر کی آگ سے چھنک رہا تھا۔ اُس کا جی چاہا کہ اُن سارے بنگلے اور کوٹھیوں کے رہنے والوں کے سر پر دنیا بھر کے گندے انڈے لاکر ٹپک دے۔

اگست کا آفتاب اُسکے منہ پر پڑ رہا تھا۔ سہ پہر ہو چلی تھی۔ راستے بھر کلو کے دماغ میں عنکبوتی خیالات جالے بنتے رہے۔ غصے سے اُسکی کنپٹیوں میں گرم گرم خون دوڑ رہا تھا۔ اُس نے ایسا محسوس کیا کہ فضا میں ہر طرف، اچھے انڈوں اور گندے انڈوں کے درمیان میچ ہو رہا ہے۔ اُس نے ایک غیر واضح سی ہمدردی گندے انڈوں کیلئے محسوس کی۔ گندے انڈے میچ جیت گئے۔ مگر آخر میں جھنجھلا کر اچھے انڈے اُن پر ٹوٹ پڑے۔ بڑی زبردست ٹکر ہوئی۔ ساری دنیا چھلکوں، زردیوں اور سفیدیوں میں خلط ملط ہو کر غرق ہو گئی۔ ہر سو ایک زرد انقلاب آگیا۔

"میاں کلو! بس آج اصغروا کو لیجاؤ! برے لڑکے اچھوں کو بھی خراب کر دیتے ہیں۔ یہ لونڈا شیطان کا بچہ ہے۔ بلکہ اُس کا بھی دادا۔ اب ہم نہیں رکھتے اِسے مدرسے میں۔ دیکھو آج اردو کی دوسری نہیں لایا اور اُلٹا بدتمیزی کرتا تھا۔"

مدرسے کے مولوی صاحب نے کلو کو خوش آمدید کہی۔ کلو نے اصغروا کا کان پکڑا اور اُسے پیٹتا ہوا

گھر لے چلا۔ کلو کے اعصاب زیادہ دیر تک تناؤ نہیں برداشت کر سکتے تھے۔ اُس نے اپنا بھوت اپنے بیٹے پر اتارا۔ اصغروا بے طرح پٹا۔ کلو کے دل میں درد پیدا ہونے لگا۔ یہ درد کی موج اُس کی شخصیت کی گہرائی سے اُٹھی۔ اصغروا اب افسر نہیں بنے گا۔ بے چارا! اصغروا پر اُسے ترس آنے لگا جیسے اُسے میم صاحب کے ٹوٹے ہوئے انڈوں پر ترس آیا تھا۔ اُس نے محسوس کیا کہ شاید وہ اپنے پر اپنے ارمان پر ہی ترس کھا رہا ہے۔ اپنی زندگی بھر کی نامرادی اُسے بہت بھاری معلوم ہوئی۔ اس وزن سے بچنے کے لئے اُس نے پھر اصغروا کو پیٹنا شروع کیا۔ کلو کو زوروں سے بھوک بھی لگ رہی تھی۔ اُسے سرسری طور پر یاد آیا کہ گھر میں کچھ نہیں اور بیوی پھر پیسے مانگے گی۔ اُس کا غصہ اور بھڑک اُٹھا۔ اصغروا پر مار زیادہ تیزی سے پڑنے لگی اور بیوی کے مطالبے کو اُس کے قلب کی گہرائیوں میں خاموش بٹھا دینے کے لئے کلو نے اصغروا کو گالیاں بھی دینی شروع کیں۔ اب وہ گھر میں داخل ہو چکا تھا۔ بیوی نے بڑھ کر بچے کو چھڑانے کی کوشش کی۔ کلو کے دل میں پھر ایک ہوک سی اُٹھی۔ اُس کا غصہ دھیما پڑنے لگا نقلی ایندھن زیادہ دیر تک نہیں جل سکا۔ اب رسوائی اور نامرادی اس کا گلا گھونٹ رہی تھی! پاٹی! میچ! مدرسہ! اصغروا!

کلو نے محسوس کیا کہ اصغروا، وہ خود، اُس کی بیوی اور محلّے کے لوگ سب کے سب محض انڈے ہیں۔ گندے انڈے!

کتبہ:۔ افتخار عباسی ہر ریت ہر ر

[م جھ ر ل]

منزل منزل

دل بھٹکے گا

اور

دفتر دفتر اس کی داستان لکھی جائے گی

ایک داستان — ایک دفتر

منزل منزل

اے حمید

کے افسانوں کا خوبصورت ترین مجموعہ

☆

نیا ادارہ ۔ لاہور

سویرا آرٹ پریس ۔ لاہور